

طلسمہ



گل نوغیز اختر

کال علم و شکار ایک نوجوان کی عبرت ناک داستان

طلسمہ

گل نوخیز اختر

اشاکٹ :-

مکتبہ القریش سرکل روڈ

اُردو بازار، لاہور۔ ۲



جملہ حقوق محفوظ ہیں

ایڈیشن ————— 2002ء

ناشر ————— محمد علی قریشی

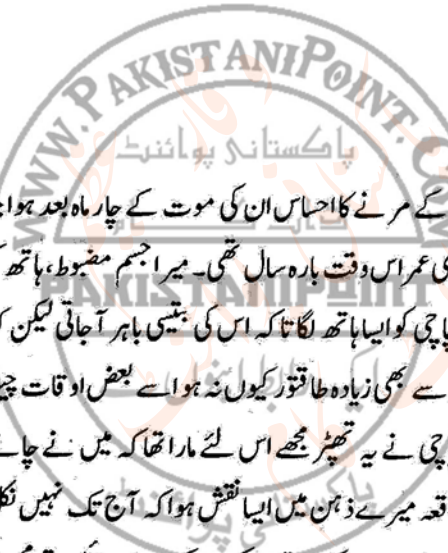
مطبع ————— نیراشد پریس

سرورق ————— ذاکر

قیمت ————— روپے

انساج

ان لوگوں کے نام جو کالے جادو
کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہیں



مجھے اپنے ماں باپ کے مرنے کا احساس ان کی موت کے چار ماہ بعد ہوا جب چاچی نے مجھے پہلا تھپڑ مارا۔ میری عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ میرا جسم مضبوط، ہاتھ کھردرے اور سخت تھے۔ میں چاہتا تو چاچی کو ایسا ہاتھ لگاتا کہ اس کی بتیسی باہر آجاتی لیکن کیا کیا جائے شریف والدین کی اولاد پہاڑ سے بھی زیادہ طاقتور کیوں نہ ہو اسے بعض اوقات چیونٹی سے بھی کمزور رہنا پڑ جاتا ہے۔ چاچی نے یہ تھپڑ مجھے اس لئے مارا تھا کہ میں نے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کیوں کھایا تھا۔ یہ واقعہ میرے ذہن میں ایسا نقش ہوا کہ آج تک نہیں نکل سکا۔ آج بھی اگر کسی جگہ میرے سامنے چائے کے ساتھ بسکٹ رکھ دیئے جائیں تو مجھے ایک جھر جھری سی آجاتی ہے۔ مجھے یاد ہے میری ماں ہمیشہ مجھے دیسی گھی کا ڈبل پر اٹھانا کر دیا کرتی تھی جسے میں مزے سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں چائے کے پیالے میں پھینک کر کھایا کرتا تھا۔ میری ماں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کا بیٹا ادب و آداب کے کس اصول پر کاربند رہتے ہوئے روٹی کھاتا ہے۔ اسے تو اس بات کی خوشی ہوتی تھی کہ میں کھانا پیٹ بھر کر کھاتا ہوں۔ ہم دیہاتی لوگوں کو اور اس کے سوا آتا بھی کیا ہے اور پھر اس میں ہرج بھی کیا ہے۔ دوسروں لئے ٹنوں کے حساب سے اناج پیدا کرنے والے کو اپنا پیٹ بھرنے کی

آزادی تو ہونی چاہئے۔ میری ماں کہا کرتی تھی پتر کھانے سے پہلے ہتھ دھو لیا کر اور بسم اللہ پڑھ کے لقمہ منہ میں ڈالا کر میں نے اس روز بھی پہلے ہاتھ دھوئے پھر بسم اللہ پڑھ کر بسکٹ کو چائے کے کپ میں غوطہ دیا۔ چٹاخ..... چاچی کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور میرے بائیں گال میں جیسے کسی نے مرچیں بھر دیں۔ چاچا مختار اور باقی بچے سن ہو گئے.....

تمہیں تمیز نہیں کہ ناشتہ کیسے کرتے ہیں اجڈ..... چاچی نے ”اجڈ“ ایسے کہا جیسی کو بے غیرت کہا جاتا ہے۔ میں بارہ سال کا بچہ تھا۔ کیا کرتا۔ زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ روتے ہوئے بھی میرے منہ سے پہلا جملہ یہی نکلا..... امی امی.....

چپ کر ورنہ کتے کے آگے ڈال دوں گی چاچی غرائی اور میں یکدم سہم گیا۔ مجھے شدید بھوک لگی ہوئی تھی لیکن تھپڑ اور کتے کے ذکر نے میری ساری بھوک اڑادی تھی۔ میں سسکیاں لیتا ہوا اٹھا اور باہر نکل گیا۔ چاچا مختار کو ہمت تک نہ ہوئی کہ وہ مجھے روکتے۔ یہ گھر چاچی کی ملکیت تھا اور حکم بھی انہی کا چلتا تھا۔ میں صحن میں آکر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔ چاچی نے اپنا اصلی روپ دکھا دیا تھا۔ میں بتاتا چلوں کہ ہم لوگ چک مو من گ ب 18 میں رہتے تھے۔ میرا باپ دو مربع زمین کا مالک تھا۔ طبیعت کا سخت مگر دل کا بہت نرم تھا۔ میری ماں سے بہت پیار کرتا تھا۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرا باپ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا پتر پنڈ کا شہزادہ ہے۔ میرا چاچا مختار اور چاچی شکیلہ لاہور میں رہتے تھے۔ چاچا مختار کا پسیر پارٹس کا اچھا خاصا کاروبار تھا، محل نما گھر تھا، نوکر چاکر بھی تھے۔ اکثر ویک اینڈ پر یہ لوگ بچوں سمیت پکنک منانے گاؤں آ جایا کرتے تھے۔ جمعرات کی رات ہم سب گانے گاتے، ماہیے سناتے گئے چوتے..... لیکن ایک عجیب بات تھی۔ ابا یوں تو ہر روز ہمارے ساتھ ہوتا لیکن جمعرات کے روز شام کا اندھیرا پھیلنے ہی گھر سے نکل جاتا۔ میں بچپن سے ہی ایسا دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ اماں سے پوچھا لیکن وہ ہر دفعہ ٹال گئی۔ ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ابا جمعہ کے روز حسب معمول گھر آ جاتا لیکن اس کی حالت ایسی ہوتی گویا موت سے لڑ کر آ رہا ہے۔ اماں اس موقع پر نہایت پریشان ہو جاتیں۔ ابا کو بستر پر لٹاتیں، پنکھا تھمتیں اور گرم گرم

دودھ کا گلاس پلاتیں۔ چاچی اور چاچا بھی متحس تھے کہ آخر یہ سب کیا ہوتا ہے۔ لیکن ابانے مرتے دم تک اس راز سے پردہ نہ اٹھایا۔ مجھے یاد ہے کہ ایسے موقعوں پر اماں ہمیشہ زیر لب بڑبڑایا کرتی تھیں اللہ تجھے غارت کرے..... تجھے سات دوزخوں کی سزا ملے..... کم بخت ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی ہے.....“

میں کئی دفعہ بے اختیار پوچھ بیٹھتا کہ ”اماں کس کو بدعائیں دے رہی ہو“ لیکن اماں ٹھنڈی آہ بھر کر چپ سادھ لیتیں۔ میں دس سال کا ہوا تو ایک روز اچانک ابا بھاگتے ہوئے آئے، کلباڑی ان کے کاندھے پر تھی اور وہ پسینے میں شرابور تھے۔ گھر میں گھستے ہی چیخے۔

”نورے کی ماں..... نورے کی ماں..... چولہا جلا لے..... جلدی کر چولہا جلا..... وہ آگنی ہے..... تیل لے آ..... نورے کی ماں“

یہ سنتے ہی اماں کے پاؤں پھول گئے۔ وہ الٹے قدموں اندر کی طرف بھاگی۔ الماری پر رکھا قرآن اٹھا کر سینے سے لگایا اور بھاگتی ہوئی چولہے کی طرف بڑھی۔ ابا صحن میں زنج کئے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہے تھے۔ ان کے منہ سے بار بار خراہٹیں نکل رہی تھیں۔ میں کمرے کی کھڑکی کے پاس دم بخود کھڑا تھا۔ ہمارا گھر چونکہ دیگر گھروں سے خاصا دور تھا اس لئے ابھی تک کسی کے کانوں تک ابا کی چیخ و پکار نہیں پڑی تھی۔ اچانک ابا اٹھے اور بھاگتے ہوئے دیوار میں ٹکڑے ماری..... خون کا ایک فوارہ سالن کے سر سے پھوٹ پڑا۔ اماں نے ایک چیخ ماری اور چولہے کو ادھو جلا چھوڑ کر ابا کی طرف بھاگیں۔ وہ مسلسل چلا رہے تھے..... مت قریب آ زیب..... دور ہو جا..... وہ میرا گوشت کھا رہی ہے..... آہ..... ہائے..... مم..... میرا کلیجہ نہ دبا..... تجھے خدا کا واسطہ میرا کلیجہ نہ..... آہ..... ہائے..... ابا انتہائی خوفناک انداز میں چلا رہے تھے۔ لگتا تھا وہ کسی سے مخاطب ہیں جو ہمیں نظر نہیں آ رہا۔ اماں سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھیں۔ قرآن ان کے ہاتھوں میں تھا جسے انہوں نے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ ابانے گھر میں گھستے ہی کہا تھا کہ تیل لاؤ اور آگ جلاؤ۔ ایک لمحے کے لئے میں نے کچھ سوچا اور بھاگ کر مٹی کے تیل کی بوتل چولہے میں انڈیل دی۔ ابا یکدم چیختے چیختے رک

گئے۔ گھور کر میری طرف دیکھا۔ پھر بدلی ہوئی آواز میں بولے ”ادھر آؤ“

میں سہم گیا۔ ماچس میرے ہاتھ میں تھی اور میں دیا سلائی جلانے ہی والا تھا۔ ابا کا حکم سن کر میں ڈرتے ڈرتے ان کی طرف بڑھا۔ اماں ابھی تک نیم غشی کے عالم میں تھیں۔ ابا کی پشت ان کی طرف تھی۔ مجھے ابا کی طرف بڑھتے دیکھ کر جیسے اچانک انہیں ہوش آگیا۔ وہ پوری

قوت سے چلائیں۔ ”نورے..... خبردار پاس مت جانا..... آگ جلادے..... جلدی“

یہ سنتے ہی ابا کی گردن خود بخود پیچھے کی طرف مڑتی چلی گئی۔ آواز آئی ”میرا خون پی جاؤں گی۔ تو چالاک بنتی ہے ناں..... ابھی تیرا کلیجہ نکالتی ہوں..... اماں کی چیخ نکل گئی انہوں نے قرآن

کو مضبوطی سے پکڑا اور بھاگ کر میری طرف آکھڑی ہوئیں..... گردن پھر گھومی..... اب کی بار ابا کی آنکھوں میں بڑی نرمی تھی۔ انہوں نے بڑی محبت سے کہا نورے میں ٹھیک ہوں۔ آگ نہ جلانا ادھر آ جاؤ..... وہ میری طرف بڑھے۔ میں دھوکے میں آگیا اور بھاگ

کر ان کی طرف چلا گیا۔ یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ ابا نے اچھل کر مجھے پکڑ لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زبان تین فٹ تک باہر نکل آئی، رگیں تن گئیں، آنکھیں

کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو گئیں اور کان گھوڑے کے کانوں کی طرح بہت بڑے بڑے ہو گئے۔ میرا روال روال کانپ اٹھا۔ ایک دل دوز چیخ میرے منہ سے نکلی اور میری ماں

نے پہلی بار عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے قرآن کو ساتھ پڑے میز پر رکھا، ماچس اٹھائی اور دیا

سلائی جلا کر چولہے میں پھینک دی۔ اگرچہ مٹی کا تیل پھینکے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن وہ

ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا۔ ایک لہری آئی اور پانچ گز تک آگ کا شعلہ لپکا۔ جیسے ہی

آگ کی روشنی ابا تک پہنچتی انہوں نے مجھے ایک زوردار لالت رسید کی اور میں چولہے کے

پاس جا گرا۔ پہلی بار مجھے اس خوفناک چہرے سے ابا کی بھنجی بھنجی سی آواز آئی

نورے..... جلتی ہوئی لکڑی میرے پاس لے آ..... میں ڈر گیا، پھر پتا نہیں کیا ہوا میں نے

چولہے سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور اس کا رخ ابا کی طرف کر کے ان کی طرف بھاگا۔ اسی

لمحے دو عجیب باتیں ہوئیں، ابا یکدم صحیح ہو گئے اور ان کے دائیں کان کے راستے ایک خوفناک

اور کریہہ شکل عورت دھوئیں کی شکل میں نکلتا شروع ہو گئی۔ اسے مکمل طور پر باہر آنے میں زیادہ سے زیادہ تین سیکنڈ لگے ہوں گے اور جب وہ پوری باہر آئی تو ہم سب کی فلک شگاف چہنیں نکل گئیں۔ گاؤں والوں کو بھی اس دوران چیخ و پکار کی آواز پہنچ چکی تھی اور وہ بھی اسی طرف کو بھاگے آرہے تھے۔ جو شکل ابا کے کان سے باہر آئی تھی اس کا حلیہ بیان کرتے ہوئے مجھے اب بھی خوف محسوس ہو رہا ہے۔ اس کا جسم گدھی کا اور چہرہ عورت کا تھا۔ لیکن ایسی عورت..... اف خدا دایا..... اتنا بھیاںک چہرہ کسی نے سوچا بھی نہ ہو گا۔ اس کا چہرہ پانچ فٹ چوڑا، رنگ سفید، جسم پر ریگتے ہوئے کیڑے، آنکھوں کی جگہ گڑھے، زمین تک نکلے ہوئے غلاظت میں لتھڑے دانت اور کٹی ہوئی خون آلود لمبے ناخنوں والی انگلیاں دیکھ کر اماں کو اسی وقت ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ زمین پر گر گئیں، ابا اس دوران کافی ہوش میں آچکے تھے لیکن زمین پر گرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے اپنے گلے کا تعویذ اتار کر میری طرف پھینکا ”نورے! اس تعویذ کو اس لکڑی سے آگ لگا دے“

میں نے جھٹ سے تعویذ اٹھایا اور جلتی ہوئی لکڑی اس کے اوپر پھینک دی۔ اتنا کرنا تھا کہ اس خوفناک شکل نے چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ سارا گاؤں ہمارے دروازے کے باہر جمع ہو چکا تھا۔ کئی لوگ ڈر کے مارے بے ہوش ہو چکے تھے۔ سب آیات قرآنی کا ورد کر رہے تھے۔ تعویذ آگ میں جل رہا تھا اور وہ چڑیل بال نوچتی پھر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ آگ اس کو لگی ہوئی ہے۔ بار بار وہ ابا کا نام لے کر چلاتی جاتی تھی حاکم علی..... نہیں چھوڑوں گی تیرے بیٹے کو..... مار کے ہی دم لوں گی..... میں مر رہی ہوں..... لیکن یہ مت سمجھ کہ تو بیچ جایگا..... تو نے کالے جادو کے ذریعے مجھے غلام بنانا چاہا تھا..... ہم کبھی کالے جادو والے کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہونے دیتے..... لیکن تو نے اس میں بھی کامیابی حاصل کی..... اب تیرا پورا خاندان اسی آگ میں جلے گا..... تبت کی ”مدھو پہاڑی“ پر میں پھر جنم لوں گی..... خبیث انسان!..... میں پھر آؤں گی..... تیرے بیٹے کا کلیجہ نکالوں گی..... آنکھیں نکالوں گی..... سارے بدلے لوں گی..... میری یہ موت عارضی ہے..... تیرا بیٹا 20 سال کا ہو گا تو

میں خود بخود زندہ ہو جاؤں گی..... ہاہاہاہا..... وہ آگ میں جلتی ہوئی بھی قہقہہ لگا رہی تھی۔
 ابا کے منہ سے جھاگ نکلتا شروع ہو گئی تھی۔ انہوں نے خون کی تے کی اور اٹکتے ہوئے مجھے
 مخاطب کیا۔ نن..... نورے..... بب..... بب..... بیس سال کے ہو جاؤ..... تو آگ
 پر..... پکی ہوئی چیز..... نہ کھانا..... اور..... پپ..... س..... سانول..... آہ..... ابا
 کراہے..... اتنی دیر میں وہ خوفناک بلا غائب ہو چکی تھی، صرف دھواں باقی تھا۔ گاؤں والے
 تیزی سے ابا کی طرف بڑھے۔ کچھ لوگ ابھی تک ابا کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ ابا نے
 منہ بھر کر ایک اور تے کی اور صحن میں خون ہی خون ہو گیا۔ عجیب بات تھی کہ یہ خون سرخ
 کی بجائے کالا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ابا کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ موت کے بعد ان کا
 سرخ و سپید چہرہ کالا سیاہ ہو گیا تھا۔ آخری پھکی کے ساتھ ہی ان کے حلق سے ایک دوفٹ لمبا
 کالا سانپ نکلا اور تیزی سے رینگتا ہوا ابا پر کھیتوں میں گم ہو گیا۔



ماں باپ کی یکدم اور ناگہانی موت نے مجھے کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ویسے بھی بارہ تیرہ سال
 کی عمر میں مجھے اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ میں موت اور زندگی کے فلسفے کو سمجھ سکتا۔ مجھے تو کچھ
 بھی نہ یاد رہا، سوائے اس کے کہ بیس سال کا ہوتے ہی مجھ پر کوئی ایسی آفت آئے گی جس کے
 بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ابا کے آخری الفاظ میرے ذہن سے جیسے چپک
 سے گئے تھے۔ میں اس چڑیل کے الفاظ بھی نہیں بھول سکتا تھا۔

اب چونکہ میں دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا اس لئے گاؤں والوں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ کھڑا ہو
 گیا کہ میرا کیا کیا جائے۔ میرے باپ کی جو بھی جائیداد تھی وہ میرا حصہ تھی اور یہ گھر
 بھی۔ لیکن گاؤں کا کوئی فرد بھی اس حق میں نہیں تھا کہ میں اس گھر میں رہوں جہاں اس
 چڑیل نے دو انسانوں کو موت کی نیند سلایا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر میں اپنے گھر
 میں نہ رہوں تو پھر کہاں رہوں۔ اصولی طور پر تو گاؤں والوں کو چاہئے تھا کہ وہ مجھے اپنے
 درمیان ہی رکھتے۔ مختار اموچی، حاجی صاحب، شکور انائی، عبدل پٹواری..... کوئی بھی مجھے

اپنے گھر رکھ سکتا تھا۔ یہ سب تو مجھے بہت پیار کیا کرتے تھے۔ میرا ان کے گھر بلاروک ٹوک آنا جانا تھا۔ ان کی اولادیں میرے ساتھ کھیلی تھیں میں ان کے لئے اجنبی تو نہ تھا۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ مجھے قبول کرتا۔ ان سب نے اپنی آنکھوں سے چڑیل کی دھمکی سن لی تھی اور کوئی بھی یہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا کہ میری شکل میں چڑیل کے دشمن کو اپنے ہاں پناہ دے۔ سب ہی بال بچوں والے تھے اور پھر گاؤں کے لوگ تو ویسے بھی توہمات کے مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ میرے والے معاملے میں تو ساری حقیقت انہوں نے خود دیکھ لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب چاچے مختار نے فیصلہ کیا کہ اب میں شہر میں ان کے گھر رہوں گا تو کسی گاؤں والے کی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر یہ کہہ سکے کہ نہیں یہ ہمارے گاؤں کا بیٹا ہے۔ ہمارے دوست کا بیٹا ہے، جب ہم موجود ہیں تو اسے شہر جانے کی کیا ضرورت، شاید کبھی یہ چاہتے تھے کہ میں جلد از جلد یہاں سے دور نکل جاؤں۔ لیکن..... شکورے نائی نے حق دوستی کا نصف نبھایا اور جس روز میں گاؤں سے رخصت ہونے والا تھا، وہ میرے قریب آیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر آہستہ سے بولا۔

”پترا میں بچپن سے جوانی تک تیرے باپ کے ساتھ رہا ہوں۔ سب جانتا ہوں کہ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ میں نے اور تیرے باپ نے اکٹھے ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم کالا علم سیکھیں گے اور جنات کو قابو میں کرینگے۔ ہم دونوں چونکہ غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ایسے حربوں کے ذریعے اپنی معاشی حالت درست کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کیلئے ہم پیر سانول سے بھی ملے۔۔۔۔۔“ پیر سانول کا نام سنتے ہی میں چونک اٹھا۔ مجھے یاد آگیا کہ ابانے مرتے وقت بھی اس کا نام لیا تھا ”یہ پیر سانول کون ہے؟“

شکورے نائی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا ”ہے ایک شیطان..... اسی نے مجھے اور تیرے باپ کو اس لائن پر لگایا تھا اگر وہ شروع ہی سے ہمیں منع کر دیتا تو ہم کبھی ان چکروں میں نہ پڑتے۔ اس نے ہمیں کچھ عملیات بتائے اور حوصلہ دیا کہ اگر یہ عملیات ہم نے مکمل کر لئے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جنات پر حاوی ہونے سے نہیں روک سکتی۔ بس پترا! تیرے باپ

کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی۔ پیر سانول نے ہم سے قبرستانوں میں چلے کٹوائے، نت نئے منتر سکھائے، صدقے دلوائے، دائرے کھنچوائے لیکن..... جب اس نے ہمیں مکروہ چیزیں کھانے کو اور قرآن کی آیتوں کو (نعوذ باللہ) الٹا پڑھنے کے لئے کہا تو میں لرز گیا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ پیر سانول کا کہنا تھا کہ چونکہ جنات کو خوش رکھنے کے لئے اکثر ان کے ساتھ کھانے میں بھی شریک ہونا پڑتا ہے اس لئے یہ چیزیں کھانا بہت ضروری ہے اور ان کی زبان حاصل کرنے کے لئے آیتوں میں تبدیلی بھی لازمی ہے۔ میرے انکار پر اس نے مجھے لعن و طعن کی اور آئندہ کے لئے آستانے پر آنے سے روک دیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس مکروہ عمل سے بالکل پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن تیرے باپ کو تو جنون تھا وہ اتنے دنوں کی محنت کیسے رائیگاں جانے دیتا۔ لہذا اس نے حرف بحرف پیر سانول کی باتوں پر عمل کیا۔ میں چونکہ کالام علم سیکھنے سے باز آچکا تھا اس لئے تیرے باپ اور میرے درمیان فاصلے بڑھنے لگے اور ایک ایسا وقت آ گیا کہ ہم دونوں بالکل ہی علیحدہ ہو گئے میں نے تیرے باپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ باز نہ آیا۔ پیر سانول نے آخر اسے کالے علم کے آخری حربوں تک پہنچا ہی دیا۔ یہی وہ دن تھے جب ایک روز تیرا باپ چلے کاٹے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔ صبح کے وقت کچھ لوگ قبرستان سے گزرے تو انہوں نے تیرے باپ کو ایک پرانی قبر کے پاس بے ہوش پڑے ہوئے پایا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ نہایت خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ کسی اور کو تو اس نے کچھ نہ بتایا لیکن مجھے کہنے لگا ”شکورے! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ میں چلے کے دوران ایک لفظ زیادہ پڑھ گیا ہوں، جیسے ہی میں نے لفظ پڑھا، میرے سامنے والی قبر، جو غالباً کسی عورت کی تھی، اچانک کھل گئی اس میں سے ایک..... اف خدا یا..... عجیب الحلقہ کر یہہ صورت چڑیل قہقہے لگاتی ہوئی باہر آ گئی اور کہنے لگی ”اب آیا ہے ناں قابو، جو منتر تو نے زائد پڑھا ہے وہی تجھے لے ڈوبے گا“ یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار تھپڑ مجھے رسید کیا اور دائرے کے اندر ہوتے ہوئے بھی مجھے یوں لگا جیسے میں کسی چٹان سے ٹکرا گیا ہوں پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا“ میں نے تیرے باپ کی یہ بات سن کر اسے پھر کہا چھوڑو یہ سارے چکر اور اللہ سے

معافی مانگ۔

لیکن تیرے باپ نے میری ایک نہ سنی۔ پھر اسی دوران اس کی شادی تیری ماں سے ہو گئی۔ شادی والی رات بھی جو کچھ تیرے باپ کے ساتھ ہوا وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ ویسے والے دن تیرے باپ کے گھر گوشت پکا تھا۔ اچانک تیرا باپ سب کو چھوڑ کر کھیتوں کی طرف چل دیا۔ سب نے پوچھا بھی کدھر جا رہے ہو۔ کھانا تو کھالو لیکن اس نے بہانہ بنایا کہ میں رفع حاجت کے لئے جا رہا ہوں میں سمجھ گیا کہ بات کچھ اور ہے میں اس کے پیچھے لپکا اور اصل وجہ پوچھی۔ کہنے لگا۔

”یار! وہ کہتی ہے کھانا میرے ساتھ کھاؤ ورنہ ساری دیگوں میں سے اس طرح کا سالن نکلے گا“ یہ کہتے ہوئے تیرے باپ نے اپنی مٹھی میں دبی، دیگ سے نکالی ہوئی ایک بوٹی دکھائی جو انسانی ہاتھ کی انگلی تھی اور شور بے میں تر تھی۔

میں کیا کر سکتا تھا۔ تیرے باپ نے اس روز قبرستان جا کر اسے خوش رکھنے کے لئے اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ تیرے باپ کے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ایک بات تھی اس کے آنے کا مخصوص دن ہوتا تھا۔ وہ جمعرات ہی کو آتی تھی اور تیرے باپ کو مجبور کرتی کہ وہ قبروں میں سے انسانی ہڈیاں نکال کر اس کے ساتھ کھائے۔ یہ عمل پھانسی سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا تھا۔ مجھے اپنے یار کی حالت دیکھ کر ترس آ جاتا لیکن میں مجبور تھا تیرے باپ نے پیر سانول کے کہنے پر اور بھی سخت چلے شروع کر دیئے تھے۔ آج تک کالا علم کرنے والے کے ہاں بیٹا نہیں ہوتا لیکن تیرا باپ اس علم میں اس قدر آگے جا چکا تھا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور..... پھر تو پیدا ہوا۔ تیرے پیدا ہونے پر تیرے باپ نے جتنی خوشیاں منائیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ وہ ناچتا پھرتا تھا اور وہ دھاڑتی پھرتی تھی..... تیری پیدائش کے بعد تیرے باپ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اس علم سے دستبردار ہو جائیگا لیکن..... یہ اتنا آسان نہ تھا۔ اس نے چلے بند کر دیئے تاہم تیری ماں اور تجھے اس چڑیل کے شر سے محفوظ رکھنے کیلئے وہ جمعرات کو اسے خوش رکھنے کی خاطر اس

کے ساتھ کھانا کھانے گاؤں کے پرانے قبرستان چلا جاتا لیکن شاید موت والے روز اس نے یہ عمل نہیں کیا اور اس بد بخت نے میرے یار کی جان لے لی..... شکورے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

مجھے یہ بات ازبر ہو گئی۔ میں نے بڑی توجہ سے سارا واقعہ سنا تھا اگرچہ میں اسے سمجھنے کی عمر میں نہیں تھا تاہم مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ میرا باپ کیوں مرا تھا اور پیر سانول کون تھا۔ میری بد قسمتی یا نا عمری کہہ لیجئے کہ میں شکورے سے پیر سانول کا پتہ پوچھنا بھول گیا۔ شکورے کو بھی شاید اس کا خیال نہیں آیا۔ اس روز سب گاؤں والوں کی موجودگی میں ہمارے گھر کے دروازے پر ایک موٹا سا کالا گدیا گیا..... اس پر آیتیں پڑھ کر پھونکی گئیں اور اسے ایک شجر ممنوعہ قرار دیکر اس طرف آنے بھی منھوس اور خطرناک قرار دیدیا گیا۔ میں چاچا مختار کی گاڑی میں بیٹھا دھیرے دھیرے گاؤں سے دور ہوتا جا رہا تھا اور گاڑی کی دھول میں ہمارا گھر آہستہ آہستہ کسی بھوت بنگلے کی طرح نظروں سے اوجھل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

شہر میں آتے ہی مجھے احساس ہوا گویا میں کسی پنجرے میں قید ہو گیا ہوں حالانکہ میں اس سے پہلے کئی بار شہر آچکا تھا لیکن ایسا احساس مجھے پہلی دفعہ ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب میں تنہا تھا۔ چاچی کی نظروں میں پہلا تاثر ہی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ انہیں میری آمد ناگوار گزری ہے۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا بڑی بیٹی کا نام شازیہ چھوٹی کا زگس اور بیٹے کا نام نعیم تھا۔ بڑی بیٹی کی عمر چھ سال چھوٹی کی چار سال اور بیٹے کی دس سال تھی۔ گویا عمر کے اعتبار سے نعیم میرے قریب قریب ہی تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ میری عمر بارہ سال تھی۔

میرا خیال تھا کہ میری اس گھر میں وہی حیثیت ہوگی جو اپنے گھر میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے کوئی تکلف نہ کیا میں نا سمجھ تھا لیکن چاچی کے تھپڑ نے مجھے ایک لمحے میں عاقل و بالغ کر دیا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ اب میری کنھن زندگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ چاچی کے گھر کا ماحول نہایت ہی اوپر اوپر اساتھا۔ سارا سارا دن وہ میک اپ میں لتھڑی ہوئی، پارٹیاں اٹینڈ کرتی، ٹیلی فون سنیتی اور نوکروں پر غصہ نکالتی۔ میں باقاعدہ نوکر تو نہیں تھا تاہم ان سے کچھ کم درجے پر بھی فائز نہیں تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اندھوں میں کانارا جہ تھا۔ نوکروں کے ساتھ جوٹھے برتن دھوتے ہوئے بھی مجھے یہ احساس تقاخر ہتا کہ میں جس گھر میں کام کر رہا ہوں وہ

میرے سکے چاچا کا ہے۔

مجھے رہنے کے لئے ایک کوارٹراٹ کر دیا گیا تھا۔ میرے ذمہ جو کام تھے ان میں گاڑی دھونا، باہر سے سودالانا، مالی کے کام میں اس کا ہاتھ بٹانا اور کتے کو نہلانا شامل تھا۔ باقی تو سارے کام میں بخوبی کر لیتا لیکن کتے کو نہلاتے ہوئے مجھے عجیب سی گھن آتی۔ وہ الو کا پٹھا بھی شائد نہانے میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس لئے کسی روز نہانے میں دیر ہو جاتی تو غراتے ہوئے اپنی ناراضی کا اظہار کرنے لگتا اور بلاوجہ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اس کتے کا نام چاچی نے ”جیکی“ رکھا ہوا تھا۔ کتوں کے انگریزی نام رکھ کر شائد ہم لوگ انگریزوں سے اپنی ذلت کا بدلہ لیتے ہیں۔ بہر حال ”جیکی“ کو اس گھر میں وہ مقام حاصل تھا جو شائد مختار چاچا کو بھی حاصل نہ ہو گا۔

”جیکی“ کی بے پناہ خدمت ہوتے دیکھ کر بعض اوقات میں شدت سے سوچنے لگتا کہ کاش میں بھی ”جیکی“ ہوتا۔ جانور ہونا بھی کتنی عیاشی ہے۔ نہ دولت کی ہوس نہ رشتوں کا خیال، نہ دنیا داری کا خیال، نہ سیٹھس کا مسئلہ لیکن شائد آنے والے دور میں کتے بھی اس مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں۔ کیونکہ انہیں جس طرح کا ماحول مل رہا ہے وہ انہیں ان کی اوقات بھلا دینے کے لئے کافی ہے۔ انتظار کیجئے اس وقت کا جب کتے ہمارے ہم پلہ ہوں گے۔

”اٹھ بلھے شاہوا، نہیں تے بازی لے گئے کتے، تیتھوں اُتے“

”جیکی“ کو نہلانے کے بعد میں دو روپے والے صابن اور ریت سے رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھ صاف کیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر سلطان بابا بہت ہنسا کرتے تھے۔ سلطان بابا کو ٹھکی کے چوکیدار تھے نہایت نمازی، پرہیزگار اور اللہ والے تھے۔ مجھے پہلے دن سے ہی وہ بہت اچھے لگے۔ بالکل اپنے اپنے سے۔ مجھ سے کہتے تھے ”کا کے! کتے کو ہاتھ لگ جائے تو صرف کلمہ پڑھ کر اچھی طرح دھو لیا کر.....“ پھر ایک جھر جھری لے کر کہتے ”سوہنے رب کی کیا شان ہے، یہ جو انسان خود پرمان کرتا ہے، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اب دیکھو کتے کو ہاتھ لگ جائے تو کلمہ پڑھ کر دھونے سے ہی ہاتھ پاک ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی مردہ انسان کو یعنی میت کو ہاتھ

چھو بھی جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے..... اللہ معافی..... اللہ معافی“ وہ بڑبڑانے لگتے اور میں اسی دور ان کھسک جاتا۔ مجھے اس گھر میں رہنے کا طریقہ آگیا تھا۔ رفتہ رفتہ چاچی کا مزاج بھی میرے سمجھ میں آگیا اور میں ہر ممکن ان سے دور رہنے کی کوشش ہی کرنے لگا۔ ویسے بھی نوکروں کے درمیان میں بالکل آزاد تھا۔ وہ میری بات سمجھتے تھے اور میں ان کی۔ اگرچہ میری عمر ان کے برابر نہیں تھی لیکن نوکروں کے محتاج نہیں ہوتے۔

میں صبح چھ بجے ہی اٹھ جاتا اور پانی والا پائپ لے کر گاڑی دھونے لگ جاتا۔ گاڑی دھوتے ہوئے مجھے گنگناٹے کا بڑا شوق تھا۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا کہ میں سارا سارا دن گاڑی دھوتا رہوں اور گنگناٹا رہوں۔ میں کیا گنگناٹا تھا اس کا تو مجھے علم نہیں تھا بس منہ سے لایعنی آوازیں نکلتی رہتی تھیں۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اب مصیبتوں کا دور ختم ہو گیا ہے لیکن یہ میری بھول تھی۔ چاچی کی بڑی بیٹی شازیہ کو کرکٹ کا شوق ہوا تو شامت میری آگئی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں بلا پکڑ لیتی اور مجھ سے کہتی بال کراؤ۔ میں حتی الامکان کوشش کرتا کہ گیند اتنی آہستہ اور آسان کراؤں کہ وہ با آسانی شارٹ مار سکے لیکن ایک تو بلا بہت بڑا تھا دوسرے وہ ہٹ اس وقت لگاتی جب گیند اس کے پاس سے گزر جاتی۔ بس اس کا غصہ انتہا کو پہنچ جاتا اور وہ ہاں ہاں کر کے رونا شروع کر دیتی۔ میرے ہوش اڑ جاتے میں بڑی مشکل سے اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا لیکن وہ مسلسل چیختی جاتی کہ میں گیند صحیح طرح سے نہیں پھینکتا۔ میں بڑی منت سماجت کے بعد اسے چپ کرتا اور معافی مانگ کر وعدہ کرتا کہ انشاء اللہ اب گیند بالکل ٹھیک کراؤں گا۔ لہذا اگلی بار گیند اس سے بھی آہستہ کراتا لیکن پھر وہی ہوتا اور اس کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگتیں۔ اس دور ان اول تو اس کا بڑا بھائی نعیم مجھے دو تپھر لگا جاتا ورنہ چاچی گھر میں ہوتیں تو لال پیلی ہوتی ہوئی آتیں اور بغیر وجہ پوچھے مجھے دھکا دے کر اور ٹھڈے مارنے لگتیں۔

”کم بخت عذاب بنتا جا رہا ہے۔“ میں دانت بھیجنے ان کے ٹھڈے کھاتا رہتا اور شازیہ بے

پرواہی سے اندر چلی جاتی۔

جیسے جیسے اس گھر کے ماحول سے میری واقفیت ہوتی گئی۔ مجھ پر سب کچھ کھل گیا۔ یہ ایک ایسا گھر تھا جہاں صرف اور صرف میری چاچی کی حکمرانی تھی۔ گویا چاچا کھپتلی شوہر تھے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کبھی انہیں چاچی کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہوئے دیکھا ہو۔ وہ نہایت سنجیدہ رہا کرتے تھے۔ ہر وقت ان کے چہرے پر عجیب سی پریشانی چھائی رہتی۔ بس سگریٹ پر سگریٹ پیتے، فائلیں دیکھتے اور ٹیلی فون پر دفتری معاملات نمٹاتے رہتے۔

میں عمر کے اس حصے میں تھا جب بچے شرارتیں کرتے ہیں، چیختے ہیں، چلاتے ہیں، میں چیختا بھی تھا چلاتا بھی تھا..... لیکن اپنی خوشی سے نہیں بلکہ چاچی کی مار سے۔ انہیں تو مجھ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔



وقت کچھ اس طرح سے گزرا کہ کچھ بھی تو نہ پتا چل سکا۔ وہ تو جب ایک روز پولیس والے نے میرا شناختی کارڈ مانگا۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں اٹھارہ سال سے زیادہ کا ہو گیا ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آخر اتنا بہت سا وقت اتنی جلدی کیسے گزر گیا۔ بہر حال مجھے خوشی تھی کہ اس گزرے وقت نے اگر مجھے بہت سی تلخیاں دی تھیں تو ساتھ میں ایک بہت بڑی خوشی بھی دی تھی اور اس خوشی کا نام تھا شازیہ..... مجھے نہیں معلوم کہ کب مجھے وہ اچھی لگنے لگی تاہم اتنا پتا ہے کہ اب وہ میری طرف دیکھ کر کبھی کبھار مسکرا دیا کرتی تھی مجھے اتنا شعور تو نہیں تھا کہ میں باقاعدہ اس جذبے کو سمجھ سکتا تاہم میں نے محسوس کیا کہ میں کچھ خوش مزاج سا ہوتا جا رہا ہوں۔

میری عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ چاچی کا ہاتھ بھی قدرے کنٹرول میں آ گیا تھا۔ تاہم اب وہ نظروں ہی نظروں میں مجھے ایسے طمانچے مارتی تھیں کہ میرا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ مجھے ان کے گھر میں رہتے ہوئے چھ سال سے زائد ہو چکے تھے لیکن آج تک چاچی نے کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کی تھی۔ ان چھ سالوں میں مجھے کئی بار بخار کا سامنا کرنا پڑا کئی بار میں

سیڑھیوں سے گرا کئی بار رویا، کئی بار چلایا سینکسی نے میرا درد محسوس نہ کیا سوائے سلطان بابا کے۔ وہ ہر عید پر مجھے اپنے پیسوں سے نیا سوٹ سلوا کر دیتے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی بس اپنے جیسی ہی ایک نیک بیوی کے ساتھ عمر کے آخری ایام اس کو ٹھی میں گزار رہے تھے۔ دیے تو مجھے یقین تھا کہ شازیہ بھی میری تکلیف پر کچھ اچھا محسوس نہیں کرتی۔ تاہم چاچی اس بات کا خاص خیال رکھتی تھیں کہ میں شازیہ یا زگس سے فری نہ ہونے پاؤں۔ اور شام یہی وجہ تھی کہ مجھے کبھی بھی شازیہ کے خیالات تک آگاہی نہ ہو سکی۔

نعیم نے اس دوران ایف اے کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اب بی اے میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا چاچا کی آمدنی کچھ اور بڑھ گئی تھی اور اسی کی برکت سے گھر کے سامان میں بھی چھ سالوں میں خاصے نئے اضافے ہو چکے تھے۔ بیشتر دستی چیزوں کی جگہ مشینی چیزیں لے چکے تھیں۔ شازیہ نے ایف اے میں داخلہ لیا تھا جبکہ زگس نے نویں کا امتحان پاس کیا تھا۔ یہی وہ دن تھے جب اچانک ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

میرا کوارٹر مین گیٹ سے دائیں جانب تھا جہاں سے اوپر کی منزل کے سارے کمرے بخوبی نظر آتے تھے۔ یہ کوٹھی تین منزلہ تھی۔ غالباً اس روز جمعرات تھی، ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا سردیوں کے دن تھے میں بھی اپنے کوارٹر میں رضائی میں دبکا ریڈیو سن رہا تھا۔ اچانک میرے کوارٹر کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں چونک اٹھا میری حیثیت ایسی نہ تھی کہ میرے دروازے پر دستک دے کر آیا جاتا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اگر دروازے پر ایسی دستک ہو تو جواب میں کیا کہا جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ میں نے جلدی سے رضائی اتاری اور چپل پہن کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی میں دروازے سے دو ہاتھ دور ہی تھا کہ دروازہ دھیرے سے کھلا اور جو چہرہ مجھے نظر آیا اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

چاچا مختار میرے سامنے کھڑے تھے چھ سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ میرے کوارٹر میں آئے تھے۔ لیکن رات کے اس پہر انہیں مجھ سے کیا کام آن پڑا تھا۔ میرے منہ سے بے

الغبار اگا۔

”آپ..... چاچا..... آپ“

”ہاں میں.....“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

میں نے پہلی دفعہ انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اس لئے بڑا عجیب لگا۔ بہر حال میں نے فوری طور پر ان کے آگے موڑھا رکھ دیا اور کہا بیٹھے۔

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں میں بیٹھنے نہیں آیا..... بلکہ تم سے معافی مانگنے آیا ہوں“

”معافی.....“ میں مزید حیران ہو گیا۔ میری اوقات ہی کیا تھی۔

ہاں..... معافی..... مجھے احساس ہو گیا ہے کہ اس گھر میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک ہوا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد کوئی تمہارے ساتھ سختی نہیں کرے گا۔ تم روزانہ سکول جایا کرو گے، سرونٹ کو اسٹریٹ بجائے گھر کے اندر کمرے میں رہو گے۔ کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرو گے اور سیر کرنے گاڑی پر جایا کرو گے.....“

چاچا مختار بولتے جارہے تھے اور حیرت سے میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ میں نے دو تین دفعہ آنکھیں ملیں جسم پر چٹکی بھی کاٹی لیکن یہ خواب ثابت نہ ہوا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ چاچا مختار شاید یہ سب میرے باپ کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی جھجک کے بعد پوچھا

”لل..... لیکن میں تو ایسے بھی خوش ہوں، آخر اس کی کیا ضرورت ہے“

”ضرورت ہے اسی لئے تو آیا ہوں۔ اصل میں میری خواہش ہے کہ تم میرا ایک کام کر دو“

چاچا نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

میں پھر حیران ہو گیا ”جی چاچا کون سا کام؟“

”کام یہ ہے کہ.....“ چاچا نے باہر کی طرف اشارہ کیا ”وہ سامنے کمرے کے دروازے کے قریب ایک کانڈ کا ٹکڑا پڑا ہے وہ اٹھا لاؤ“

میں ان کا منہ تنکنے لگا۔ یہ بھی بھلا کوئی کام تھا کاغذ کا اتنا سا ٹکڑا تو وہ خود بھی اٹھا سکتے تھے۔ اس کے لئے میری خدمات کی کیا ضرورت تھی۔ تاہم میں نے اس بات کو ان کا حکم سمجھا اور جلدی سے سلپیر پہن کر باہر نکل آیا۔

چودھویں کی رات تھی، ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھی میں سب سو رہے تھے۔ میں نے بڑے اطمینان سے جا کر کاغذ اٹھایا اور واپس مڑنے ہی لگا تھا کہ اوپر کے کمرے سے جو چاچا اور چاچی کا تھا اچانک ایک گرجدار آواز آئی۔

”ٹھہر جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا“

میں نے فطری رد عمل کے طور پر اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا اور میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کانچے رہ گیا۔ چاچا مختار کھڑکی میں بندوق تانے کھڑے تھے۔ میں چونکہ نسبتاً اندھیرے میں تھا اس لئے ان سے پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اگر یہ چاچا مختار ہیں تو وہ کون تھا جو میرے کمرے میں آیا تھا میں نے ایک نظر کمرے کی طرف ڈالی۔

ہلومت..... چاچا غرائے اور پھر زور سے چلائے۔ سلطان..... سلطان بابا..... چاچا کی آواز سننے ہی گیٹ پر بیٹھے سلطان بابا نے بڑی پھرتی سے اپنی بندوق اٹھائی اور اندر کی طرف لپکے۔ مجھے نیچے اور چاچا مختار کو کھڑکی میں سے مجھ پر بندوق تانے دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ نہ سمجھے پھر بھی احتیاطاً انہوں نے اپنی بندوق سیدھی کر لی اور میرے قریب آکر بولے۔ کیا ہوا۔ میرے جواب دینے سے پہلے ہی چاچا مختار گرجے۔ سلطان جکڑ لو اس کو جانے نہ پائے.....

لل لیکن سرکار یہ تو اپنا نور ہے..... نور محمد سلطان بابا جھجکے!

نور؟؟؟؟ چاچا کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ پھر وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ اتنی دیر میں باقی لوگ بھی جاگ گئے تھے اور نیچے ہی آرہے تھے۔

میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ کاغذ کا وہ ٹکڑا ابھی تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے ارد گرد سب لوگوں کا ہتھمکنا لگ گیا۔ چاچا سیدھے میری طرف آئے حیرت سے میرا جائزہ لیا پھر بولے ”کیا کر رہے تھے؟“

وہ وہ جی آپ نے کہا تھا کہ کاغذ اٹھا لاؤ۔ میں بوکھلا گیا۔
میں نے..... میں نے.....؟؟؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میں نے کب تم سے یہ کہا
؟؟؟ وہ سب سنا ہو گئے۔

چاجی بڑی تیکھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔
آپ..... آپ ابھی جب میرے کوارٹر میں آئے تھے۔
کیا کہا..... میں تمہارے کوارٹر میں آیا تھا اوگدھے! میں تو شام کے بعد ابھی تک اپنے کمرے
سے نکلا ہی نہیں۔ جھوٹ بولتے ہو۔

چاچا نے آنکھیں نکالیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ اتنے میں چاجی
آگے بڑھیں اور چہیتے ہوئے لمبے میں بولیں
کون سا کاغذ تھا جسے تم اٹھانے آئے تھے۔

میں نے جلدی سے مٹھی کھول دی سب کے چہرے کاغذ پر جھک آئے۔ وہ ایک عام سا کاغذ
تھا۔ جس پر گنتی کے کچھ حروف لکھے ہوئے تھے۔

تعویذ..... چاجی نے اعلان کیا اور چاچا کے حلق سے ایک طویل ہوں نکلی۔
میری بد قسمتی یہ تھی کہ یہ کاغذ شازیہ کے کمرے کے قریب پڑا تھا۔ چاجی بضد تھیں کہ میں
ان کی لڑکی پر کوئی تعویذ گندہ کرنے کے چکر میں ہوں۔ جبکہ میں قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین
دلا رہا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ چاچا مختار کے کہنے پر کیا ہے۔ میرے بار بار اصرار پر ایک دفعہ
تو چاجی نے بھی مشکوک نگاہوں سے چاچا کو دیکھا۔ لیکن چاچا کے پاس اپنے کمرے میں رہنے
کے ناقابل تردید ثبوت موجود تھے۔ شام ٹھیک سات بجے انہوں نے نیند کی گولی کھائی تھی
اور یہ گولی انہوں نے چاجی کے سامنے کھائی تھی اور چاجی کو کم از کم اتنا یقین تھا کہ گولی
جھوٹ نہیں بول سکتی لے دے کہ بات اسی پر آٹھری کہ میں بھی اپنے باپ کے نقش قدم
پر چلتے ہوئے جادو وغیرہ کے چکروں میں پڑ گیا ہوں۔

نعیم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مجھ کا گھر میں رکھنا ہی گناہ ہے۔ اس رات بے شمار نظروں

نے مجھے چھلنی کیا ہے۔ بے شمار طنز کے تیر میرے دل میں پیوست ہوئے۔ تاہم اس سارے منظر میں ایک نظر ایسی بھی تھی جس میں مجھے نفرت کی بجائے بے بسی نظر آئی۔ اور اسی ایک نظر نے مجھے باقی سب نظروں کی تنگی بھلا دی۔ میں چپ چاپ واپس کمرے میں آ گیا۔



دروازہ کھولتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا..... سامنے چار پائی پر چاچا مختار بیٹھے مسکرا رہے تھے..... میرا جسم گویا پتھر کا ہو گیا۔ میں جہاں تھا وہیں جم گیا خوف کا ایک طوفان میرے بدن پر چھا گیا مجھے دیکھ کر وہ بولے..... لے آئے ہو کاغذ؟

ان کی آواز مجھے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اچانک میں پوری قوت سے چلایا چاچا، چاچی، سلطان بابا..... میری چیخ و پکار سنتے ہی کمرے میں موجود چاچا مختار اچانک غصے میں آ گئے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور میری گردن دبوج لی۔ میری چیخ نکل گئی۔ اتنی دیر میں سب لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر رسید کیا اور نسوانی آواز میں بولا۔

خون رواں ہو گیا ہے..... بس اب بہت جلد تیرے پاس آؤں گی۔ خبیث..... یہ کہتے ہوئے اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور غائب ہو گیا۔

سب لوگ پھر جمع ہو گئے تھے۔ میں تھپڑ لگنے سے دوڑ جا گر ا تھا۔ سلطان بابا نے مجھے اٹھایا میں نے خوفزدہ نظروں سے اپنے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ..... چاچا..... مختار..... وہ..... پھر آگئی ہے..... وہ.....

چاچا مختار نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا پھر پاؤں کی ٹھوک سے دروازہ کھول دیا اور اندر چلے آئے۔ کوارٹر میں ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔ انہوں نے خاموش لیکن گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور چپ چاپ باہر چلے گئے۔ چاچی نے البتہ اندر آنے سے گریز کیا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ باہر کیا کھسر پھسر ہوئی۔ تاہم تھوڑی دیر بعد سلطان بابا مجھے اپنے ساتھ مین گیٹ کے پاس بنی کوٹھری میں لے گئے اور دھیرے سے بولے۔ لے اُدھر سوچا میں تیرے

پاس ہی ہوں میرے بچے۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے کچھ کہنے کی بجائے آنسوؤں بھری آنکھیں موند لیں۔ تاہم خوف میرے اندر ڈیرہ جما چکا تھا۔



دوسرا واقعہ اس سے تقریباً دو ہفتوں میں پیش آیا۔ اس واقعہ نے تو مجھے بالکل ہلا کے رکھ دیا۔ جبکی کو نہلانے کے بعد میں اکثر ساتھ والے پارک میں سیر کروانے کیلئے جایا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو مجھے اس کتے سے بہت خوف آتا تھا۔ لیکن اب دھیرے دھیرے ہماری جان پہچان بڑھتی جا رہی تھی اب وہ بلا وجہ مجھ پر غراتا نہیں تھا بھوک بھی لگتی تو پاس آکر دم ہلا دیا کرتا تھا۔ جبکی اس سارے علاقے میں سب سے خطرناک کتا سمجھا جاتا تھا۔ نسلی ہونے کی وجہ سے اپنی جان پہچان کے لوگوں کے علاوہ کسی بھی اجنبی کو دیکھ کر کان کھڑے کر کے گھورنے لگتا تھا۔ بلا وجہ بھونکتا نہیں تھا۔ تاہم ہر وقت کسی نادیدہ قوت سے لڑنے کے لئے تیار نظر آتا تھا میں اس کے گلے میں زنجیر نہیں پہناتا تھا۔ اگرچہ اس قسم کے خطرناک کتوں کو کھلا رکھنا بھی بذات خود ایک خطرہ ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین ہوتا تھا کہ جبکی میری موجودگی میں کوئی بد تمیزی نہیں کرے گا۔

یہ اس روز کی بات ہے جب میں جبکی کو نہلانے کے بعد قریبی پارک میں سیر کے لئے لے گیا۔ اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ چونکہ سردیوں کا موسم تھا۔ اس لئے پانچ بجے سے ہی اندھیرا اچھانے لگا تھا۔ میں ساتھ پڑے بیچ پر بیٹھ گیا اور جبکی ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اچانک پارک کے دوسرے کونے سے بانسری کی آواز سنائی دی۔ بانسری میں بڑا درد تھا۔ میں تو جیسے مدہوش ہو گیا۔ سنگیت تو ویسے بھی میری کمزوری تھا۔ میں نے اتنی خوبصورت بانسری سنی تو ارد گرد سے بیگانہ ہو گیا۔ پتہ نہیں بانسری کے سروں میں کیا طاقت تھی کہ مجھے اپنا جسم بے جان ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ جبکی میری اس حالت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دور نکل گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بانسری نواز کون سی دھن بجا رہا تھا۔ تاہم اتنا پتا ہے کہ ایسی آواز اکثر

میرے دل سے نکلا کرتی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ میں اسی بانسری کے سحر میں کھویا رہا۔ پھر جیسے ہی آواز بند ہوئی میں بھی حقیقت کی دنیا میں پہنچ گیا۔ ایک دم مجھے یاد آیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بجنے والے تھے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا چکا تھا اور جبکی غائب تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ جبکی..... جبکی۔

تھوڑی ہی دیر بعد سامنے والی جھاڑیوں سے جبکی دم ہلاتا ہوا برآمد ہوا اور میری جان میں جان آئی۔ اتنا مہنگا کتا اگر میرے ہاتھوں گم ہو جاتا تو چاچی میری سونسلوں تک کو نہ معاف کرتیں۔ جبکی بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی جیسے اس نے کوئی بڑی دلچسپ اور مزیدار چیز دیکھ لی ہو۔ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور میرا منہ بن گیا۔ وہ غالباً مٹی میں قلابازیاں لگا کر آیا تھا کیونکہ اس کے بال مٹی سے اٹے ہوئے تھے حالانکہ میں ابھی اسے پاؤڈر سے نہلا کر لایا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اندھیرا بہت پھیل چکا ہے اور مزید دیر ہوئی تو چاچی آسمان سر پر اٹھالے گی۔ میں نے دھیرے سے کہا جبکی..... چلیں!

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر باقاعدہ عورت کی آواز میں بولا۔ بڑے خوش پھر رہے ہو..... خبیث..... خون رواں ہو گیا ہے..... میں بہت جلد آؤں گی.....

میرے دل کی دھڑکن رک گئی..... خوف کے مارے میری آنکھیں اٹل پڑی..... میں نے ایک جھپٹکے سے اسے پرے پھینکا اور پوری قوت سے چلایا۔

بابا..... بابا.....

اچانک جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے تیزی سے حرکت کی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب جنگلی قسم کا انسان برآمد ہوا اور میری طرف بڑھا۔ اسے دیکھتے ہی جبکی نے زقہ لگائی اور غائب ہو گیا۔ جنگلی کو دیکھ کر میں کانپنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں چیختا اس نے جلدی سے کہا۔ گھبراؤ مت میں تمہاری مدد کو آیا ہوں۔

مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں بے ہوش ہو کر گر جاتا لیکن اس کے جملے نے مجھ میں تھوڑی سی ہمت پیدا کر دی۔ میں ساکت کھڑا رہا۔ وہ میرے پاس آیا تو چاند کی روشنی میں اس کے خدو خال واضح ہوئے۔ وہ کوئی ملنگ ٹائپ بندہ تھا۔ لمبے لمبے بال چھتھڑا لباس اور ہاتھ میں بانسری۔ بانسری دیکھ کر میں چونکا۔ تو کیا یہ بد ہیئت شخص اتنی خوبصورت بانسری بجا رہا تھا؟ میں نے سوچا اتنے میں وہ قریب آکر بولا

کہاں رہتے ہو؟

ادھر..... میں نے اشارہ کیا مختار صاحب کی کوٹھی میں اور وہ قریب ہو گیا اور غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا سچ بات تو یہ تھی کہ مجھے اس سے بھی خوف آنے لگا تھا۔

م..... میں چلتا ہوں میں نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک سامنے سے پھر جیکی نمودار ہوا اور میں جہاں تھا وہیں پتھر ہو گیا۔ وہ سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں غش کھا جاتا۔ اسی جنگلی کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

ڈرو مت! یہ تمہارا کتا ہے جو کتنا انسانی آواز میں بات کر رہا تھا وہ طلسمہ تھی۔

طلسمہ.....؟؟.....کک؟؟.....کون طلسمہ؟؟.....؟؟..... میری گھنگھی بندھ گئی۔

جنگلی نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا تم نہیں جانتے طلسمہ کیا ہے؟

میری خاموشی اور حیرت دیکھ کر اس نے سر ہلایا اور بولا اگر تم نہیں جانتے تو یہ اور بھی خطرناک بات ہے۔ بہر حال بہتر یہی ہے کہ ابھی تم گھر جاؤ اور اگر ہو سکے تو کل مجھے پانچ بجے اسی جگہ ملنا۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

اس نے بات مکمل کی اور میری رگیں تن گئیں..... میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر تیزی سے قدم اٹھائے اور کوٹھی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جیکی بھی میرے ساتھ تھا۔

مجھے اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ آج سے آٹھ سال پہلے ہونے والا ہولناک چیلنج اپنی عملی شکل میں سامنے آنے کے لئے تیار ہے۔ میرے سامنے پوری فلم گھوم گئی۔ ابا اور اماں کی خوفناک موت یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اس پڑیل کے الفاظ یاد آ گئے۔ اس نے کہا تھا کہ جب تمہارا بیٹا بیس سال کا ہو جائیگا تو میں تبت کی مدھوپہاڑی پر پھر جنم لوں گی اور انتقام لوں گی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تبت کدھر ہے۔ اچانک مجھے ابا کے الفاظ یاد آئے انہوں نے مرتے وقت کہا تھا کہ جب بیس سال کے ہو جاؤ تو آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز مت کھانا۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میں سوچنے لگا۔ پھر یاد آیا کہ سلطان بابا سے اپنی عمر اور تبت کا پوچھتا ہوں۔

میں اپنے کوارٹر سے نکلا ہی تھا کہ پہانے شازیہ اپنی بہن زرگس کے ساتھ لان میں کرکٹ کھیلتی دکھائی دی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ زرگس نے گیند پھینکی جو ہمیشہ کی طرح اس نے ضائع کر دی۔ میری ہنسی نکل گئی۔ ہنسی کی آواز سنتے ہی دونوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میں گھبرا گیا۔ شازیہ بھی مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”نورے بھائی! دیکھیں ناں اسے تو بالکل بھی نہیں کھیلا آتا“ زرگس نے احتجاج کیا۔

یہ لڑنازیہ منہ بنا کر بولی ”کھیلنا خاک ہے اس کو تو گیند ہی صحیح نہیں کرانی آتی۔ نورے تم کیند مہینلو اس نے فرمائش کی۔ میں نے بے اختیار نرگس سے گیند لی اور نہایت آہستہ سے اس کی طرف اچھالی۔ گیند ابھی شاید آدھے راستے ہی میں ہو گئی کہ اچانک سامنے برآمدے سے پابندی برآمد ہوئیں۔ ایک لمحے کے لئے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ میں ان کی بیٹیوں کے ساتھ اس قدر فری ہو سکتا ہوں۔ پھر جیسے ہی انہیں ہوش آیا وہ پاگل سی ہو گئیں اور وہیں کھڑے کھڑے چلائیں۔

”نعیم..... نعیم..... دیکھو اس موئے کی جرات“..... نعیم دھڑ دھڑ کر تا بھاگتا آیا، میں بحر موموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ نعیم کو دیکھتے ہی چاچی غرائیں۔

”دیکھو..... دیکھو اس کینے کی مجال..... بچیوں کو تنگ کر رہا ہے“

چاچی میں تو..... میں نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

”الو کے پٹھے“..... نعیم نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ایک زوردار گھونہ میرے منہ پر جمادیا اور میں تیور کر گھاس پر گر پڑا۔ شازیہ میری طرف بڑھی لیکن چاچی نے گھور کر اسے دیکھا..... وہ وہیں جم گئی۔ نعیم نے مجھ پر تابڑ توڑ کے برسانا شروع کر دیئے۔ وہ مجھے مارتا جا رہا تھا اور میں خون و خون ہوا جا رہا تھا۔ بے عزتی اور شرم کے احساس نے مجھے غصہ دلادیا۔ کوٹھی کے سارے ملازمین یہ یکطرفہ لڑائی دیکھ رہے تھے۔ میں نے آؤ دیکھانہ تاؤ اور سنبھل کر ایک زوردار ہاتھ نعیم کی گدی پر لگا دیا۔

مجھے کیا پتا تھا کہ ہاتھ اتنا سخت پڑے گا۔ وہ زور سے اچھلا اور تین چار قلابازیاں کھاتا ہوا گھاس پر ڈھیر ہو گیا۔ سب کو جیسے سانپ سو گھ گیا۔ چاچی یکدم سکتے میں آگئیں۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ان کے لاڈلے بیٹے پر کبھی ہاتھ اٹھا سکتا ہوں۔ انہوں نے ایک چیخ ماری اور اپنے بیٹے کی طرف لپکیں۔

”نعیم..... میرے بیٹے!“

کوٹھی کے سارے ملازمین نعیم کی طرف لپکے۔ میں خون میں لت پت کھڑا تھا لیکن میری

طرف کسی نے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ سلطان بابا پوکہ گیٹ پر تھے اس لئے ابھی ان تک اس ہنگامے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔

نعیم کے منہ پر فوری طور پر پانی کے چھینٹے مارے گئے اس نے نیم وا آنکھوں سے چاچی کو دیکھا اور کہا

”مم..... میں کہاں ہوں؟“.....

یہ سنتے ہی شازیہ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور مجھے ایک لمحے میں اپنی اذیت بھول گئی۔

چاچی نے نعیم کو پانی کا گلاس پلایا اور پھر بھری ہوئی شیرینی کی طرح میری طرح لپکیں۔
 ”بے شرم! جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے۔ میں آج ہی تیرا بندوبست کرتی ہوں، دیکھو غضب خدا کا۔ ایک تو مشنڈے کو رہنے کے لئے جگہ دی، اوپر سے ہم پر ہاتھ اٹھانے لگا ہے۔ تجھے شرم نہ آئی میرے بیٹے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ کم بخت تجھے تو گاؤں والوں نے بھی دھتکار دیا تھا، یہ ہماری ہی غلطی تھی کہ تجھ سپو لیے کو گھر میں لے آئے لیکن..... اب تو اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ آجانے دے مختار کو۔ تیری ہڈیاں پسلیاں نہ ایک کروادیں تو نام بدل دینا۔ آخر رہاناں پینڈو کا پینڈو، جاپنے باپ کی طرح غلیظ جادو سیکھ اور اپنی ماں کی روح سے باتیں کرتا کہ.....“

”چاچی.....“ میں زندگی میں پہلی بار پوری قہمت سے دھاڑا۔

ایک لمحے کے لئے تو چاچی بھی سہم گئیں۔

”میری ماں یا میرے باپ کے بارے میں ایک لفظ بھی بولا تو قسم خدا کی گردن دبا دوں گا تیرے بیٹے کی“ میں نے غرا کر کہا..... اس کا فائدہ یہ ہوا کہ نعیم سمیت چاچی نے بھی وقتی طور پر چپ سادھ لی۔

چاچی نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر لے گئی۔ شازیہ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ تاہم وہ بھی وہاں نہیں رکی۔ سلطان بابا کو شاید اطلاع مل چکی تھی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے۔ میرے

چہرے پر خون دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔

”کیا ہوا..... یا اللہ خیر“

”کچھ نہیں بابا.....“ میں نے سر جھٹکا ”بس میں اب یہاں نہیں رہوں گا“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے پتا تھا کہ اب چاچی کسی بھی صورت مجھے اس گھر میں برداشت نہیں کریں گی۔ اب تو میں ان کے بیٹے پر ہاتھ بھی اٹھا چکا تھا۔

میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور بے سمت سوچنے لگا۔ میں اس دنیا میں اکیلا تھا، کہیں بھی چلا جاتا، کوئی روک ٹوک نہ تھی لیکن پھر بھی سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ واپس گاؤں چلا جاؤں لیکن پھر ماں باپ کی موت کا خوفناک منظر میری آنکھوں کے آگے گھوما اور میں نے ایک جھبر جھری لے کر اپنا ارادہ بدل دیا۔

شاید رات گہری ہونے لگی تھی کیونکہ عشاء کی اذان کی آوازیں دور والی مسجد سے آنا شروع ہو گئیں تھیں۔ میں نے اپنا ٹونا پھونٹا پیچی کیس کھولا اور اس میں کپڑے بھرنے لگا۔ میرا سامان تھا ہی کتنا۔ دو تین جوڑے کپڑوں کے، اور بستر،..... یا پھر ٹوٹی ہوئی چند پرانی چپلیں۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا، یہی کچھ میرا اثاثہ تھا، میں نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا۔ میں آج رات ہی اس بے حس گھر سے چلا جانا چاہتا تھا۔ باہر کی دنیا میں مجھے لاکھ جوتے پڑتے، لیکن یہ احساس تو نہ ہوتا کہ یہ میرے اپنوں نے مارے ہیں۔ ابھی میں سامان پیک کر ہی رہا تھا کہ مجھے کھڑکائی دیا۔

میں تیزی سے مڑا، اور اس لمحے میرے کوارٹر کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور کمزور سی کنڈی اڑ کر دور جاگری۔ میں سہم گیا۔ دروازے میں تین لمبے بڑنگے بد معاش زہر آلود نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

”ماشاء اللہ..... تو تم ہو مولا جٹ..... ایک نے آگے آتے ہوئے کہا“

”کک..... کیا مطلب..... کون ہو تم..... باہر نکلو..... میں واقعی گھبرا گیا“

ہاہاہا..... جو بابائیں نے ایک زوردار تہقہ لگایا

”ابے کیا پدی اور پدی کا شور بہ..... ہمیں باہر جانے کے لئے کہہ رہے ہو..... شانی! اس چوہے کو ملیا میٹ کر دو“ اس نے غصے سے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا اور اس سے پہلے کہ میں سمجھتا باقی دو مجھ پر پل پڑے۔ تھپڑ، گھونے، لاتیں اور گالیاں..... میری کرناک چیخیں بلند ہونے لگیں لیکن کسی ملازم کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر مجھے ان بد معاشوں سے چھڑاتا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ بد معاش صرف اور صرف مجھے سبق سکھانے کے لئے بلائے گئے تھے۔ انہوں نے مار مار کر مجھے لہو لہان کر دیا۔ شاید سلطان بابا تک میری چیخوں کی آواز پہنچ گئی تھی اس لئے وہ بھاگے بھاگے آئے۔ مجھے پتہ نہ دیکھ کر وہ ایک دم جلالی ہو گئے اور کندھے سے رانفل اتار کر ایک ہوائی فائر کیا اور غرائے ”اوئے کمینو!..... ہٹ جاؤ ورنہ اڑا کے رکھ دوں گا“.....

فائر کی آواز سنتے ہی ان تینوں کے ہوش اڑ گئے اور وہ ایک لمحے میں مجھے چھوڑ کر سیدھے ہو گئے۔ سلطان بابا کی آنکھیں غضب ناک ہو رہی تھیں۔ وہ ابھی تک ان بد معاشوں کو باہر کے آدمی سمجھ رہے تھے حالانکہ کوٹھی کے بچے بچے کو معلوم تھا کہ یہ باہر کے آدمی اندر کے آدمیوں نے بلوائے ہیں۔

نورے پتر!..... فوراً باہر جاؤ اور پولیس کو فون کرو.....“

سلطان بابا نے چوکنے انداز میں ان پر رانفل تانے رکھی۔ وہ تینوں پریشان سے ہو گئے۔ شاید سلطان بابا کے بارے میں انہیں یہ امید نہ تھی۔ میں لہو لہان جسم کے ساتھ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

”دیکھو بابے ہم کوئی چور اچکے نہیں ہیں“ پہلے والے بد معاش نے آگے بڑھنا چاہا لیکن سلطان بابا وہیں سے چلائے ”بکو اس بند کرو اور وہیں کھڑے رہو ورنہ گولی چلا دوں گا.....“ تم جو کوئی بھی ہو بغیر اجازت کوٹھی میں داخل ہوئے ہو اور صاحب جی کے بھتیجے کو مار رہے تھے.....“ تم سے تو اب پولیس ہی نمٹے گی“

بھتیجا.....؟؟؟..... تو کیا یہ لڑکا نیگم صاحبہ کا بھتیجا ہے؟..... اس نے حیرانی سے پوچھا۔

ہاں..... بھتیجا ہے..... اور اب تمہیں لمبی سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا..... سلطان بابا اگر جے۔

میں اتنی دیر میں لڑکھڑاتا ہوا الان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ شازیہ اس دوران شاید کسی کام سے کیراج میں آئی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اسے سکتہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ لیکن میرے لہو لہان جسم نے اسے اتنا ضرور حوصلہ دیا کہ بے اختیار اس کی چیخیں نکل گئیں۔

”امی..... امی..... نورے کا ایکسڈنٹ ہو گیا..... ابو..... امی.....“ وہ کیراج میں ہی کھڑی دیوانہ وار چلائے جا رہی تھی۔ چاچا تو شاید گھر میں نہیں تھے البتہ چاچی بڑے آرام سے چلتی ہوئی باہر آئیں اور شازیہ کو جھڑک دیا۔

”آہستہ بول لڑکی،..... کیا آسمان سر پر اٹھار کھا ہے“

امی..... وہ دیکھیں..... وہ نورے کا خون..... وہ..... نور.....“ شازیہ نے تقریباً رو دینے والی آواز میں کہا اس کی آواز میں التجا بھی تھی اور رحم بھی۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ اسے فوری طور پر ہسپتال لے چلیں، لیکن الفاظ گویا اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔

اگرچہ مجھے پتا تھا کہ یہ سب چاچی کی شرارت ہے، پھر بھی میں نے کوارٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا.....

”وہ..... ادھر..... تین بد معاش مجھے مار رہے تھے.....“

ہاں تو تیری یاریاں بھی بد معاشوں کے ساتھ ہیں، جھگڑے تیرے ہوتے ہیں، بدنام ہم ہوتے ہیں.....“ چاچی نے جھٹ سے میری بات کاٹی.....

لیکن..... میں تو..... میں تو انہیں جانتا تک نہیں انہوں نے آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا..... چاچی بھی میری حالت پر توجہ دیئے بغیر مجھ سے بحث میں جیتنے پر مصر تھیں۔

کوئی کسی کو بلاوجہ نہیں مارتا، تو نے ضرور ان کے ساتھ مل کر کوئی ڈکیتی کی ہے اور انہیں ان کا حصہ نہیں دیا۔

امی میں گرم پانی اور پٹیاں لاؤں..... شازیہ نے بے چینی سے کہا..... شاید اسے میری حالت دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں لیکن چاچی کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کے بال پکڑ لئے اور اس طرح سے مروڑے کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

”تجھے زیادہ ہمدردی ہے اس ڈاکو سے..... بھول گئی ہے کہ اس نے تیرے بھائی کو کیسے مارا تھا..... اس وقت تجھے اپنے بھائی پر کوئی رحم نہ آیا..... چل دفع ہو اندر.....“ چاچی نے اسے زور سے دھکادیا اور وہ دور جا گری۔

میں حوصلہ کر کے دیوار کا سہارا لیکر کھڑا ہوا اور آہستہ سے کہا۔

”چاچی..... سلطان بابا نے رانقل کے ذریعے تینوں کو کمرے میں روک رکھا ہے۔ آپ جلدی سے پولیس کو فون کر دیں“

”کیا؟؟؟..... چاچی کے ہوش اڑ گئے“ سلطان بابا نے ان کو کیوں روکا؟

میں حیرت سے چاچی کو تنکے لگا، کتنا واضح ثبوت دیدیا تھا انہوں نے بد معاشوں سے اپنی وابستگی کا۔ شاید مجھے اتنی تکلیف ان بد معاشوں کی مار سے بھی نہ پہنچی ہو گی جتنی چاچی کے اس جملے سے پہنچی۔ میں نے مزید کچھ کہنا یا سننا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ لڑکھڑاتا ہوا واپس کوارٹر میں آ گیا۔

”کر دیا فون؟؟..... سلطان بابا نے ان کی طرف سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

”نہیں“..... میں نے مختصر سا جواب دیا اور چارپائی پر گر گیا۔

”کیوں.....؟؟؟..... کیوں نہیں کیا“ سلطان بابا حیران ہو گئے۔ بد معاشوں کی آنکھوں میں بھی حیرت تھی۔

اس لئے نہیں کیا کہ یہ لوگ آئے نہیں بلوائے گئے ہیں“..... میں نے آنے والے آنسوؤں کو ضبط کیا۔

”کیا مطلب.....؟ کس نے بلوایا؟..... کون لایا ہے انہیں؟؟؟.....“ سلطان بابا اب مکمل طور پر میری طرف متوجہ تھے ان کی رانقل بھی قدرے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

ان کو جانے دو بابا..... ”بعد میں سب پوچھ لینا“ میں نے منہ چھپالیا۔

بابا کی رائفل خود بخود نیچے ہوتی چلی گئی۔ شاید وہ تینوں بھی اس اشارے کو سمجھ گئے تھے اس لئے ہمت کر کے تیزی سے باہر نکل گئے۔

سلطان بابا نے رائفل ایک طرف رکھی جیب سے رومال نکال کر میرا خون صاف کیا اور پانی کا ایک گلاس بھر کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کے دو گھونٹ پیتے پیتے میری ہچکی بندھ گئی..... میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

سلطان بابا اس کو ٹھکی کے بہت پرانے چوکیدار تھے زمانہ شناس تھے اس لئے تقریباً ساری بات سمجھ چکے تھے تاہم انہوں نے اولیت مجھے چپ کرانے پر دی لیکن مجھے تو برسوں بعد رونے کے لئے ایسی آغوش میسر آئی تھی۔ اس روز میں جی بھر کر رویا۔ اتارو یا اتارو یا کہ لہو سے زیادہ میری قمیض آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ میرے اندر کا سار اور د آنسوؤں کی صورت میں باہر آتا رہا اور مجھے میرے نہ ہونے کا احساس دلاتا رہا۔

کافی دیر تک رو چکنے کے بعد میں نے سر اٹھایا تو سلطان بابا کی داڑھی کو بھی آنسوؤں میں تر پایا۔ میرا دل بھر آیا۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کاش آج میری ماں زندہ ہوتی تو میری ایک چوٹ بھی برداشت نہ کر پاتی۔ یہ مائیں بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ زندہ نہ بھی ہوں تب بھی اولاد کے حق میں ان کا فیض جاری رہتا ہے اور جن خوش نصیبوں کے سروں پر ماں کا سائبان سلامت ہوا انہیں بھلا کوئی دھوپ تنگ کر سکتی ہے۔

لیکن میرا سائبان تو چھاؤں سے عاری ہو چکا تھا یوں لگتا تھا جیسے مصیبتوں کا یہ کڑا درد ساری زندگی مجھ پر چھایا رہے گا۔ اس رات جانے کب سلطان بابا اکثر کو بلالائے اور اس نے میری مرہم پٹی کی۔ مجھے تو اتنا یاد ہے کہ جب میں سو کر اٹھا تھا تو تاریخ و دودن آگے ہو چکی تھی اور میرا آدھا جسم پیٹوں میں جکڑا ہوا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن درد کی ایک تیز لہر نے مجھے واپس دھکیل دیا۔

مجھے اس گھر کے ذرے ذرے سے نفرت ہوتی جا رہی تھی میں ایک لمحے کے لئے بھی یہاں

نہیں رکنا چاہتا تھا۔ اس لئے ہمت لر کے آہستہ آہستہ اٹھا اور اپنی سیس اٹھانے کی کوشش کی۔

”آہ.....“ درد نے مجھے ہلا کر رکھ دیا یقیناً اٹیچی کیس اٹھانا میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگا اسی غصے کے عالم میں نے فیصلہ کیا کہ میں بغیر کسی سامان کے یہاں سے جاؤں گا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ فیصلہ میرے لئے بہتر ہی ثابت ہوا کیونکہ اٹیچی کیس اٹھا اٹھا کر چلنے کی شدید اذیت سے میں بچ گیا تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے کوارٹر کی کھڑکی سے جھانکا ابھی گہرا اندھیرا نہیں پھیلا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے یہاں سے جاتے ہوئے دیکھے اور ویسے بھی اگر سلطان بابا کو میرے اس ارادے کی خبر ہو جاتی تو وہ ہر صورت مجھے روک لیتے۔

میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہونے والا تھا۔ پہلا دور میں نے ہر خوش قسمت بچے کی طرح اپنے ماں باپ اور دوستوں کے درمیان گزارا تھا دوسرے دور میں چاچی اور شہر سے واسطہ پڑا تھا۔ لیکن اب جو دور آنے والا تھا اس سے مجھے قطعاً واقفیت نہ تھی، تاہم اتنا ضرور تھا کہ شہر کی زندگی نے مجھے تھوڑا بہت بااعتماد ضرور بنا دیا تھا۔

میں نے ایک گھنٹے بعد دوبارہ کھڑکی سے جھانکا۔ میری مرضی کا اندھیرا اچھا چکا تھا۔ میں نے میز کھڑکی کے پاس رکھی اس پر چڑھا اور شدید درد کے باوجود بڑی احتیاط کے ساتھ دوسری طرف کود گیا۔ میرا ارادہ کوٹھی کی عقبی سمت سے باہر جانے کا تھا۔ خوش قسمتی سے عقبی سمت کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے بڑے محتاط انداز میں اسے پورا کھولا اور باہر نکل گیا۔ کوٹھی سے باہر آتے ہی جیسے کسی نے مجھ میں انجانی سی قوت بھردی میں نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ زخمی حالت میں ہونے کے باوجود آزادی کا تصور میرے ہر احساس پر غالب آچکا تھا۔ رات کے اندھیرے میں تارکول کی لمبی اور سنسان سڑک پر دوڑتے ہوئے مجھے جو خوشی ملی بیان سے باہر ہے۔ اب مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کافی دور تک نکل آنے کے بعد میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں بے سمت نکل پڑا ہوں۔ مجھے کم از کم

بھاگنے سے پہلے یہ ضرور اندازہ ہونا چاہئے تھا کہ میں کدھر جاؤں گا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن تاریکی میں میری نگاہیں صرف چند گز تک ہی میرا ساتھ دے سکیں۔

میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ رات آہستہ آہستہ تاریک ہوتی جا رہی تھی پتا نہیں کیوں مجھ پر خوف طاری ہونے لگا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جن پر باقاعدہ کچکی طاری ہو چکی تھی۔ اچانک میری نظر سڑک کے درمیان کچھ ہیولوں پر پڑی جو ادھر ہی آرہے تھے۔ میری جان میں جان آئی۔ اب میں ان سے مدد کی درخواست کر سکتا تھا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ از خود میری طرف آرہے ہیں۔ قریب آنے پر میں نے غور کیا تو مجھے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا وہ کُل چار تھے ایک چاچا مختار، ایک چاچی، ایک نعیم اور ایک شازیہ۔ میں برف کی طرح ٹھنڈا پڑا تھا۔ وہ چاروں بھاگتے ہوئے میرے قریب آئے اور میری چیخیں نکل گئیں۔

چاروں کے پیرائے تھے دانت منہ سے تین تین فٹ باہر نکلے ہوئے تھے۔ چاچی مسلسل قہقہے لگا رہی تھی۔

”آگیا..... آگیا..... خبیث میرے ہاتھ آگیا“.....

میں نے ایک زوردار چیخ ماری اور پوری قوت سے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ چاروں میرے پیچھے آنے کی بجائے وہیں کھڑے قہقہے لگانے لگے۔ میں دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ اچانک کسی چیز سے مجھے ٹھوکر لگی اور میں قلابازیاں کھاتا ہوا دوڑ جا کر۔ فوری طور پر اٹھا اور پلٹ کر دیکھا..... نیچے نگاہ پڑتے ہی میرا خون رک گیا..... سڑک پر شازیہ کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی مجھے پھنسانے کی کوئی سازش ہے۔ میری چیخوں سے فضا گونج اٹھی اور میں نے پھر اندھا اندھ بھاگنا شروع کر دیا۔

مجھے دوڑتے ہوئے کوئی دو تین منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ سامنے سڑک کے موڑ سے کسی گلی کی تیز ہیڈ لائٹس میری آنکھوں میں پڑیں اور اس کے ساتھ ہی بریکوں کے چرچانے کی تیز آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

ہوش میں آنے پر پتا چلا کہ میں ایک پولیس گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ پولیس والے مجھے ہسپتال تو لے آئے لیکن اب وہ مجھ سے اپنی اس خدمت کا پورا بدلہ چکانے کے موڈ میں تھے لہذا مجھے آوارگی کے جرم میں اندر کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں ڈکیتی کی کوشش سے ناکام ہو کر بھاگ رہا تھا۔ ایک محرم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں فرار ہو رہا تھا لیکن انہوں نے جانفشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے گاڑی کے ذریعے پکڑ لیا۔

میں رو رو کر انہیں یقین دلاتا رہا کہ میں ڈاکو نہیں ہوں، جواب میں انہوں نے میرا ایڈریس پوچھا۔ میں منھ سے میں پڑ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر انہیں چاچی کا ایڈریس بتا دیا۔ انہوں نے چاچی کو فون کیا تو جواب حسب توقع آیا کہ ہم کسی نورے ڈکیت کو نہیں جانتے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور دانت پیس کر دل ہی دل میں چاچی کو صلواتیں سنادی۔ اب مجھے جیل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ پولیس والوں کو بھی شاید اور کوئی مجرم نہیں مل رہا تھا اس لئے انہوں

نے چھ سات ڈکیتیاں اور چوریاں مجھ پر ڈال دیں۔ پہلے ہسپتال سے میرے زخموں کا علاج کروایا پھر تھانے میں انہی زخموں پر چھتر برسائے اور یوں میری سخت جانی کو ہوا دی۔

میں پہلی مرتبہ جیل گیا تھا وہاں کا ماحول میرے لئے نہایت منفرد تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ ماحول بہت پسند آیا۔ مجھے پہلے پتا ہوتا کہ جیل میری توقعات کے عین مطابق ہے تو میں بہت پہلے کوئی چھوٹا موٹا جرم کر کے یہاں آجاتا۔ یہاں صرف پر اہلم تھی تو کھانے اور نہانے وغیرہ کی۔ باقی ہر چیز میسر تھی۔ جیل میں داغے کے پہلے روز ڈیوٹی افسر نے میرا نام پوچھ کر عمر پوچھی۔ میں نے کہا اندازہ ہے بیس ہو گی۔ یہ سنتے ہی اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا اور گالی دیتے ہوئے بولا ”اندازہ نہیں، بالکل ٹھیک بتاؤ“

میں نے جلدی سے کہا ”پوری بیس سال عمر ہے میری“..... اور فارم پر انگوٹھا لگا دیا۔ اپنی عمر بیس سال لکھواتے ہوئے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میری زندگی میں اس عمر کی کیا اہمیت ہے۔ یہ راز اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مجھ پر 28 دسمبر کی ایک سرد ترین رات کو کھلاجب مجھے جیل میں آئے تین ماہ ہو چکے تھے اور میں اپنی بیرک میں چھروں اور کھٹملوں والا کبل اوڑھے گہری نیند..... سو رہا تھا۔

میری بیرک میں چھ اور بھی قیدی تھے۔ رات کے ٹھیک دو بجے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا کندھا ہلایا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید نئے والا قیدی ہے۔ کیونکہ جیل میں اکثر نئے آنے والوں کو نیند نہیں آتی اور وہ دوسروں کی نیند بھی خراب کئے رکھتے ہیں۔ میں نے سر جھٹک کر کروٹ بدلی اور اسی طرح سو رہا تھوڑی دیر بعد پھر کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔ اب کی بار جھنجھوڑنے میں اتنی شدت تھی کہ میں غصے میں آگیا۔ ایک جھٹکے سے کبل اتار کر پرے پھینکا اور اٹھ بیٹھا۔ کبل پرے پھینکتے ہی میں حیران ہو گیا کیونکہ بیرک میں کوئی بھی قیدی نہیں جاگ رہا تھا سب گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے یا تو کوئی خواب دیکھا ہے یا مجھے وہم ہوا ہے میں نے دوبارہ کبل اوڑھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی نا دیدہ ہاتھ نے پھر مجھے جھنجھوڑا۔

اب کی بارخوف کی ایک لہر میرے اندر سرایت کر گئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کمبل کے ایک کونے سے باہر جھانکا اور میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ابا کی دھندلی دھندلی سی شبہیہ مجھے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ان کے سارے جسم پر چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میری چیخ آخری دموں پر ہی تھی کہ ابا نے گھور کر میری طرف دیکھا اور میری کھگھی بندھ گئی۔ میں باوجود کوشش کے نہ چلا سکا، ان کی سرگوشی مجھے سنائی دی وہ کہہ رہے تھے۔ ”تم میں سال کے ہو چکے ہو، میں بڑی مشکل سے تمہارے پاس آیا ہوں، اور تمہیں یہی خبر دار کرنے آیا ہوں کہ آج کے بعد آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز مت کھانا اور..... اور.....“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے نظریں بدستور ابا کی چہرے پر مرکوز رکھیں۔ ان کا جسم آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہو گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت اذیت میں ہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس لمحے ان پر شدید ترس آیا۔ عین اسی لمحے انہوں نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا اور مجھے ان کی آواز پھانسی گھاٹ سے آتی ہوئی محسوس ہوئی وہ چلا رہے تھے۔ ”کالا جادو لعنت ہے..... آہ..... نورے کبھی اس غلیظ عمل میں مت پڑنا..... کبھی نہیں..... کبھی.....“ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ غائب ہو گئے۔ ان کے غائب ہوتے ہی جیسے اچانک مجھ میں جان پڑ گئی میں ہڑبڑا کر اٹھا لیکن ابا کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شاید ان کی آواز بھی صرف مجھ ہی تک محدود تھی کیونکہ سب قیدی اسی طرح گہری نیند سو رہے تھے۔

میرے کانوں میں ابا کے الفاظ گونجنے لگے کہ ”آگ پر پکی ہوئی چیز مت کھانا“ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ جیل میں ہمیں تینوں وقت دال ملتی تھی اور وہ سو فیصد آگ پر پکتی تھی، روٹیاں بھی آگ پر ہی پکتی تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کل کا سورج میرے لئے کسی نئی مصیبت کا پیغام لا رہا ہے۔ میں نے بیرک کی دیوار سے ٹیک لگالی اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ صبح سویرے میں جب سو کر اٹھا تو ایک سنتری نے مجھے بتایا کہ میری ملاقات آئی ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ مجھ سے ملنے جیل میں کون آ سکتا ہے۔ سلاخوں کے پاس آیا تو ایک نیم مانوس چہرے کو اپنا منظر

پایا۔ باوجود کوشش کے مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے پہلے کہاں دیکھ چکا ہوں، وہ سوٹ میں ملبوس تھا، نہایت صاف ستھرا، ہاتھ میں پائپ اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ مجھے دیکھتے ہی آگے کو جھکا اور سلاخوں کے قریب ہوتے ہوئے بولا ”نورے..... فکر مت کرنا..... سب ٹھیک ہو جائے گا“

میں ہکا بکا اسے دیکھنے لگا..... خدا گواہ ہے کہ مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا، وہ کون تھا اور مجھے کیوں تسلیاں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ میرے جواب کا منتظر رہا، پھر اسی طرح مسکراتا ہوا چلا گیا، اور میں پھر سوچنے لگا کہ میں اس سے کہاں ملا ہوں؟

اتنے میں ناشتے کی گھنٹی بج گئی، مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی لہذا میں سب کچھ بھول بھال کر قطار میں لگ گیا۔ قیدیوں کی قطاریں بڑی منظم ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات ان میں بھی بڑے بڑے سوراخ آن سکتے ہیں، جیل میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان وہ کام بھی کر گزرتا ہے جو وہ جیل سے باہر کرنے میں ذرا سی بھی جھجک محسوس کرتا ہے، ویسے بھی پولیس والوں کا رویہ قیدی کو بے غیرت بنانے میں اکثر بنیادی کردار ادا کرتا ہے بعد میں یہی قیدی جب کچے مجرم بن کر نکلتے ہیں تو سب سے پہلے انہی پولیس والوں کی خبر لیتے ہیں، میں نے جیل میں رہ کر سیکھا ہے کہ آدھی سے زیادہ جیلیں صرف اور صرف جرائم کی تربیت گاہیں ہیں۔ جس طرح آپ کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں ایک سے ایک فنکار موجود ہو، تو لا محالہ ان میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد آپ بھی ان کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں، بالکل یہی حال ہماری جیلوں کا بھی ہے، بڑے بڑے عادی مجرم جب اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے قصے مزے لے لے کر سناتے ہیں تو چھوٹے مجرم اکثر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جیل میں قاتل کو بڑا جی دار سمجھا جاتا ہے، سب سے گھٹیا مجرم جیب کترے اور چور کو گردانا جاتا ہے اصل میں جیل میں بھی ذات پات کا رواج ہوتا ہے۔ قاتلوں کی ذات برہمن اور جیب کتروں، چوروں کی ذات شودر کہلاتی ہے۔

یہ جیل کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے جہاں سب سے بڑا انگہار سب سے بڑا مقام حاصل کرتا ہے۔

شوقے کی بھی بالکل یہی مثال تھی۔ اس کا تعلق منڈی بہاؤالدین کے گاؤں سے تھا، پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا، ہاتھ پاؤں دیہاتیوں کے روایتی بچوں کی طرح اچھے خاصے مضبوط تھے کام کاج کوئی آتا نہیں تھا، تعلیم سے ویسے ہی نفرت تھی اس لئے دنیا میں عزت سے رہنے کا جو پہلا طریقہ اس نے ہوش سنبھالتے ہی سیکھا وہ بد معاشی تھا چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کے لوگ بد معاشوں سے بہت کانپتے ہیں، دیہاتیوں کے دل تو ویسے ہی بڑے کمزور ہتے ہیں بارش کا پانی دعا کی حدیں پھلانگ جائے تو لرزے لگتے ہیں، پنڈک چودھری گلیوں میں نکل آئے تو کانپنے لگتے ہیں، فصل کو کیڑا بھی لگ جائے تو ان کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ شوقے نے بھی اسی بات کا فائدہ اٹھایا اور گاؤں کا سب سے بڑا بد معاش بن گیا۔ بد معاش کو عموماً دو چیزوں کا بڑا مان ہوتا ہے ایک بد معاشی کا، دوسرا غیرت مند قرار دے گا۔ شوقے نے بھی اپنی بہنوں پر لیجئے، وہ خود کو دنیا کا سب سے بڑا غیرت مند قرار دے گا۔ شوقے نے بھی اپنی بہنوں پر پابندیاں لگا رکھی تھیں کہ وہ گاؤں کی عام لڑکیوں کی طرح باہر مت جایا کریں۔ بھلا ایسی پابندیاں بھی کبھی نباہ کرتی ہیں۔ ایک دن عبدل پٹواری نے شوقے کے کان میں بات ڈال دی کہ اس کی چھوٹی بہن کو چودھری کے بیٹے نے چوڑیاں لے کر دی ہیں۔ یہ سنتے ہی شوقے کا خون کھول اٹھا، اس رات اس نے تین قتل کئے۔ ایک اپنی بہن کا، دوسرا چودھری کے بیٹے کا اور تیسرا اپنی ماں کے ارمانوں کا۔ چودھری نے تمام سرکاری مشینری کو ہلا کر رکھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شوقے کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔ اب تک وہ پنجاب کی چھ جیلوں کی سیر کر چکا تھا اور ہر جیل میں اپنی دہشت قیدیوں پر بٹھا چکا تھا۔ میری اس سے پہلی ملاقات ہی اس روز ناشتے کی قطار میں ہوئی جب اس نے مجھ سے آگے کھڑا ہونا چاہا۔

”اے! پیچھے جا کر لائن میں لگو.....“ میں نے قدرے تلخی سے کہا۔

شوقے نے چونک کر میری طرف دیکھا، ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں شعلے لہرائے میں ڈر گیا، اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، اس نے اپنا بایاں ہاتھ لہرایا اور ایک زوردار مکہ میری ناک پر پڑا..... مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دیئے درد کی ایک ناقابل

برداشت لہرنے مجھے زمین پر گرا دیا، میں لوٹنیاں لینے لگا، پوری جیل میں میری چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں بے ہوش ہو گیا، البتہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے اتنا ضرور دیکھا کہ قیدیوں کی قطار ٹوٹ چکی ہے اور وہ ہالہ بنائے میرے گرد کھڑے ہیں اور شوتے کودو پولیس والوں نے قابو کر رکھا ہے۔



آنکھ کھلتے ہی درد کی تیز لہرنے پھر میری چیخ نکال دی، میں نے کمرے کی چھت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ میں ہسپتال میں ہوں، میری ناک پر پٹی بندھی تھی اور سر ہانے ایک پولیس والا میری جھکڑی کا ایک سر اپنی پیٹ کی جیب سے نتھی کئے اوگھ رہا تھا۔ میری آواز سن کر وہ چونک اٹھا اور برہمی سے میرے طرف دیکھا گویا نیند میں خلل اندازی پر ناراضگی کا اظہار کر رہا ہو۔

”پپ..... پانی.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”اوئے چپ کر کے لیٹا رہ پانی کا بچہ.....“ وہ دھاڑا..... ابھی تھوڑی دیر بعد ہسپتال کا کھانا آئے گا تو ساتھ پانی بھی ہوگا، تھپڑ ماروں گا اگر دوبارہ پانی مانگا تو.....“

میں نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں اور کھانا آنے کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے ہسپتال والوں نے کھانا مہیا کیا میں نے ایک نظر دیکھا، آلوگو بھی اور ساتھ چاول تھے۔ میں نے جلدی سے پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میرے نگران سپاہی نے جھٹ سے جگ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور غٹا غٹ کر کے پی گیا ایک گھونٹ میں یہ غلیظ کارنامہ سرانجام دینے کے بعد اس نے مکارانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا ”کل سے ڈیوٹی دے رہا ہوں مجھے تم سے زیادہ پیاس لگی تھی“ یہ کہہ کر اس نے وارڈ بوائے کو پانی لانے کا اشارہ کیا اور خود آرام سے میرے کھانے پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

پانی کے آتے ہی میں نے بے صبری سے دو گلاس پینے اور کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اگرچہ درد کی وجہ سے میرے سارے جسم میں نیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن بھوک اپنی جگہ اہمیت جتا رہی تھی اگر میں فوری طور پر کھانا شروع نہ کرتا تو شاید میرے حصے میں ایک لقمہ بھی نہ

آتا۔ میں نے سپاہی کے گھورنے کے باوجود روٹی کا ایک لقمہ توڑا اور سالن سے لگا کر منہ میں ڈال لیا۔۔۔۔۔

اف خدا یا۔۔۔۔۔ لقمہ منہ میں ڈالتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی میرے کان میں پوری قوت سے چیخ رہا ہو۔۔۔۔۔ میرا سارا جسم بری طرح کانپنے لگا۔۔۔۔۔ سامنے بیٹھے سپاہی نے یکدم میری طرف دیکھا پھر اس کے منہ سے بدلی بدلی سی آواز نکلی جو سو فیصد ابا کی تھی وہ افسوس کر رہے تھے۔

”نورے۔۔۔۔۔ یہ تو نے کیا کیا۔۔۔۔۔ آگ پر پکی ہوئی چیز کیوں کھالی۔۔۔۔۔ طلسمہ کے وجود کو حرارت مل گئی ہے۔۔۔۔۔ اس سے بچ۔۔۔۔۔ اب وہ تیرے ساتھ لگ گئی ہے۔۔۔۔۔ اس سے بچ۔۔۔۔۔ اس سے بچ۔۔۔۔۔ اس سے بچ۔۔۔۔۔“

سپاہی کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے اور وارڈ کے مریض حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے، پھر اچانک سپاہی کو ہوش آگیا اور وہ سر جھٹک کر پریشان پریشان نظروں سے ادھر ادھر مٹکنے لگا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟“ اس نے مشکوک نظروں سے مجھے گھورا، پھر میری جھکڑی کے لاک اور اپنی پینٹ کے کندے کو ہاتھ لگا کر چیک کیا اور کھانا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

میرے اندر ایک طوفان برپا تھا، طلسمہ کی آمد کے خوف نے میرے انگ انگ میں سنسنی بھر دی تھی، مجھے یقین تھا کہ طلسمہ کا چہرہ دیکھ کر ہسپتال کے کئی لوگوں کو ہارٹ اٹیک ہو جائیگا۔ اب اس ہسپتال میں کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیسے کروں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں اچھل پڑا۔

”ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ تمہیں انجکشن لگا دوں“ میرے پیچھے کھڑی خوبصورت نرس نے کہا، اور میری جان میں جان آئی۔

میں نے بازو اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے آہستہ سے سوئی میرے بازو میں داخل کی اور

جونہی انجکشن کی دوائی میرے جسم میں داخل ہوئی میرا دماغ الٹ گیا..... زمین و آسمان گھومنے لگے۔ میں نے نرس سے کچھ کہنا اور نرس کو دیکھتے ہی میری فلک شکاف چیخ نکل گئی..... وہ طلسمہ تھی..... ہاں..... وہ طلسمہ تھی۔ اس کے حلق سے ایک زور دار قہقہہ نکلا..... پھر وہ چلائی..... ”مردود..... تیرا کلیجہ نکالنا ہے مجھے..... ایک وقت آئے گا جب تیرے باپ کا انتقام تجھ سے لوں گی..... خون رواں ہو گیا ہے.....“

وارڈ کے دوسرے مریضوں سے شاید طلسمہ کا یہ روپ عیاں نہیں تھا اس لئے وہ صرف میری ہی چیخوں کو سن رہے تھے۔ وارڈ میں کھلبلی مچ گئی۔

طلسمہ نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور اچھل کر میرے ماتھے پر چڑھ گئی۔ اس کی خون آشام انگلیاں میری آنکھوں میں خون پڑکانے لگیں۔ میں وحشیانہ چلا رہا تھا اس کے جسم کے بوجھ سے میں بیڈ پر گر گیا۔ وہ مسلسل چلا رہی تھی۔

”اب تیری آنکھ کے رستے تیرے جسم میں جاؤں گی اور فساد مچا دوں گی..... ہا ہا ہا.....“ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور مجھے محسوس ہوا گویا میری آنکھیں پھٹتی جا رہی ہیں۔ اگلے ہی لمحے میرا وزن یکدم ہلکا ہونا شروع ہو گیا۔ مجھے یاد ہے مجھے اچانک سب کے چہرے بڑے بڑے لگنے شروع ہو گئے تھے۔ سب سے پہلا احساس مجھے جھٹکڑی کے نہ ہونے کا ہوا لیکن مجھے عجیب سا لگ رہا تھا، میرا جسم پتا نہیں کیا ہو گیا تھا ہاتھ عجیب سے لگ رہے تھے۔ اسی لمحے میں نے سپاہی کی چیخ سنی، وہ کہہ رہا تھا۔ ”بھاگ گیا..... غائب ہو گیا..... پکڑو..... دروازے بند کر دو“

اور اسی شور و غل میں ایک آواز مجھے اور سنائی دی۔ یہ غالباً کسی عورت کی آواز تھی جو دوسری عورت سے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”ارے دیکھو تو اتنا بڑا چوہا وارڈ میں کیسے آگیا۔“



یہ آواز سنتے ہی میں خوف سے لرز اٹھا میں نے اپنا جائزہ لیا تو مجھ پر یہ بھیانک راز کھلا کہ میں ایک موٹا تازہ چوہا بن چکا ہوں۔ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا، چوہا بننے کے باوجود میرا

ذہن ابھی تک پہلے والا ہی تھا، میری حرکات و سکنات بالکل چوہوں والی ہو گئی تھیں۔ یکدم مجھے محسوس ہوا کہ میری سونگھنے کی حس بھی بہت تیز ہو گئی ہے۔ اسی لمحے میرے ذہن نے خطرے کا الارم دیا اور میں تیزی سے بھاگتا ہوا وارڈ کے دروازے کی درز سے باہر نکل گیا۔ مجھے دیکھ کر باہر بیٹھی ہوئی مریض عورتوں میں کھلبلی سی مچ گئی، میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا..... جی چاہتا تھا کہ زور زور سے روؤں لیکن آواز جیسے میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ میں نے چیخنا چاہا لیکن معمولی سی سیٹی کے علاوہ کوئی آواز نہ نکلی میرے بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی، لمحوں میں میں سڑک پر تھا، سڑک پر چلنے والی گاڑیاں مجھے ہوائی جہاز لگ رہی تھیں، ہر شخص دیو قامت لگ رہا تھا، میں شاید ہسپتال کی عقبی سمت میں نکل آیا تھا۔

اچانک شوں کی آواز آئی اور ایک دیو ہیکل بس کے ٹائر میرے بالکل قریب سے گزر گئے۔ میرا سانس جیسے رک سا گیا۔ اگر میں تھوڑا سا بھی آگے کو ہوتا تو اتنے بھاری ٹائروں تلے آکر میرا قیمہ بن جانا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میرے لئے فوری تحفظ بہت ضروری ہے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور سڑک کو نسبتاً خالی پا کر بھاگتا ہوا سامنے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ یہ غالباً چینی کا کوئی گودام تھا کیونکہ ہر طرف چینی بکھری ہوئی تھی۔ مجھے اپنے دائیں طرف اپنے سے کئی گنا بڑا سوراخ نظر آیا اور اس میں جھٹ سے اس کے اندر گھس گیا۔

میرا اندازہ صحیح نکلا تھا اندر چینی کی لاتعداد بوریاں موجود تھیں۔ میں نے بوریوں کے اوپر سے چھلانگ لگائی اور کونے والی بوری کے عقب میں جاد بکا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد بھی میری سانس نہیں پھولی تھی۔ میری چوکنی نگاہیں خود بخود ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ خطرے کا احساس مجھے پہلے ہی ہو جایگا۔ تحفظ کا احساس ہوتے ہی میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ طلسمہ نے مجھ سے بہت بھیانک انتقام لیا تھا۔ پتا نہیں اب میں ٹھیک بھی ہو سکوں گا کہ نہیں۔ میرے دوست، میرا گاؤں، میری دنیا، سب مجھ سے چھن گئی تھیں۔ اب میں کبھی اپنی اصلی صورت میں نہیں

آسکتا تھا مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ طبی لحاظ سے چوہے کی طبعی عمر کتنی ہوتی ہے اور اس لحاظ سے میری کتنی زندگی باقی ہے۔ کاش میرے باپ نے کالے علم کے ذریعے طلسمہ کو قابو نہ کیا ہوتا تو آج نہ صرف میرا باپ سلامت ہوتا بلکہ میری ماں اور میں بھی گاؤں میں پرسکون زندگی گزار رہے ہوتے۔ ماں کا خیال آتے ہی میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ایک چوہے کی آنکھیں کیسے نم ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرے تمام احساسات انسانوں والے ہی تھے، صرف جسم تبدیل ہو گیا تھا۔

مجھے انسان سے چوہا بنے غالباً دس منٹ ہو چکے تھے۔ یہ صرف میرا اندازہ تھا، جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے کا احساس دلایا اور میں ایک دم چوہا بن گیا..... کوئی چیز جو میری زندگی کے لئے خطرہ تھی..... میرے بہت قریب آچکی تھی یا آ رہی تھی۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا یقیناً کسی چوکیدار نے مجھے گودام والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور اب وہ مجھے مار کر ہی دم لے گا۔

میں تھر تھر کانپنے لگا۔ روئی کے گالے کی طرح میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، میں واقعی چوہے کی طرح قید ہو گیا تھا، اب چاہتا بھی تو باہر نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ موت کسی بھی طرف سے جھپٹ سکتی تھی۔ میں نے خدا کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ میں دعائیں مانگ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک عجیب سی آواز پڑی جسے سن کر میرے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے خونخوار موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں ایسی ظالم موت مروں۔ مزید تسلی کی خاطر میں نے اپنی پناہ گاہ کی درز سے جھانکا اور کانپ گیا سامنے ایک موٹی تازی خونخوار بلی فرش سے بگھکتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ میں اپنا آپ بچانا چاہتا تھا میں اسے بتایا چاہتا تھا کہ میں ایک چوہا نہیں انسان ہوں جیتا جاگتا انسان..... تم ایک خبیث روح ہو..... خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا طلسمہ.....

”میاؤں.....“ بلی چھلانگ لگا کر میرے سامنے آگئی۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر میری گھگھکی بندھ گئی۔ وہ کچھ دیر لپچائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ اپنے قدم میری طرف بڑھانے لگی..... میں نے اپنے پورے ایمان کی طاقت سے خدا کے حضور رحم کی اپیل کی لیکن بے سود..... بلی بدستور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے خونخوار پنجے پوری طرح کھل چکے تھے میں کسی بھی لمحے اس کے تیز پنجوں اور نوکیلے دانتوں تلے آنے والا تھا۔ آنے والے وقت کی دہشت سے میں نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور..... پھر بلی کے پنجوں کی نوک مجھے اپنے بدن میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی، اس نے مجھے پکڑ لیا تھا۔

اسی لمحے دو باتیں ہوئیں۔ میرے اندر بھونچال سا آیا، یوں لگا جیسے کسی نے پورے جسم میں چھریاں چلا دی ہوں۔ مجھے اپنی آنتیں کلفتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

میں نے سر جھٹکا تو سامنے کا منظر دیکھ کر کچھ سمجھ نہ آیا۔ مجھ سے پانچ گنا بڑی بلی مجھ سے بیس گنا چھوٹی ہو گئی تھی۔ میرا قد دروازے جتنا ہو گیا تھا۔ کسی خیال کے تحت میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی اور خوشی سے میرا انگ انگ جھوم اٹھا۔ میں پھر سے انسان بن گیا تھا۔ میری قامت بڑھتی دیکھ کر شاید بلی بھی گھبرا گئی تھی۔ اس نے اس اچانک آپڑنے والی افتاد سے بچنے کے لئے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور واپس بھاگی۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وقت میری خوشی کا کیا عالم تھا۔ میں بار بار اپنے جسم کو ہاتھ لگا کر چیک کر رہا تھا کہ کہیں کوئی چیز کم تو نہیں۔ لیکن میں ویسے کا ویسا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ، میری ٹانگیں، میرا سر، انگلیاں..... سب سلامت تھیں۔

بے اختیار میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا کہ اس نے مجھے دوبارہ

اشرف المخلوقات کا روپ عطا کر دیا تھا۔ شاید ہم لوگ اسی لئے خدا کے دیئے ہوئے روپ کی قدر نہیں کرتے کہ ابھی ہم اس روپ کے چھن جانے کی مشکلات سے نہیں گزرے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہمیں کسی اور روپے میں ڈھال دیا جائے تو ہم میں سے کوئی روپ بھی زندہ نہ رہ سکے۔ مجھے سلطان بابا کی بات یاد آرہی تھی وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اعضاء عطا کئے ہیں۔ اس سے بہتر ترتیب کبھی بھی کوئی اور نہیں لگا سکتا۔ یعنی ناک، کان، منہ آنکھیں، بازو..... وہ کہتے تھے کہ اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ ان اعضاء کی ترتیب بدل دو یعنی کان کی جگہ بازو یا منہ لگا دو آنکھوں کی جگہ ناک لگا دو تو وہ کبھی بھی اس ترتیب کو موجودہ ترتیب سے بہتر نہیں لگا سکے گا۔ ہم جب بھی کوئی چیز کھانے لگتے ہیں تو پہلے ہاتھوں سے اٹھاتے ہیں، منہ کے قریب لاتے ہیں، ہماری آنکھیں اس چیز کو دیکھتی ہیں، ناک انہیں سونگھتا ہے، زبان ذائقہ دیتی ہے اور پھر وہ ہمارے جسم کا حصہ بنتی ہے۔

مجھے جمر جھری سی آگئی۔ سلطان بابا کی باتیں میرے دل و دماغ پر حاوی ہو رہی تھیں۔ میں نے وہیں بوریاں کے اوپر ایک سجدہ شکر ادا کیا اور خلوص دل سے اپنے بہتر مستقبل کے لئے دعا مانگی۔ دعا ختم کر کے میں کمرے سے نکلنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ یہ چینی کا گودام تھا اور ہر طرف چینی کی بوریاں بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اس سوراخ کی طرف دیکھا جس سے میں چوہے کی حالت میں اندر آیا تھا۔ وہ سوراخ تقریباً دو انچ چوڑا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر سوراخ میں سے گزرتے ہوئے میں دوبارہ انسان بن جاتا تو پھر.....

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور میری ساری احتیاطیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ سامنے وہ چوکیدار نما آدمی کھڑے تھے، ایک کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور دوسرا کلین شیو تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر تیزی سے اپنی بند و قیں سیدھی کر لیں۔

”کون ہو تم.....؟“ داڑھی والا غرایا۔

”م..... میں..... میں.....“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا جواب دوں، چوہا بننے والے واقعے پر کون یقین کرتا، میں بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا۔ انہوں نے فوری طور پر آواز دے کر دیگر ملازمین کو اکٹھا کر لیا اور سب مجھے کینہ توڑ نگاہوں سے گھورنے لگے۔ داڑھی والا شاید سب ملازمین کا چیف تھا۔ اس نے محتاط انداز میں قدم اٹھائے میرے قریب آکر رکا، کچھ دیر میرا جائزہ لیتا رہا پھر اچھل کر مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کافی لوگ اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے مجھے پکڑ کر رسیوں سے باندھ دیا۔ میں اس نئی افتاد سے پریشان تھا۔ پتا نہیں اب میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔

”ہم تو کافی دنوں سے تمہاری تلاش میں تھے“ داڑھی والے نے دانت پیس کر کہا، پھر ایک ملازم کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”سیٹھ کو فون کرو کہ چور پکڑا گیا ہے“

”میں چور نہیں ہوں.....“ میں نے بے اختیار کہا۔

”بکو اس بند کرو“ اس نے میرے پیٹ میں بندوق کی نال چبھوئی اور ساتھ والے ملازم کو اشارہ کیا، وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں بری طرح پھنس گیا تھا، مجھے پتا تھا کہ میں کبھی بھی اپنی صفائی نہیں پیش کر سکوں گا، میری بات پر کون یقین کرے گا اور اگر بالفرض کسی نے یقین کر بھی لیا تو پہلا سوال یہی کرے گا کہ تم پولیس کی قید سے فرار کیوں ہوئے؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ میرا خاندان کھانے والی چڑیل طلسمہ اپنی پوری خباثت کے ساتھ سامنے آچکی تھی۔ اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح سے تبت کی پہاڑی پر جا کر اس کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دوں لیکن مجھے بالکل بھی علم نہ تھا کہ اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ ویسے بھی تبت جانا تو دور کی بات تھی، نی الحال تو مجھے اس چینی کے گودام سے باہر جانا بھی ناممکن نظر آ رہا تھا کیونکہ سب کے تیور یوں بگڑے ہوئے تھے جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ ان کی نظروں میں نفرت کم اور دلچسپی زیادہ تھی۔

میرا تجربہ ہے کہ غریب کی مصیبت پر سب سے زیادہ غریب ہی انجوائے کرتا ہے۔ وہ سب اس وقت مجھے انجوائے کر رہے تھے اور میں 'بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ فون کرنے والا تھوڑی ہی دیر میں واپس آگیا اور یہ مژدہ سنایا کہ سیٹھ صاحب فوری طور پر آرہے ہیں۔ میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا، اب جو کچھ بھی کرنا تھا خدا نے کرنا تھا۔ ظالموں نے مجھے بیٹھنے تک کا بھی نہ کہا بلکہ سیٹھ کے آنے تک اسی طرح اٹھیں شن کھڑے رکھا۔

سیٹھ کی گاڑی فیکٹری کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اس کی آواز سے ہی مجھے ہول آگیا۔ تھوڑی دیر میں ہانپتا ہوا سیٹھ میرے سامنے تھا۔ یہ سیٹھ لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں، صبح کے وقت دو دو میل جا گنگ کرتے نہیں تھکتے اور تھکنے پہ آئیں تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ان کی سانس پھول جاتی ہے۔ میرے والا سیٹھ بھی غالباً ایسا ہی تھا یا شاید غصے کی وجہ سے اس کی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چیل کی طرح میری طرف لپکا اور اپنے بھاری ہاتھوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے چھ سات مسلسل تھپڑ جڑ دیئے۔

”الو کے پٹھے..... کینے..... تو سمجھتا تھا کہ بچ جائے گا، ارے اپن تم کو خلاص کر دے گا..... تم سمجھتا تھا کہ ام کو تمہاری خبر نہیں..... کینے..... بتاؤ شمشاد نے تم کو اس کام کے لئے کتنے پیسے دیئے؟“

میرے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ یہ شمشاد کون ہے، میں ہونقوں کی طرح سیٹھ کا منہ تکتے لگا۔

”ارے بولتا کیوں نہیں مردود..... بول ورنہ گولی مار دے گا“ سیٹھ نے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا اور میرے پسینے چھوٹ گئے۔

”س..... سیٹھ صاحب..... لگ..... گولی مت چلائیے گا..... میں چور نہیں ہوں“

”ہمارے کو معلوم ہے کہ تم چور نہیں، ڈاکو ہے، قاتل ہے“ سیٹھ نے دواور اہم خطابات عطا کئے اور میری رہی سہی جان بھی نکل گئی۔

”بولو..... شمشاد نے ام کو ختم کرنے کے لئے تم کو کتنے پیسے دیا؟“

”سیٹھ صاحب! میں اتفاقاً یہاں پھنس گیا ہوں، مجھے نہیں پتا کہ شمشاد کون ہے“
 ”ٹھیک ہے.....“ سیٹھ نے گردن ہلائی۔ ”تم ایسے نہیں مانے گا۔ اس کو تہہ خانے میں بند کر دو“ اس نے اطمینان سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں چیخنے ہی لگا تھا کہ ایک ملازم نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور باقی ملازمین نے مجھے کاندھوں پر اٹھالیا۔ میں کسی بھی قسم کی حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ وہ مجھے مختلف کمروں سے گزارتے ہوئے سیٹھ کے دفتر میں لے آئے۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کر اس کی میز کے ساتھ لگے بٹن کو دبایا اور سامنے والی دیوار ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ کھل گئی، نیچے سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ میں مچلنے لگا، میری شدید خواہش تھی کہ میں انہیں روپیٹ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں، شاید میری آہ پکار سے وہ موم ہو جاتے لیکن نہیں..... وہ بھی شاید پتھر کے بنے ہوئے تھے، میری کسی قسم کی حرکت کا نوٹس لئے بغیر انہوں نے مجھے لا کر تہہ خانے کے ننگے فرش پر پٹخ دیا۔ ایک تو میں پہلے ہی حوالات والے فیقے کے مکے کی وجہ سے تکلیف میں تھا، رہی سہی کسر اس پٹخنی نے پوری کر دی، میری دروناک چیخ سے پورا تہہ خانہ گونج اٹھا۔ خالی بوری کی طرح مجھے فرش پر پھینکنے کے بعد انہوں نے ہاتھ جھاڑے اور فاتحانہ انداز میں واپس چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور تہہ خانے کا دروازہ بند ہو گیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا، ہاتھ کو ہاتھ مسجھائی نہیں دے رہا تھا، میں ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا اور آنے والے حالات پر غور کرنے لگا۔ اب تک کی صورت حال کے مطابق یہ بات سامنے آئی تھی کہ سیٹھ کو کوئی شمشاد نامی دشمن قتل کرنا چاہتا ہے اور سیٹھ مجھے شمشاد کا بندہ سمجھ رہا ہے، میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ میں کیسے سیٹھ کو اس غلط فہمی سے نکال سکتا ہوں۔ بہترین طریقہ تو یہی تھا کہ میں صاف صاف اقرار کر لیتا کہ میں صرف اور صرف چینی کی بوری چوری کرنے کے لئے گودام میں گھسا تھا۔ لیکن یہ دلیل اتنی بھونڈی اور پھپھسی تھی کہ میرا دل اسے نہ مان رہا تھا، بھلا ایک اکیلا آدمی اتنی بڑی چینی کی بوری کیسے چوری کر سکتا ہے۔

چوری ہی کرنی ہے تو چینی کی بوری ہی کیوں، ٹی وی، وی سی آر یا زیورات کیوں نہیں؟ اسی لمحے مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا اور پوری توجہ آواز کی طرف لگا دی۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ کوئی تھا جو کچھ کہہ رہا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے کسی کی ہلکی سی سرگوشی سنائی دی..... ادھر آ جاؤ میں تمہیں باہر نکلنے کا راستہ بتاتا ہوں۔

میں سمجھ گیا کہ تہہ خانے میں میرے علاوہ بھی کوئی قید ہے۔ میں نے قدم بجا کر اندازے سے اندھیرے میں آواز کی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ تہہ خانے کا دروازہ بند ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اس لئے اب میری آنکھیں اندھیرے سے کافی مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ بائیں طرف تھوڑا سا چلنے پر وہی سرگوشی مجھے دوبارہ سنائی دی۔ ”تمہارے دائیں ہاتھ پر ماچس اور لائٹن پڑی ہے..... جلاؤ“

یہ سن کر میری خوشی میں اضافہ ہو گیا کیونکہ فی الحال سب سے بڑا مسئلہ روشنی کا تھا۔ میں نے آواز کی ہدایت کے مطابق زمین پر بیٹھ کر دائیں سمت ادھر ادھر ہاتھ مارا اور واقعی میرے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سی لائٹن اور ماچس آ گئی۔ میں نے لائٹن جلانے سے پہلے اسے تھوڑا سا ہلایا۔ خاصا تیل موجود تھا۔ میں نے لائٹن فرش پر رکھی اور ماچس جلائی، ایک شعلہ سا جلا اور تہہ خانے میں بیماری روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا کہ لائٹن کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا مجبوراً اسی طرح اس کی بتی کو آگ دکھائی۔ لائٹن فوراً جل اٹھی۔ لائٹن کے جلتے ہی میں نے بے تابی سے پیچھے مڑ کر دیکھا..... اور پتھر کا ہو گیا۔

میری چیخ میرے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ میرا سارا بدن سن ہو گیا..... میرے سامنے ایک ہولناک منظر تھا۔ مختار چاچا کفن میں ملبوس زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی گردن تن سے جدا تھی اور ان کی گود میں رکھی ہوئی تھی، کئی ہوئی گردن مسکرا رہی تھی، وہ بار بار اپنا دایاں ہاتھ اپنے کٹے ہوئے سر پر پھیر رہے تھے۔

میرے پاؤں من من کے ہو گئے۔ پورا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ ایک کر بناک چیخ میرے منہ

سے نکلی اور میں دیوانہ وار سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

”بچاؤ..... بچاؤ..... خدا کے لئے دروازہ کھولو..... وہ مجھے مار دے گی، وہ چڑیل ہے..... خونی ہے..... خدا کے لئے مجھے باہر نکالو“

چاچا مختار کی لاش نے آہستہ سے حرکت کی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی، چاچا کی گردن ان کے ہاتھ ہی میں تھی..... وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔

میری چیخوں میں شدت آگئی۔ ”سیٹھ صاحب..... سیٹھ صاحب خدا کے لئے دروازہ کھولئے..... آپ کو اللہ کا واسطہ..... سیٹھ صاحب وہ مجھے مار دے گی.....“ میں دیوار سے ٹکریں مارنے لگا۔

چاچا مختار کی لاش بدستور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ ان کے کٹے ہوئے سر سے گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔ تھوڑی دیر میں لاش مجھ تک پہنچنے والی تھی۔ شدید خوف کے باعث میں بھول گیا تھا کہ اگر لاش سیڑھیوں پر چڑھ آئی تو مجھے اپنے بچاؤ کے لئے کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ میں نے دیوار کو زور زور سے پیر مارنے شروع کر دیئے۔ میں باقاعدہ رو رہا تھا۔

”مجھے بچاؤ..... اللہ رسول کے واسطے مجھے بچالو..... وہ آگئی ہے..... آگئی ہے“

اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ لاش نے سیڑھیوں کی طرف آکر ایک نظر میری طرف دیکھا، پھر ایک ایک سیڑھی اوپر چڑھنے لگی۔ میرے اور لاش کے درمیان پندرہ سیڑھیوں کا فاصلہ تھا جو دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری آہ وزاری سن کر کوئی نہ کوئی ملازم ضرور تہہ خانے کی طرف آئے گا، اس وقت مجھے اپنی رہائی سے زیادہ اس لاش کا خوف تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی بندہ دروازہ کھولے تاکہ اس لاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور مجھے بچالے۔ آخری دم تک مجھے یہی امید رہی کہ ابھی دروازہ کھل جائے گا لیکن..... کچھ بھی نہ ہوا۔ مجھے یاد ہے جب میں نے آخری مرتبہ پلٹ کر دیکھا تو لاش کے لمبے لمبے ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سیٹھ کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اسے ٹھکانے لگانا چاہتی ہے، لیکن وہ بھی کانیاں سیٹھ تھا۔ ساری مارکیٹ اسے سیٹھ چینی والا کے نام سے جانتی تھی اس کی نوجوان بیوی اگرچہ اس سے ہر وقت بیٹھے لہجے میں بات کرتی لیکن وہ بھی سیٹھ چینی والا تھا۔ اصلی اور نقلی مٹھاس کا فرق خوب جانتا تھا۔ یہ شادی اس نے صرف اس لئے کی تھی کہ پہلی بیوی کی وفات کے بعد وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ ویسے بھی عزیز واقارب نے مشورہ دیا تھا کہ اگر بیٹی جوان ہو اور بیوی فوت ہو جائے تو فوری طور پر دوسری شادی کر لینی چاہئے۔ سیٹھ چینی والے کو رشتوں کی کمی نہ تھی اس عمر میں بھی اسے کئی رشتے دستیاب تھے کیونکہ اس کی دولت کے بے حساب ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں تھا۔ رشتہ داروں نے بہت کوشش کی کہ کسی طریقے سے سیٹھ کو پھانس لیں لیکن کسی کی بھی دال نہ گل سکی۔

نبیلہ سے سیٹھ کی ملاقات ایک میوزیکل پارٹی میں ہوئی تھی۔ نبیلہ ایک گلوکارہ تھی اور کبھی کبھار ٹی وی بھی نظر آ جاتی تھی۔ تعلق اس گھرانے سے تھا جہاں شناختی کارڈ میں ولدیت کا

خانہ نہیں ہوتا۔ اس کی تربیت میں اس جیسے سیٹھوں کو قابو کرنے کے ہزاروں گر شامل تھے لہذا سیٹھ بھی اس کے دائرے میں آگیا۔

نبیلہ نے پہلا وار یہ کیا کہ نہایت چالاکی سے سیٹھ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس سے شادی کر لے، بہانہ یہ بنایا کہ وہ یہ گناہ آلود زندگی چھوڑنا چاہتی ہے۔ سیٹھ چونکہ دولت مند تھا اور سیانے کہتے ہیں کہ لمبے اور دولت مند کی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے لہذا بڑے آرام سے راضی ہو گیا، یوں ایک شام مولوی صاحب کی موجودگی میں نکاح کی ایک سادہ سی تقریب ہوئی اور نبیلہ سیٹھ کی بیوی بن گئی۔

نبیلہ سے شادی کے بعد سیٹھ کو ایک نہیں دو وجود گھر میں لانا پڑے۔ ایک نبیلہ کا دوسرا اس کے بھائی کا۔ نبیلہ اپنے بھائی شمشاد پر جان دیتی تھی، اس کا کہنا تھا کہ وہ بے چارہ دنیا میں اکیلا ہے اس لئے اسے تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس نے سیٹھ کو یقین دلایا تھا کہ ایک دو سال کے اندر اندر وہ شمشاد کی شادی کر دے گی اور وہ علیحدہ گھر لے لے گا۔

سیٹھ کو پہلے ہی روز شمشاد اچھا نہیں لگا تھا۔ ویسے بھی سیٹھ کی اپنی بیٹی ماریہ جو ان تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر میں اس طرح کسی نوجوان کا آنا جانا ہے۔ شمشاد کے لچھن اس سے ڈھکے چھپے نہیں تھے تاہم نئی نوپلی دلہن کے ناز تو اٹھانا ہی پڑتے ہیں لہذا اس نے بھی یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا۔ یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی اسے احساس ہونا شروع ہو گیا کہ شمشاد کا اس گھر میں رہنا ٹھیک نہیں، سیٹھ کی کوٹھی بہت بڑی تھی اور شہر کے فیشن ایبل علاقے میں تھی۔ ایک دن ہمت کر کے اس نے نبیلہ سے کہا۔

”شمشاد کو علیحدہ رہنے کے لئے کہہ دو میں اسے کرائے پر فلیٹ لے دیتا ہوں“ سیٹھ کا جملہ سنتے ہی نبیلہ نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔

”ہائے ہائے..... میرے بھائی نے آپ کو کون سا دکھ دیا ہے جو آپ اسے مجھ سے جدا کر رہے ہیں، وہ تو بے چارہ ہر وقت آپ کی تعریفیں ہی کرتا رہتا ہے۔ ہائے ہائے..... سیٹھ صاحب! بچارہ یتیم کہاں دھکے کھاتا پھرے گا“

”ارے اپن! اسے کالے پانی تو نہیں بھیج رہا..... رہے گا تو اسی شہر میں ناں“
 ”اسی شہر میں رہنا ہے تو میرے پاس کیوں نہ رہے، ہمارے گھر میں کمروں کی کمی ہے کیا؟“
 ”دیکھ نبیلہ! بات کمروں کی نہیں..... اپن نہیں چاہتا کہ ماریہ کی موجودگی میں کوئی اپن کے
 گھر میں آئے جائے“

نبیلہ کھٹکی۔ ”شمشاد کوئی غیر تو نہیں، میرا بھائی ہے“
 ”لیکن اپن کو پتا چلا ہے کہ اس کے دوست دوست بھی آتے رہتے ہیں اور وہ کوئی اچھے بندے
 نہیں“

”سیٹھ صاحب! آپ غلط سمجھ ہیں، وہ بیچارہ تو بہت شریف ہے، اصل میں وہ آجکل نوکری
 تلاش کر رہا ہے ناں، اسی سلسلے میں لوگوں سے ملاقات رکھتا ہے، لیکن اس کے ملنے والے تو
 سارے شریف ہیں“

”ام کچھ نہیں جانتا..... شمشاد کو بول دو اگر اس گھر میں رہنا ہے تو آئندہ اپن کو اس کا کوئی
 دوست یہاں نظر نہ آئے“

نبیلہ سمجھ گئی کہ بڑھے کا دماغ درست کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس نے اسی رات بھائی سے
 مشورہ کیا اور مشترکہ پلان بنایا کہ سیٹھ کو قبل از وقت موت کی نیند سلا دیا جائے لیکن اس کے
 لئے بڑی جاندار منصوبہ بندی کی ضرورت تھی ذرا سی غلطی خود ان کے لئے بہت بڑے
 نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔

سیٹھ کے دل میں بال آگیا تھا اس نے گھر کے ہر ملازم کو خصوصی طور پر کہہ دیا کہ وہ شمشاد پر
 کڑی نظر رکھیں۔ عشق، مشک اور قتل کا پلان، چھپائے نہیں چھپتے۔ سیٹھ کی چھٹی حس نے
 اسے خطرے کا احساس دلادیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اسے اپنے سے زیادہ اپنی بیٹی
 ماریہ کی فکر تھی۔

”ماریا! تم سیر کے لئے لندن کیوں نہیں جلا جاتا؟“

ماریا نے منہ بنایا۔ ”ڈیڈی مجھے آپ سے دور نہیں جانا..... میں بور ہو جاتی ہوں“

لیکن بابا ہم یہ کب کہتا ہے کہ تم ساری زندگی ادھر ہی رہو..... تھوڑا سا سیر ویر تو کرو ناں..... سیٹھ نے اسے قائل کرنا چاہا۔

”ٹھیک ہے میں چلنے کے لئے تیار ہوں لیکن آپ کو بھی ساتھ جانا ہوگا“

”نہیں..... نہیں..... اپن کام چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے؟“ سیٹھ گڑبڑا گیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے..... مجھے اکیلے اتنی دور جا کر سیر کرنے کا کوئی شوق نہیں اور ویسے بھی اگلے ماہ سے میرے سہ ماہی ٹیسٹ شروع ہو رہے ہیں، ابھی بہت سی کتابیں پڑھنا ہیں“ ماریہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

سیٹھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے اپنی اور ماریہ کی زندگی مسلسل خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔ ادھر نبیلہ اسی کوشش میں تھی کہ کسی طرح شمشاد کو پیٹھ کی فیکٹری میں کام دلادے۔ شروع شروع میں تو سیٹھ نے انکار کیا، لیکن پھر ایک دن سوچا کہ اس طرح کم از کم شمشاد اس کی نظر میں تو رہے گا، یہ خیال آتے ہی اس نے نبیلہ سے کہا کہ وہ شمشاد کو فیکٹری بھیج دیا کرے۔ نبیلہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اب سیٹھ کو زندگی سے آزاد کرنے کا مزید بہتر حل نکالا جاسکتا تھا۔ اس نے شمشاد کو یہ خوشخبری سنائی اور شمشاد نے اگلے ہی روز فیکٹری جانا شروع کر دیا۔ اس کی بھرپور کوشش تھی کہ وہ کم سے کم وقت میں فیکٹری کے ملازمین پر کنٹرول حاصل کر لے، لیکن اسے دال گلتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ سیٹھ نے فیکٹری پر براؤز بردست کنٹرول کر رکھا تھا اور ملازمین صرف اسی کی بات ہی مانتے تھے لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ ”بت شکن ملے گئے کعبے کو صنم خانے سے“

شمشاد کو بھی فیکٹری میں اپنے مطلب کا ایک بندہ مل گیا۔ یامین اسی کی طرح آوارہ مزاج تھا، فیکٹری میں شاک انچارج تھا۔ اگرچہ شمشاد کا فیکٹری میں کوئی عہدہ نہیں تھا لیکن سب ملازمین جانتے تھے کہ وہ سیٹھ کی بیوی کا بھائی ہے۔ اس ناطے اس کا بلا روک ٹوک فیکٹری کے ہر حصے میں آنا جانا تھا۔ شمشاد نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ یامین اس کی موجودگی میں بڑا محتاط ہو جاتا ہے اور کچھ چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ شمشاد کا نیاں آدمی تھا، تھوڑی سی کوشش سے

پتا چلا لیا کہ شاک سے چینی کی دس بارہ بوریاں روزانہ غائب ہو جاتی ہیں۔ اسے یہ تو پتا نہ چل سکا کہ یہ بوریاں کدھر جاتی ہیں تاہم یامین کی اصلیت کھل کر سامنے آگئی۔ اس نے اسی روز دوپہر کے وقت یامین سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے کمرے میں آگیا شمشاد کو کمرے میں آتا دیکھ کر یامین نے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آئیے شمشاد صاحب! تشریف رکھئے“

”یامین صاحب ایک بات تو بتائیے“ شمشاد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

یامین اس کے انداز سے ہی سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے، پھر بھی سنبھل کر بولا..... ”جی حکم کیجئے“

شمشاد نے ایک گہرا کش لگایا اور دھواں یامین کے منہ پر چھوتے ہوئے آگے کو جھکا ”اس ماہ چالیس بوریاں غائب ہوئی ہیں.....“ اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

یامین کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا..... وہ ساری بات سمجھ گیا تھا لیکن جان بوجھ کر انجان بنا رہا۔

”میں سمجھا نہیں شمشاد صاحب آپ کون سی بوریوں کی بات کر رہے ہیں“

شمشاد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری، اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور انگلی میں چابی کا چھلہ گھماتے ہوئے کن اکھیوں سے یامین کی طرف دیکھا۔

”یامین صاحب آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کن بوریوں کی بات کر رہا ہوں، ایک ماہ میں چالیس بوریوں کے غائب ہونے کا مطلب ہے لاکھوں کا نقصان..... اور میں سیٹھ صاحب کو نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا“

”شمشاد صاحب..... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہاں کوئی بوری غائب نہیں ہو رہی، میرے پاس سارا شاک موجود ہے“ یامین نے تیزی سے کہا۔

”شاک میں یقیناً بوریاں موجود ہوں گی لیکن گودام کی صورت حال مختلف ہے اور آپ کو پتا ہے کہ سیٹھ صاحب اس معاملے میں کتنے سخت آدمی ہیں، وہ اتنے بڑے فراڈ کو آسانی سے ہضم

نہیں کرینگے“

یامین کے ہاتھ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرات نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب نہ صرف اس کی نوکری خطرے میں ہے بلکہ باقاعدہ پولیس کیس بھی بن سکتا ہے۔ تاہم آخری کوشش کے طور پر اس نے بات سنبھالنے کے لئے کہا ”شمشاد صاحب! اگر کوئی ایسی بات ہوئی بھی ہے تو میں اس سے لاعلم ہوں، اس کا سارا ذمہ دار چوکیدار ہے“

”چوکیدار..... شمشاد ہنسا.....“ آپ کے ہاتھ کا گیٹ پاس بنا ہو تو چوکیدار کیسے بوریاں باہر جانے سے روک سکتا ہے“

یامین نے ڈھیلے ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ..... آپ کیا چاہتے ہیں“
 ”یہ ہوئی ناں بات.....“ شمشاد نے خوشدلی سے کہا۔ ”بلاوجہ ہم نے اتنا وقت بحث میں ضائع کیا..... میں آپ کا دشمن نہیں ہوں، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ ساتھ میری بھی کچھ نہ کچھ دال روٹی چلتی رہنی چاہئے“

یامین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بگڑتی ہوئی بات بنتی نظر آرہی تھی۔ اس روز دونوں نے ایک طویل پلاننگ کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیٹ پاس پر بوریوں کی تعداد مزید بڑھ گئی۔ شمشاد اور یامین کے مراسم بڑھے تو کئی نجی باتیں بھی زیر بحث آنے لگیں۔ شمشاد کو یقین تھا کہ سیٹھ کو ٹھکانے لگانے کے لئے یامین سے اچھا مہرہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سیٹھ کے ایک خاص ملازم نے دونوں کی گفتگو سن لی اور ساری بات سیٹھ کو بتا دی۔ سیٹھ کو تو گویا آگ سی لگ گئی۔ اس نے فوری طور پر یامین کو فیکٹری سے نکال دیا اور شمشاد کی بھی چھٹی کرا دی۔

نبیلہ کو ساری بات کا پتہ چلا تو اس نے مدعا یامین پر ڈالنے کی کوشش کی لیکن سیٹھ گرجا۔
 ”خبردار اگر شمشاد کے بارے میں اپن سے کوئی بات کی..... اب اگر وہ ہماری کوٹھی میں نظر آیا تو ہم اس کو شوٹ کر دے گا..... بے غیرت.....!“

شمشاد نے سیٹھ کے گھر آنا چھوڑ دیا لیکن نبیلہ سے اس کا رابطہ نہ ختم ہوا۔ دونوں شدت سے

اس بات کے انتظار میں تھے کہ کسی طرح سے سیٹھ کو ختم کر دیں..... بے یقینی حد سے بڑھی تو شمشاد نے براہ راست ایکشن کا فیصلہ کیا اور ایک روز تین چار غنڈوں کے ساتھ منہ پر کپڑا باندھے سیٹھ کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سیٹھ کی موت کو خود کشی کا رنگ دیا جائے تاکہ نبیلہ پر بھی شک نہ جائے اور انشورنس کی رقم سے بھی استفادہ کیا جاسکے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، سیٹھ اس وقت باتھ روم میں تھا جب اندھیرے میں چار غنڈوں نے اس کے بیڈ پر دھاوا بولا۔ نبیلہ اس روز پلاننگ کے مطابق ماریہ کے کمرے میں تھی۔ عین اس وقت جب غنڈے بیڈ پر جھپٹے، سیٹھ باتھ روم سے نکلا، کمرے پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھرے، دوسرے ہی لمحے وہ سب کچھ سمجھ کر تیزی سے واپس باتھ روم میں گھس گیا اور چیخ و پکار شروع کر دی۔ شمشاد اور اس کے ساتھی اس اچانک آپڑنے والی افتاد سے گھبرائے۔ انہیں اور تو کچھ نہ سوچا، بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی اور آٹا فانا دیوار پھلانگ کر فرار ہو گئے۔

کوٹھی کے سارے ملازمین اکٹھے ہو گئے تھے، سیٹھ نے فوری طور پر پولیس کو فون کیا۔ نبیلہ منتیں کرتی رہ گئی لیکن سیٹھ نے واضح طور پر اپنا شک شمشاد پر ظاہر کر دیا۔ پولیس کی ایف آئی آر میں شمشاد کا نام آچکا تھا۔ اب سیٹھ اور شمشاد کے دشمن تھے۔ یہی وہ حالات تھے جن کے درمیان میں چینی کے گودام سے برآمد ہوا تھا۔ سیٹھ چینی والا کو مکمل یقین تھا کہ مجھے شمشاد نے بھیجا ہے۔

جس وقت میری آنکھ کھلی، کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ میں نے اپنا ذہن پیچھے کی طرف دوڑایا، آخری منظر یاد آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے یاد آیا کہ لاش میرے قریب ہے یہ خیال آتے ہی دہشت کی ایک لہر میرے اندر دوڑی اور ایک چیخ میرے حلق سے نکل گئی۔

اسی لمحے میں دوبارہ چلا اٹھا۔ میری دوسری چیخ پہلی سے بھی زیادہ کرہناک تھی کیونکہ یوں لگا جیسے کسی نے میرے سر میں ہتھوڑا مارا ہے۔ تکلیف کی شدت سے میں نے آنکھیں میچ لیں اور جب دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوا تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ میرے سامنے تین چار پولیس والے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے جبکہ دور کونے میں سیٹھ چینی والا اطمینان سے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک تہہ خانے سے لاش مجھے یہاں کہاں لے آئی ہے، مجھے کیسے بچایا گیا، میں اس سے لاعلم تھا۔ اچانک سامنے بیٹھے پولیس والے نے میرے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور ایک جھٹکا دیا۔ درد کی شدت سے میری پھر چیخ نکل گئی۔

”تو سمجھتا تھا کہ بچ جائے گا..... اب دیکھ تیرے ساتھ کیا حشر ہوتا ہے..... فرار کا کیس بھی بنے گا اور قتل کا بھی“

سیٹھ کے لئے یہ ساری صورت حال خاصی طمانیت بخش تھی، وہ جو کچھ سمجھا تھا وہ خود بخود صحیح ثابت ہو رہا تھا، ساری کہانی کلیئر تھی۔

سیٹھ کا کہنا تھا کہ شمشاد نے مجھے اس لئے ہسپتال سے فرار کر لیا تاکہ میں اس کی جان لے سکوں۔ میں سیٹھ کی بات سے اس لئے بھی اختلاف کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ فی الحال مجھ میں بولنے اور سننے کی سکت نہیں تھی۔ کمرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ وہی تہہ خانے والا کمرہ ہے۔ میں ڈر گیا۔ کہیں مجھے دوبارہ تہہ خانے میں نہ ڈال دیا جائے۔ ابھی میں اس سلسلے میں کچھ کہانی چاہتا تھا کہ تھانے دار نے سپاہیوں سے کہا۔

”اس مرد کو گاڑی میں ڈالو اور تھانے لے چلو..... آج اس کو بتاتے ہیں کہ پولیس کی قید سے بھاگنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے“

میں نے رحم طلب نظروں سے سیٹھ کی طرف دیکھا لیکن اس کی نگاہوں میں سوائے نفرت کے اور کچھ نہ تھا۔

تھانے میں لاتے ہی انہوں نے مجھے مارنے پینے کی بجائے حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس والوں کا ایک بڑا اچھا اصول ہے، مار کٹائی والا کام یہ ہمیشہ رات کو بارہ بجے کے بعد کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اس وقت کسی طرف سے مدد کا امکان نہیں ہوتا اور ویسے بھی اگر ملزم کو پتہ ہو کہ بارہ بجے کے بعد اس کی ٹھکانی ہوئی ہے تو وہ بے چارہ سارا دن ایک لمحے کے لئے بھی سکون کی سانس نہیں لے سکتا۔ مجھے بھی ہر آتا جاتا سپاہی یہ باور کر رہا تھا کہ عنقریب چھت کا پنکھا اور میں ایک ہونے والے ہیں۔ آنے والے وقت نے مجھے ڈر دیا تھا۔ میری جسمانی حالت پہلے ہی بہت خراب تھی، دل و دماغ میں طوفان چل رہے تھے۔ میرے ساتھ حوالات میں اور بھی قیدی بند تھے مجھے پتا تھا کہ اب مجھ پر ایک نہیں کئی اور بھی مقدمات بنیں گے۔ جیل سے میرے فرار کے دوران ہونے والی تمام وارداتیں مجھ ہی پر ڈالی جائیں گی ابھی

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سپاہی حوالات کے پاس آیا اور نگران سے کہنے لگا!
 ”نورے کو وڈے صاحب بلارہے ہیں“

نگران نے جلدی سے حوالات کا قفل کھولا اور میری ہتھکڑی کا سر اسپاہی کو تھما دیا وہ مجھے دیگر دو سپاہیوں کی نگرانی میں ایس ایچ او کے کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا پینٹ کوٹ میں ملبوس وہی شخص وہاں موجود تھا جو مجھ سے جیل میں بھی ملنے آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حسب سابق اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایس ایچ او نے ایک تیکھی نظر میری طرف ڈالی، پھر سپاہیوں سے بولا

”کھول دو اسے“ حکم کی تعمیل ہوئی اور میرے ہاتھوں سے سرکاری زیور اتار لیا گیا۔ ہتھکڑی سے آزاد ہوتے ہی میں نے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا، وہاں نشان پڑ گئے تھے۔ ہمارے تھانوں کا ماحول ایسا ہے کہ ہتھکڑی نہ بھی لگی ہوئی ہو، پھر بھی یہی لگتا ہے کہ ہم قید ہیں، آپ کبھی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے تھانے میں ظالم اور مظلوم کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے۔

”لیجئے! سائیں..... آپ کا بندہ آزاد ہے“ تھانیدار نے کوٹ والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، تھانیدار کے لہجے میں خاصا احترام تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوٹ والا یا تو کوئی اونچا افسر ہے یا اس کی بہت پہنچ ہے۔

میرے دل میں آئی کہ اس سے اس مہربانی کا سبب پوچھوں لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ یہاں ایسی بات کرنا شاید مناسب نہ ہو۔ اس نے پتہ نہیں مجھے اپنا کیا ظاہر کر کے رہائی دلائی ہے، کہیں بنی بنائی بات نہ بگڑ جائے ویسے بھی اب تک میری ساری بنی بنائی باتیں بگڑتی ہی آرہی تھیں۔

”بہت شکریہ!“ کوٹ والے نے مختصر اکہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی ایس ایچ او نے تیزی سے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، لیکن پھر نہ جانے کیوں چپ کر گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہا چاہتا تھا لیکن فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نفسیاتی طور پر

رک گیا۔ مجھے رک دیکھ کر اس نے جلدی سے چھڑی کا اشارہ کیا۔

”جاؤ اچلے جاؤ..... میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا“..... وہ بڑبڑایا۔

مجھے سمجھ نہ آئی کہ اس کا کون سا اندازہ ٹھیک نکلا تھا، لیکن اسیری سے رہائی کی خوشی میں اس بات پر دھیان ہی نہ دیا اور میں جلدی سے باہر آگیا۔ تھانے کے گیٹ کے پاس ایک لمبی سی سفید رنگ کی گاڑی میری منتظر تھی جس کی اگلی سیٹ پر وہی کوٹ والا بیٹھا تھا جسے تھانیدار نے سائیں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ سائیں ہی کے نام سے مشہور تھا۔

میں چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا، اور گاڑی شہر کے مختلف راستوں پر دوڑنے لگی۔ تقریباً تیس منٹ کے سفر کے بعد گاڑی ایک ماڈرن علاقے کی بڑی سی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ میں ابھی تک خاموش تھا۔ سائیں کے اترتے ہی میں بھی گاڑی سے اتر آیا۔ سائیں نے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور وہ مجھے ساتھ لئے اندر کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ابھی تک سائیں سے میری کھل کر کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی اس لئے کاردار میرے لئے پر اسریت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ سائیں کون ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلے میرا دھیان کسی خطرناک گروہ کے سربراہ کی طرف گیا میں نے سوچا کہ ممکن ہے سائیں کوئی بہت بڑا سمگلر ہو اور میرے ذریعے کوئی ناجائز کام کروانا چاہتا ہو لیکن پھر سوچا کہ یہ کام تو مجھ سے کہیں بہتر اس کے کارندے کر سکتے تھے اس کے لئے مہرے جیسے بزدل کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ سائیں یقیناً رحم دل بندہ ہے اور کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن یہ خیال جتنی تیزی سے آیا تھا اس سے کہیں زیادہ سرعت سے واپس ہو گیا کیونکہ اگر واقعی ایسا ہوتا تو حوالات میں مجھ سے بھی بری حالت میں قیدی موجود تھے، اس لحاظ سے تو پہلا حق انہی کا بنتا تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو سائیں کا وجود مجھے بری طرح کھٹک رہا تھا، کوئی بات ایسی تھی جو میرے لاشعور میں تو تھی لیکن شعور میں نہیں آرہی تھی۔

ملازم مجھے ساتھ لئے ایک سجے سجائے کمرے میں آگیا اس طرح کے سجے سنورے کمرے تو میں نے چاچا کی کوٹھی میں بھی نہیں دیکھے تھے، یقیناً سائیں کوئی بہت بڑا رئیس تھا۔ مجھے

کمرے میں حیرت زدہ کھڑا دیکھ کر ملازم نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔
”کیا دیکھ رہے ہیں جناب“

اس کے ”جناب“ نے مجھے اور زیادہ بوکھلادیا۔

”کک..... کچھ نہیں..... ماشاء اللہ بڑا اچھا کمرہ ہے“ میں نے جلدی سے کہا۔

”اب آپ آرام کیجئے ساتھ ہی باتھ روم ہے، میں جا رہا ہوں، بیڈ کے ساتھ ہی گھنٹی کا بٹن ہے، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بٹن دبا دیجئے گا“ ملازم نے مجھے حیرت کے نئے سمندر میں دھکیلے ہوئے کہا اور مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر واپس پلٹ گیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ شاید اسی کیفیت میں مجھے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک نے مجھے خیالات کی دلدل سے نکالا۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ملازم کھانے کی ٹرائی دھکیلتا ہوا اندر آ رہا تھا مجھے یاد آیا کہ میں نے تو ناشتہ تک نہیں کیا۔ یہ خیال آتے ہی میری بھوک اور بھی چمک اٹھی۔

ملازم کھانا رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے بڑی بے صبری سے کھانا دیکھا اور عیش عیش کر اٹھا، کھانے میں قورمہ اور پلاؤ تھا سالن والی پلیٹ سے انتہائی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی جو میری روح کو بے چین کئے دے رہی تھی۔ میں نے روٹی کا لقمہ توڑا اور ابھی منہ میں ڈالنے ہی لگا تھا کہ اچانک کمرے کی لائٹ دھیمی ہو گئی اور یوں لگا جیسے کوئی سایہ سا کمرے میں داخل ہوا ہے۔ سائے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

”..... طلسمہ.....“ ہاں وہ طلسمہ تھی..... میں نے ایک جھپٹکے سے لقمہ قالین پر پھینک دیا۔ لقمہ

نیچے گرتے ہی کمرے کی لائٹ دوبارہ تیز ہو گئی اور سایہ تیزی سے غائب ہو گیا۔ میرے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اگر میں لقمہ کھا لیتا تو طلسمہ پھر میرے اندر آنے کے لئے تیار تھی۔ اللہ نے مجھے ہال بال بچا لیا تھا۔ میں کھانے سے یکدم دور ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ کھانا اور روٹیاں آگ پر پکی تھیں اور آگ پر پکی چیز میرے لئے شجر ممنوعہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

کچھ دیر میں سکتے کے عالم میں رہا، پھر اچانک ٹرائی کے نچلے خانے میں رکھے پھلوں پر نظر پڑی اور میرا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اب میں بلا خوف و خطر اپنی بھوک مٹا سکتا تھا۔ میں کیلوں اور امردوں پر پل پڑا اور ذرا سی دیر میں تقریباً سارے پھل چٹ کر گیا۔ پھل کھاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں کوئی انتہائی غصیلے انداز میں اپنے دانت پیس رہا ہے۔ یہ سو فیصد طلسمہ تھی جو اپنی ناکامی پر کڑھ رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں گپ اندھیرا چھا گیا میں بے اختیار گھبرا گیا۔ میرا پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ سردی کی شدید لہر مجھے اپنے ارد گرد محسوس ہوئی، اسی لمحے دیوار پر ٹنگے بارہ سنگھے کے قریب روشنی کی ایک لہر پڑی اور وہ ایک جھٹکے سے میری طرف رخ کر کے انسانی آواز میں بولا.....

”خمیث..... بال بال بچ گیا ہے..... کب تک بچے گا..... تیرا کلیجہ نکالنا ہے مجھے..... قسم شیطان مردود کی..... تیری نکابوئی کر کے کھاؤں گی..... تیرا خون مجھے نئی زندگی دے گا.....“

میں تھر تھر کانپ رہا تھا..... اور بارہ سنگھا مسلسل چلا رہا تھا ”خمیث..... بس اب بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں..... میں تجھے عبرت کا نشان بنا دوں گی..... میں تجھے بتاؤں گی کہ جنات کو چھیڑنے کا انجام کیا ہوتا ہے..... تم لوگ سمجھتے ہو کہ جنات کو قابو میں کر کے امیر بن جاؤ گے، دنیا پر حکمرانی کرو گے..... خمیث..... تیرے باپ نے مرنے میں بہت جلدی کی ورنہ ہم جنات کبھی کسی کو اتنی جلدی مرنے نہیں دیتے..... تڑپا تڑپا کر مارتے ہیں..... سسکا سسکا کر جان نکالتے ہیں.....“

میرے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی اور میں تیوراً کر قالین پر گر پڑا۔

میری چیخ کی آواز سننے ہی کو ٹھہی کے ملازمین میرے کمرے کی طرف دوڑے مجھے فرش پر بے ہوش دیکھ کر انکے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ سمجھ شاید کھانے میں کچھ ملا ہوا تھا۔ مجھے فوری طور پر بیڈ پر لٹایا گیا اور سائیں کو اطلاع دی گئی، میری بے ہوشی کا سننے ہی سائیں یکدم پریشان ہو گیا اور تیزی سے میرے کمرے کی طرف بھاگا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ میری طرف لپکا میرے چہرے کو غور سے دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے باقی ملازمین کو کمرے سے باہر

جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ ہلاتے ہی حکم کی تعمیل ہوئی اور کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔ سائیں کچھ دیر تذبذب کے عالم میں مجھے گھورتا رہا، پھر ساتھ پڑے پانی کے جگ سے تھوڑا سا پانی اپنی ہتھیلی میں ڈالا اور میرے منہ پر چھینٹے مارے۔ مجھے بے ہوش ہوئے تقریباً دس منٹ ہو چکے تھے پانی کے چھینٹے پڑے ہی میں تھوڑا سا کسمسایا اور آنکھیں کھول کر چھت کو تکتے لگا۔ سائیں کا چہرہ میرے بالکل اوپر تھا۔ کچھ دیر مجھے یہ سوچنے میں لگی کہ آخر میرے ساتھ ہوا کیا تھا۔ سارا واقعہ ذہن میں آتے ہی میری حالت پھر غیر ہونا شروع ہو گئی۔ سائیں شاید میری کیفیت کو سمجھ گیا تھا اس لئے دھیرے سے میرا ہاتھ دبا کر بولا۔

”فکر کرنے کی ضرورت نہیں..... میں موجود ہوں“

پتا نہیں اس کے اس جملے میں کیا بات تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہوتے ہوئے طلسمہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ میں نے تشکر آمیز نگاہوں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا جس نے مجھے نہ صرف پولیس کی قید سے نجات دلائی تھی بلکہ اس آرام دہ بستر پر لٹا کر مجھے پرسکون رہنے کی تلقین بھی کر رہا تھا۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔
 ”سائیں! تم کون ہو..... کیوں مجھے پولیس کی قید سے رہائی دلائی..... کیا چاہتے ہو مجھ سے.....؟؟؟“

میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے

جواب میں وہ ہلکا سا مسکرایا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا

”حیرت ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں لیکن تم ابھی تک نہیں پہچانے، غور سے میری طرف دیکھو شاید تمہیں کچھ یاد آجائے“

اس کی اس بات نے مجھے پوری طرح یکسوئی پر مائل کر دیا تھا میں نے پوری توجہ سے اسے دیکھا اور اپنی یادداشت کھنگالنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک بھیانک خیال آیا..... کہیں یہ طلسمہ کا کوئی روپ تو نہیں..... یہ خیال آتے ہی میرے پسینے چھوٹ

گئے..... اس سے پہلے کہ مجھ پر دوبارہ غشی کا دورہ پڑتا..... اس کی آواز گونجی۔

”تم غلط سوچ رہے ہو، میں طلسمہ نہیں ہوں“

میں نے کپکپاتے ہوئے کہا ”اگر تم طلسمہ نہیں ہو تو اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو“

”اس لئے کہ میں نے ہی تمہیں بتایا تھا کہ جو کتا تمہارے ساتھ انسانی آواز میں بات کر رہا ہے وہ طلسمہ ہے“

سائیں نے انکشاف کیا اور ایک سکیئنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن پر پڑے ہوئے سارے پردے ہٹ گئے مجھے وہ جنگلی یاد آگیا جو چاچا مختار کی کوٹھی کے ساتھ والے پارک میں ایک بار مجھے بانسری بجاتے ہوئے ملا تھا، جس نے مجھے طلسمہ کے بارے میں بتایا تھا اور دوبارہ پارک میں آنے کے لئے کہا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا..... ”تم..... تم وہ ہو..... لل..... لیکن وہ تو..... میں اس کا حلیہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا الفاظ میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئے تھے۔

”تم یقیناً حیران ہو رہے ہو کہ اس روز جب میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو میں ایک جنگلی کے حلیے میں تھا اور اب کتنا مختلف نظر آ رہا ہوں..... ہے ناں“

میں نے جلدی سے ہاں میں سر ہلایا..... وہ شاید میرے تاثرات سے ہی میرے خیالات پڑھتا جا رہا تھا۔

”بات یہ ہے“..... اس نے سگریٹ سلگایا..... ”میں ایک امیر شخص ہوں..... دنیا کی کون سی چیز ہے جو میرے پاس نہیں..... لیکن مجھے کالا جادو سیکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے، اس مقصد کے لئے میں نے کون سا چلہ نہیں کاٹا، کون سے عامل کی شاگردی اختیار نہیں کی..... لیکن سب ڈھکوسلے ثابت ہوئے..... پھر بھی، وہ کہتے ہیں ناں کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے..... مجھے بھی ایک ایسا عامل مل گیا جو واقعی کالا جادو جانتا تھا اگرچہ اس کے بتائے ہوئے چلے بہت سخت تھے لیکن میں نے ان پر حرف بحرف عمل کیا اور کالے جادو پر اسی فیصد دسترس حاصل کر لی۔ لیکن شاید تمہیں علم نہ ہو کہ کالے جادو پر سو فیصد دسترس کسی کی

بھی نہیں ہوتی یہ علم افریقہ سے چلا اور اس کا اثر پوری دنیا میں پھیل گیا۔ تم میری بات سن رہے ہو ناں!.....“

میں چونک گیا..... اس کی باتوں کے سحر نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا، مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی..... میں نے جلدی سے اثابت میں سر ہلایا۔

”غور سے سنتے رہنا..... تو ہوا یوں کہ اس روز جب میں تمہیں پارک میں ملا، میرے چلے کا آخری روز تھا اس روز مجھے سر شام برگد کے درخت تلے ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر تین گھنٹے تک بانسری بجانا تھی۔ بانسری ختم ہوئی تو میں تھک کر اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا وہاں میں نے تمہارے کتے کو دیکھا جس میں طلسمہ داخل ہو چکی تھی۔ طلسمہ اسی کتے کے روپ میں میرے پاس آئی۔ میں چونکہ اس قسم کے واقعات چلے کے دوران بار بار دیکھ چکا تھا اس لئے خوف زدہ نہیں ہوا۔ طلسمہ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں تمہیں ختم کر دوں تو وہ مجھے شیطان دیوتا کی وہ پراسرار طاقت بھی بخش دے گی جو آج تک کسی کا مقدر نہیں بن سکی۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ طلسمہ تمہیں خوف زدہ تو کر سکتی ہے مار نہیں سکتی، وہ تمہیں بار بار پریشان کر کے تبت کی طرف جانے سے روکنا چاہتی ہے کیونکہ ٹھیک پانچ سال بعد وہ پھر سے زندہ ہو جائے گی لیکن اگر اس سے پہلے تم نے تبت کی پہاڑی پر جا کر اس کی سر بریدہ لاش کو کالے پانی کا غسل دے دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی سے نابود ہو جائیگی۔ یاد رکھنا جنات کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں یہ لوگ ہزاروں سال کی عمر پاتے ہیں، اس لئے وقت سے پہلے ان کا خاتمہ بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے، ابھی تک تو یہی سنا ہے کہ ان کو مارنے والا خود موت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ویسے بھی طلسمہ کو شیطانی قوتوں کی بھرپور حمایت حاصل ہے، وہ تمہیں کسی بھی صورت تبت کی مدھو پہاڑی تک نہیں پہنچے دے گی.....“

”یہ کالا پانی کیا ہے؟“..... میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کالا پانی وہ پانی ہے جسے پہلی دفعہ تمہارے باپ نے طلسمہ کو زندہ کرنے کے لئے غسل دیا تھا۔ تفصیل کا تو مجھے علم نہیں تاہم طلسمہ تمہیں وہ پانی کبھی بھی حاصل نہیں کرنے دیگی۔ کالا پانی

اس کی موت ہے اور وہ موت نہیں چاہتی“
 ”لیکن تم میرے ساتھ کیوں ہمدردی کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا
 میری بات سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ایک گہرا کش لگا کر بولا
 ”دیکھو نورے! سیدھی سی بات ہے..... میں طلسمہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں“
 ”طلسمہ کو..... اف خدایا..... لیکن کیوں؟“
 ”اس لئے کہ اس کا میرے ہاتھ آنا بہت ضروری ہے“
 ”آخر کیوں؟“

”ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں، بس اتنا سمجھ لو کہ وہ میرے ہاتھ آگئی تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے کالے علم پر سو فیصد دسترس سے محروم نہیں رکھ سکتی۔ پھر دیکھنا میں ساری دنیا بدل کے رکھ دوں گا“

”لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں“ میں خوف زدہ ہو رہا تھا۔
 ”تم..... تم بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہو، دیکھو اس طرح طلسمہ سے تمہاری بھی جان چھوٹ جائیگی اور میرا بھی کام ہو جائیگا۔ کرنا تمہیں یہ ہے کہ نور پور کے قبرستان میں چار دن کا چلہ کاٹنا ہے.....“

”نہیں..... میں چلا اٹھا..... یہ کام مجھ سے کبھی بھی نہیں ہو سکے گا..... میں مر جاؤں گا“
 ”کچھ نہیں ہو گا تمہیں..... اگر یہ کام نہیں کرو گے تو طلسمہ تمہیں مار دے گی، اور طلسمہ کے ہاتھوں بچ گئے تو.....“ اس نے خمیٹ سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔

”دیکھو سائیں!..... خُخ..... خدا کے لئے مجھے ان چکروں میں نہ ڈالو..... پہلے ہی اس منحوس علم نے میرے ماں باپ کی جان لے لی ہے..... خدا کے لئے مجھے جانے دو“

”بکو اس بند کرو“..... وہ گرجا..... تم ابھی مجھ سے واقف نہیں ہو، میں نے تمہیں اپنا آپ دکھا دیا تو خوف سے تمہاری جان نکل جائے گی..... یہ دیکھو..... وہ زیر لب بڑبڑایا اور

پھر..... دیکھتے ہی دیکھتے اس کی گردن چھت جتنی لمبی ہوتی چلی گئی۔

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا، اتنا خوفناک منظر میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا کسی زرافے کی طرح اس کی گردن چھت سے لگی ہوئی تھی اور وہ مسلسل مسکرائے چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں وہ بھی شاید میری کیفیت بھانپ گیا تھا اس لئے ایک سیکنڈ میں دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آگیا۔

”ابھی تم آرام کرو، کل بات ہوگی“..... اس نے کہا اور میرا جواب نے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں دو جناتی طاقتوں کے درمیان پھنس گیا تھا کالے علم کی تباہ کاریاں پوری شدت سے ظاہر ہونے لگی تھیں میرا جی چاہا کہ اس مکروہ عمل کو کرنے والے ہر عامل کا سرتن سے جدا کر دوں، پتا نہیں ہم لوگ ساری خدائی اپنے ہاتھوں میں کیوں لینا چاہتے ہیں حاکمیت کی خواہش نے ہم سے سوچنے سمجھنے کی دیگر تمام صلاحیتیں ضبط کر لی ہیں اختیارات کے جنون نے ہمیں ہر قسم کے احساس سے عاری کر دیا ہے۔ ہم صرف اور صرف اپنی مرضی کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کاش ہم اس کی حاکمیت کو ہی افضل جانیں جس نے کبھی ہمارے رزق میں کمی نہیں آنے دی۔ پتہ نہیں خدا ان شیطانی طاقتوں کو اتنی ڈھیل کیوں دیتا ہے شاید اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ بھی معاشرے پر بہت بڑا احسان ہیں یقیناً ان ہی کے دم سے برائی ایک حد تک محدود ہے کسی نے کہا ہے کہ دنیا میں آنے والا ہر بچہ اس بات کی بشارت ہے کہ خدا ابھی انسانوں کے مایوس نہیں ہوا اسی طرح ہر آنے والی برائی بھی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس کی ٹکڑ پر ایک اچھائی موجود ہے۔ میں خود تو برائی نہیں کر رہا تھا لیکن بالواسطہ طور پر برائی کے ایسے جال میں پھنس گیا تھا کہ اب اس سے نکلنا بہت محال نظر آ رہا تھا۔ اپنے باپ کے کرتوتوں کی سزا مجھے بھگتنا پڑ رہی تھی پتا نہیں میرا باپ کالا علم حاصل کر کے کیا کرنا چاہتا تھا۔ ہماری اچھی بھلی ہنستی مسکراتی زندگی کو یہ منحوس علم چٹ کر گیا تھا تمام رات یہی سوچیں میرے ذہن میں گردش کرتی رہیں اور پھر اسی عالم میں میری آنکھ

لگ گئی۔

صبح شاید کسی ملازم نے میرے سامنے والی کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا تھا روشنی کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی میں نے شاید ایسی صبح پہلی دفعہ دیکھی تھی کہ سامنے لان میں بے شمار درخت لگے ہونے کے باوجود کوئی چیز یا ان پر نہیں بیٹھی تھی صبح کے وقت تو قبرستان کے درختوں پر بھی چڑیوں کے چھپانے کا شور ہوتا ہے، یہ کیسا گھر تھا جہاں معصوم پرندے بھی آنے سے خوف زدہ تھے مجھے عجیب سی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے نہا کر غسل خانے میں موجود کپڑے پہن لئے جو میرے بدن پر پورے آگئے تھے باہر نکلا تو ناشتہ تیار تھا ناشتے پر نظر پڑتے ہی میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دو تلے ہوئے انڈے، ڈبل روٹی، دودھ اور دہی موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا پھر دہی کھانے کو ہی ترجیح دی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ روٹی نہ کھانے کی وجہ سے میرے جسم میں عجیب سی بے چینی پیدا ہو رہی تھی ہم لوگ گندم کے عادی ہیں گندم ہماری خوراک کا اہم جزو ہے، اس کے بغیر میں کیسے رہ سکتا تھا، لیکن احتیاط بھی تو ضروری تھی، وہ خوفناک بلا تو اسی انتظار میں تھی کہ میں کسی طرح سے آگ پر پکی ہوئی چیز کھاؤں اور وہ مجھے کسی ایسے روپ میں ڈھال دے جو میری موت کا باعث بن جائے۔ دہی کا پیالہ پی کر مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی ایسے عالم میں چائے کی شدید طلب ہوئی لیکن بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

میں نہایت سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کتنے دن چلے گا۔ میں کب تک پھل اور دہی کھا کر گزارہ کروں گا، کبھی نہ کبھی تو آگ پر پکی ہوئی چیز کھانا پڑی گی۔ کل سے بیٹھے پھل کھا کھا کر میرا دل نمکین چیز کے لئے مچلنا شروع ہو گیا تھا۔

سائیں کو یقین تھا کہ میں اس کے لئے چلہ کاٹنے پر راضی ہو جاؤں گا اس لئے اس نے نور پور کے قبرستان میں ضروری کارروائیاں شروع کر دی تھیں ایک پرانی قبر کے کنارے منتر پڑھے پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ اس چھڑکاؤ کو تین روز تک مسلسل کرنا ضروری تھا اس لئے سائیں باقاعدگی سے یہاں چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے پیر سے مسلسل رابطہ

رکھا ہوا تھا۔ اس روز بھی جب وہ قبر کے گرد چھڑکاؤ کر رہا تھا اچانک ایک پرانے بڑے درخت کے قریب سے بگولے اٹھنے لگے اور رات کی تاریکی میں آواز گونجی۔
 ”کہو کچھ کام بنائے؟“

”ہاں پیر صاحب..... لگتا ہے کہ کام بن جائے گا لیکن اگر وہ نہ مانا تو؟؟“ سائیں نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

”مانے گا کیسے نہیں؟؟“ پیر صاحب کی آواز میں گرج تھی..... ”کیا شیطان اتنا بے بس ہو چکا ہے کہ ایک معمولی سے لڑکے کو قابو کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے“
 ”ایسی بات نہیں پیر صاحب..... اصل میں وہ بہت خوفزدہ ہے“

”خوفزدہ ہے تو اسے کسی دوسرے روپ میں اطمینان دلاؤ لیکن تم ابھی اس پر کہاں قادر ہوئے.....“

تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جلد سے جلد انسانی غذا چھوڑ کر جنات کی من پسند غذا کھاؤ، یہ غذا کھاؤ گے تو تمہاری ان کے ساتھ دوستی ہوگی اور وہ تمہیں روپ بدلنے کی صلاحیت بخشیں گے۔ لیکن تم اس میں مسلسل دیر کئے جا رہے ہو“

”مجھے پتا ہے پیر صاحب..... لیکن کیا کروں بڑی کراہت آتی ہے یہ چیزیں کھاتے ہوئے..... کیا کوئی اور رستہ نہیں ہے“ سائیں نے بے چارگی سے کہا۔

”اے سائیں!..... شیطان ہر کسی کو اپنا غلام نہیں بنا لیتا۔ تو خوش قسمت ہے کہ تجھے شیطان نے اپنی غلامی کے لئے چنا۔ یاد رکھ ہم کالے علم والے نوری علم کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن نوری علم کا ڈھونگ رچانے والے اکثر لوگ منافق ہیں ان کے ذہن گدلے ہو چکے ہیں، وہ مکار ہیں، ریاکار ہیں..... اسی لئے ان کا نوری علم ہمارے کالے علم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم اگر دنیا پر چھا جانا چاہتے ہو تو ذرا اسی ہمت اور کردار کا لے علم کے جس درجے پر تم فائز ہو وہ قسمت والوں کو ملا کرتا ہے۔ قرآن کی آیتوں میں تبدیلی کر کے جو منتر تم پڑھ چکے ہو وہ تمہیں شیطان کے دربار میں ایک اہم منصب عطا کر چکے ہیں۔ اب اور آگے بڑھو اور غلاظت کی تمام

حدیں پار کر جاؤ..... تمہیں امر ہونا ہے، ہر قیمت پر“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں پیر صاحب..... بالکل ٹھیک کہتے ہیں..... لیکن مجھے بتائیں کہ میں اس لڑکے کو کس طرح راضی کروں..... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ چلہ کاٹتے ہوئے گھبراہٹ کی وجہ سے غلط منتر پڑھ جائے۔ ویسے بھی طلسمہ اور اس کا خاندان اس کو بھگانے کے لئے مختلف حربے اختیار کریگا۔“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ فوری طور پر یہ چلہ کرواؤ اور مجھ سے ملو“

پیر صاحب کی آواز آہستہ آہستہ غائب ہوتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی درخت کے گرد اٹھنے والا غبار بھی بیٹھ گیا۔ قبرستان میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے شدید سردی کا عالم تھا فضا کھر میں ڈوبی ہوئی تھی اور سائیں پرانی قبر کے قریب منتر پڑھے پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت ایسے جنونی کی سی جو اپنے مقصد کے حصول کیلئے کچھ بھی کر گزرے گا وہ ادھر قبرستان میں چھڑکاؤ کر رہا تھا اور میں نمکین چیز کھانے کیلئے تڑپ رہا تھا۔

تین دن تک پھلوں کے استعمال نے میرا جینا دو بھر کر دیا تھا اس پر ظلم یہ تھا کہ ہر دفعہ کھانے میں تورما اور پلاؤ میرے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ پہلے تو ملازمین یہ سمجھتے کہ شاید مجھے تورمہ اور پلاؤ پسند نہیں لہذا اگلے روز تورمہ اور پلاؤ کے ساتھ کرلیے گوشت بھی موجود تھا اس سے اگلے روز آلو کی بھجیا بھی ساتھ آگئی اور تیسرے روز حلیم کی ڈش بھی ٹرائی میں موجود تھی۔ قریب قریب تھا کہ میں رو پڑتا۔ کہنے کو تو یہ معمولی سا انتقام تھا لیکن ذرا سوچئے کہ آپ کو میٹھا ہی میٹھا دیا جاتا رہے تو کیسا لگے گا۔ دعوت میں اگر دس ڈشیں نمکین ہوں تو ایک ڈش میٹھے کی ہوتی ہے کبھی یہ نہیں ہوتا کہ دس ڈشیں میٹھے کی ہوں اور ایک نمکین کی ہو۔ نمکین میری تو ایک بھی نمکین ڈش نہیں تھی منہ کو نمکین کرنے کے لئے میں امردو کے ساتھ کالی مرچ والا پسا ہوا نمک کھا رہا تھا ایسے میں یہ بھی غنیمت تھا۔ اس وقت بھی میں کھانے سے فارغ ہو

کریڈ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ یہاں سے کیسے فرار ہوا جائے۔ سائیں کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے کالے علم کی بدولت مجھے کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو یہاں سے بھاگ کر اتنی دور چلا جاؤں جہاں سائیں کا عمل مجھ تک نہ پہنچ سکے یا پھر اس کا کہا چپ چاپ مان لوں، اگر تو وہ سب واقعی سچ ہے جو اس نے کہا تو پھر طلسمہ سے چھٹکار پانے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اس سے کیا کہ بعد میں سائیں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے یا نہیں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ اگر مجھ سے چلے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو.....؟؟ میں نے تو آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا اور سنا تھا کہ ایسے چلوں کے دوران عجیب عجیب واقعات پیش آجایا کرتے ہیں خود میرا باپ بھی منتر کا ایک لفظ زائد پڑھ دینے کی وجہ سے موت کا شکار ہو گیا تھا۔ میرے جسم میں عجیب سی بے چینی پھیل گئی کوئی تاجا مجھے روک رہا تھا کہ باز آ جاؤ اس کام سے..... یہ سب حرام ہے..... یہ سب حرام ہے..... میرے اندر چیخ و پکار ہونے لگی۔ اس کشمکش نے مجھے نڈھال کر دیا اور ادھر ادھر سر پٹختنے لگا۔

اچانک مجھے ایک نیا طریقہ سوچھا..... میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا یہ طریقہ پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ غالباً سائیں کے علم میں ابھی تک نہیں آ سکا تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے میرا روپ بدل جاتا ہے۔ میں نے ایک کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے اس عمل میں میری جان بھی چلی جاتی لیکن یہ اس چلے سے بہت بہتر تھا۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اپنی جان بچانے کی ہر ممکن سعی کرو۔ میں نے سوچا اگر ویسے ہی موت لکھی ہے تو پھر ایسے ہی سہی فیصلے کی قوت نے مجھ میں عجیب سا اعتماد بھر دیا تھا۔ اب کی بار میں پوری تیاری میں تھا۔

شام کو سائیں کمرے میں آیا تو میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھا تھا۔ میرے اطمینان کو دیکھ کر سائیں کے چہرے پر بھی طمانیت نظر آنے لگی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے خود کو اس کا حکم ماننے کے لئے تیار کر لیا ہے اسی لئے بڑی محبت سے قریب آ کر بولا۔

”تو تم تیار ہو؟“

میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا زندگی میں پہلی بار مجھے اینکنگ کرنا پڑی تھی

اور میں سخت مشکل محسوس کر رہا تھا، پھر بھی حواس مجتمع رکھتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔
 ”طلسمہ کو حاصل کر لینے کے بعد تم میں کون سی صلاحیت پیدا ہو جائے گی؟“

وہ پر جوش ہو گیا..... ”پھر..... پھر میں اپنا روپ بدل کر کسی بھی روپ میں آسکوں گا“
 میں حیران رہ گیا۔ قدرت خود بخود میرے بچاؤ کے اسباب مہیا کر رہی تھی۔ سائیں کو روپ
 بدلنے کی طاقت چاہئے تھی اور میرے پاس روپ بدلنے کا شاندار طریقہ موجود تھا تاہم میں
 نے اسے اگلنے سے گریز کیا۔ گیند میرے کورٹ میں تھی میں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا
 ”سائیں! تم الو کے پٹھے ہو، گدھے ہو کینے ہو.....“

”کیا.....؟؟“ سائیں کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ وہ ایک دم صوفے سے اچھلا.....

اس کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔ اسے ایک فی صد بھی توقع نہیں تھی کہ اس کے سامنے ایک معمولی سا خوفزدہ انسان اسے اتنی بڑی گالیاں دے سکتا ہے۔ ایک لمحے کیلئے تو اسے یوں لگا جیسے اسے سننے میں دھوکا ہوا ہے لیکن میرے چہرے کا اطمینان دیکھ کر وہ انگارہ بن گیا.....

میں بھی اندر سے ڈر گیا اس سے پہلے کہ سائیں کچھ کہتایا کرتا میں نے فوراً کہا۔
 ”کالا علم تم نے خاک سیکھا ہے، جانتے ہو میں کون ہوں؟“ یہ جملہ میں نے اتنے ڈرامائی انداز میں کہا کہ ایک لمحے کو سائیں بھی گڑبڑا گیا۔
 ”کون ہو تم؟“

”میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو..... بہت ہو چکا مذاق..... اب سنو! میں کالے علم کا سو فیصد چلہ کاٹ چکا ہوں، میری مجبوری ہے کہ مجھے اس روپ میں رہنا پڑ رہا ہے ورنہ میں جنات کے روپ میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں“
 ”تو اس کر رہے ہو تم..... میں ابھی تمہیں جلا کر رکھ کر تا ہوں اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ سیدھے کئے.....“

میری سٹی گم ہو گئی میں نے جلدی سے کہا۔

”سائیں بہت بڑی غلطی کرو گے، مجھے مار دیا تو طلسمہ بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائیگی اور تمہارا سارا عمل بھی“

وہ یکدم رک گیا..... کچھ دیر مجھے گھورتا رہا، پھر سخت لہجے میں بولا۔
”تم کیا کر سکتے ہو“

”میں روپ بدل سکتا ہوں“ میں نے اطمینان سے کہا۔

میرا جملہ اس پرائیٹم بم بن کر گر ا۔

”نا ممکن“ اس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔
”آزمالو“

وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں رہا پھر گہری نظروں سے مجھے تولتے ہوئے کہا
”اور اگر تم ناکام رہے تو؟؟“

”تو پھر جو چاہے کر لینا“

”ہوں.....“ اس نے ایک لمبا ہنکارا بھرا..... ”ٹھیک ہے، بدلو میرے سامنے روپ“

”ایسے نہیں پہلے مجھے کچھ کھانی تو لینے دو میں کافی دیر سے بھوکا ہوں۔“

”کالا علم کرنے والے بھوکے نہیں رہتے“ اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ایک حادثے کے نتیجے میں کچھ مہینوں کے لئے میں روپ بدلنے کے سوا اپنی کسی صلاحیت کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوں“ میں نے جلدی سے بات بنائی۔

سائیں نے سر ہلایا اور میز کی طرف اشارہ کر کے دونوں ہاتھوں پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ میز

انواع و اقسام کے کھانوں سے بھر گئی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور قورمے کی پلیٹ اٹھالی۔ اب جو

کچھ بھی ہونا تھا وہ معجزہ ہی ہونا تھا پتا نہیں طلسمہ کس روپ میں مجھ پر حاوی ہوتی میں نے دل

ہی دل میں بسم اللہ پڑھ کر گرم گرم قورمے کا ایک لقمہ منہ میں ڈال لیا۔ لقمہ منہ میں ڈالتے ہی

مجھ پر لرزہ طاری ہونے لگا اگرچہ ابھی طلسمہ نہیں آئی تھی لیکن اس کی آمد کا ڈر کیا کم تھا؟؟“

اتنے دنوں بعد نمکین اور لذیذ ڈش نصیب ہوئی تھی اصولی طور پر تو مجھے سارا کھانا ہڑپ کر جانا چاہئے تھا لیکن کوشش کے باوجود میں دو لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا۔

اب کسی بھی وقت طلسمہ میرے اندر آسکتی تھی میں نے کھانا دھوا چھوڑ دیا اور صوفے پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنے والے لمحے میرے اختیار میں نہیں تھے۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا جا رہا تھا۔ میں نے مضبوطی سے دانت پر دانت جما کر آنکھیں بھیج رکھی تھیں میں نہیں چاہتا تھا کہ طلسمہ کو دیکھ کر میرے عمل سے بزدلی ظاہر ہو۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

سائیں میری اس ساری کیفیت کو روپ بدلنے کے کسی خاص مرحلے کا حصہ سمجھ رہا تھا اس لئے چپ چاپ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد بھی طلسمہ کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آئے میں نے دوبارہ دو لقمے قورمے کے لئے لیکن بے سود، طلسمہ ندرت۔

”یا الہی یہ کیا ماجرا ہے، جب میری خواہش ہے کہ میرا روپ بدل جائے تو معاملہ الٹ ہو گیا ہے“

آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ سائیں کے چہرے پر تمسخر کے ساتھ ساتھ برہمی کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے۔ مجھے بالکل بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ہوا ہے کیا طلسمہ نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے کیا اب میں کھانے پینے میں آزاد ہوں؟؟

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سائیں نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑا کر میری طرف پھونکا۔ ایک دھواں سا میری طرف بڑھا اور میری چیخیں نکل گئیں میرے جسم پر کیڑے ہی کیڑے چمٹے ہوئے تھے۔ میں نے دیوانہ وار کمرے میں بھاگنے لگا۔ یہ کیڑے میرے جسم کو کاٹ رہے تھے، بھنبھوڑ رہے تھے اور میں پورے کمرے میں چکراتا پھرتا رہا تھا۔ میری چیخوں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا لیکن کسی ملازم کو اندر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں جتنے کیڑے جھاڑتا، اس سے دوگنے اور نمودار ہو جاتے، میرے پورے جسم پر پھوٹے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ اگر کچھ دیر اور یہ کیڑے میرے جسم کو نوچتے

رہے تو میں مرجاؤں گا میں نے زمین پر لوٹنیاں لینا شروع کر دیں لیکن کیڑے پھر بھی علیحدہ نہ ہوئے وہ کسی جو تک کی طرح مجھے چٹ گئے تھے اور میرے بدن کو اندر سے کاٹ رہے تھے۔ چیخنے چیخنے میرے منہ سے جھاگ نکلتا شروع ہو گئی میری اذیت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کیڑے میری آنکھوں اور کانوں میں گھسے جا رہے تھے اور میں بلبلاتا پھر رہا تھا سانس اطمینان سے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ میں ذکر اتا ہوا بیڈ کے کونے سے نکل آیا اور ردی والی ٹوکری کے قریب منہ کے بل جاگرا، میری آنکھوں کے سامنے ٹوکری کے اندر کل والی روٹی کے چند ٹکڑے پڑے تھے۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوچا، ہمت کر کے کسی نہ کسی طرح ہاتھ بڑھایا اور ٹکڑے منہ میں ڈال کر چبا گیا۔

ٹکڑے چباتے ہی ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی کیڑے اچانک میرے بدن سے غائب ہو گئے اور یکدم کسی نے میرا گلہ دبوچ لیا۔ مجھے اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اچانک میرے کان میں کسی کی سرگوشی سنائی دی۔

”خبیث..... میں جنات میں سے ہوں..... مت بھول تیرا کلیجہ کھانا ہے مجھے..... اب دیکھ تجھے کیا بناتی ہوں“

طلسمہ نے ایک غوطہ لگایا اور میرے کان کے راستے اپنا وجود اندر داخل کرنے لگی۔ تکلیف کی شدت سے میری آپیں نکل رہی تھیں۔ چیخنے کی سکت تو بالکل نہیں رہی تھی۔ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے مجھے فضا میں پٹنیاں دی ہوں، میں زور سے اچھلا اور جب دوبارہ فرش پر آیا تو ایک نیا حلیہ میرا منتظر تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اب کی بار میں انسان ہی تھا لیکن کچھ ناناؤس تبدیلیوں نے مجھے احساس دلایا کہ میں کسی اور شکل میں ہوں میں نے ایک نظر سامنے شیشے پر ڈالی اور سن ہو گیا۔

طلسمہ نے مجھے ایک جوان لڑکی بنا دیا تھا۔

میرا روپ بدلتے دیکھ کر سائیں کے ہوش اڑ گئے۔ ایک دم اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے ایک زقہ بھری اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔

سائیں کے بھاگتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہ میرے ڈرامے سے متاثر ہو چکا ہے۔ اب میرے پاس صرف پندرہ منٹ تھے کیونکہ سابقہ تجربے کی رو سے پندرہ منٹ بعد مجھے اصل روپ میں آ جانا تھا۔ ان پندرہ منٹوں میں ہی مجھے یہاں سے فرار ہونا تھا۔ میں نے تیزی سے خود کو سنبھالا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر آ گیا۔

سائیں کے کمرے سے ایک نوجوان لڑکی کو نکلتے دیکھ کر ملازم ہکا بکا رہ گئے، غالباً وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے تھے کہ میں ان کی نظروں سے بچ کر کیسے اندر پہنچ گئی۔ تاہم انہوں نے مجھے کچھ کہنے یا روکنے سے گریز کیا۔ میں نے سڑک پر آتے ہی تیزی سے ایک جانب چلنا شروع کر دیا۔ مجھے لڑکی بنے پانچ منٹ ہو چکے تھے، باقی صرف دس منٹ رہ گئے تھے اور اگر ان دس منٹوں میں سائیں نے مجھے دوبارہ آن لیا تو میرا بچنا بہت مشکل تھا۔ میں نے اپنے قدم کچھ اور تیز کر دیئے۔

سڑک کا موڑ مڑتے ہی مجھے رکنا پڑا کیونکہ آگے لمبی سڑک تھی اور اس سڑک پر کسی بھی جگہ میرا حلیہ تبدیل ہو سکتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، ساتھ ہی ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ میری دستک کے جواب میں اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی۔

”کون؟؟؟“

میں نے اللہ کا نام لے کر آہستہ سے کہا ”دیکھئے میں رستہ بھول گئی ہوں براہ کرم میری مدد کیجئے“ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میری آواز بھی سو فیصد لڑکیوں جیسی ہو گئی تھی۔

طلسمہ مجھے جو روپ بھی دے رہی تھی مکمل دے رہی تھی۔ میری آواز سن کر کسی نے دروازہ کھولا۔ وہ میرے جیسی ہی نوجوان لڑکی تھی۔ میں مخمضے میں پڑ گیا۔ یوں کسی کے گھر میں داخل ہو جانا بھی خلاف تہذیب تھا، جبکہ باہر رہنے کی صورت میں سائیں کا خطرہ تھا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا اور کہنے لگا۔

”مجھے رحیم بلڈنگ جانا ہے لیکن یہاں تو کوئی رحیم بلڈنگ نہیں“

لڑکی نے بھی کچھ سوچا پھر بولی ”واقعی رحیم بلڈنگ تو یہاں کوئی نہیں، تم ایسا کرو اندر آجاؤ، بابا آتے ہیں تو میں انہیں تمہارے ساتھ بھیج دیتی ہوں، اصل میں اس وقت گھر میں کوئی مرد نہیں.....“

میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ وہ مجھے اندر کمرے میں لے آئی۔ میری نظریں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں، صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے، میں اس معصوم لڑکی کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن کوئی اور رستہ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔ وہ بچاری اسے میری گھبراہٹ سمجھی۔ جلدی سے بولی

”آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کیلئے چائے بنا کر لاتی ہوں“

میں انکار کے باوجود اسے روک نہ سکا۔ اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا پتا نہیں کب میں اپنے اصلی حلیے میں واپس آجاتا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا، یہ چھوٹا سا گھر تھا اور کمرے بھی غالباً چھوٹے تھے، میں جس کمرے میں موجود تھا وہاں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھا، صرف چند منٹ باقی تھے، میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسی لمحے وہ بھی آگئی۔

”ارے آپ کہاں جا رہی ہیں، اطمینان سے بیٹھے، یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں“ وہ کھلکھلا کر ہنسی اور میں مزید پریشان ہو گیا۔ بات میرے اختیار سے نکلتی جا رہی تھی۔ گھڑی پر پندرہ منٹ مکمل ہو چکے تھے، میرے جسم سے پسینا چھوٹنے لگا۔ میں جلد از جلد اس گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ”اوہو..... میں چینی ڈالنا تو بھول ہی گئی، ابھی لائی“..... اس نے تیزی سے کہا اور باورچی خانے کی طرف بھاگی.....

”لڑکی میری حالت سے بے خبر باورچی خانے میں چینی تلاش کر رہی تھی۔ ایک منٹ بعد وہ چینی لے کر واپس کمرے میں پہنچی اور ٹھٹھک کر رک گئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ خوف سے دھواں دھواں ہو گیا۔ میں نے جلدی سے کہا

”گھر او نہیں..... بالکل مت گھبراؤ..... میں کوئی چور یا ڈاکو نہیں“

”کک، کون ہو، کون ہو تم؟“ وہ اٹنے قدموں پیچھے ہونے لگی۔

”دیکھو!..... پہلے اپنے آپ کو سنبھالو..... میں نے کہا ناں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی اور اسی وقت جا رہا ہوں“

”نکل جاؤ، نکل جاؤ جلدی سے ورنہ میں شور مچا دوں گی“ وہ خوف کے باعث حواس باختہ ہوئی جا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... میں جاتا ہوں“ میں نے جلدی سے کہا اور باہر کی طرف لپکا۔ اسی لمحے کسی نے دروازے پر دستک دی اور میں جہاں تھا وہیں جم گیا۔ لڑکی تھر تھرا کانپ رہی تھی۔

”رابعہ بیٹی دروازہ کھولو“ باہر سے آواز آئی۔

”بب..... بابا آگئے۔“ لڑکی کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھوں سے آنسو جگمگانے لگے۔

میں اس کی پوزیشن اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس کی معصومیت پر ترس اور اپنے آپ پر شدید غصہ آ رہا تھا کیا ضرورت تھی اس طرح سے کسی کے گھر میں گھسنے کی، جب پتا بھی تھا کہ کچھ دیر بعد حلیہ بدل جائیگا۔

باہر مسلسل دستک ہو رہی تھی اور میں شش و پنج میں کھڑا تھا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اس کے حیا آلود پاکیزہ چہرے پر ایک عجیب سی بے چارگی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”خدا کے لئے کہیں غائب ہو جاؤ، میرے بابا مجھ پر بہت اعتماد کرتے ہیں“

غائب ہو جانے کا سن کر ایک منٹ میں مجھے سمجھ آ گئی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اپنے آپ کو زور زور سے طمانچہ ماروں، میں نے طلسمہ پر لعنت بھیجی جس کی وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا اور آگے بڑھ کر لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”قسم خدا کی! تم میری بہنوں کی طرح ہو، جاؤ اطمینان سے جا کر دروازہ کھولو، واپسی پر میں

تمہیں اس کمرے میں نہیں ملوں گا“

وہ بے اعتبار نظروں سے مجھے دیکھنے لگی، یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایک بند کمرے سے کہیں غائب

ہو جاتا۔

”رابعہ..... بیٹی دروازہ کھولو۔ خیر تو ہے“ آواز میں تشویش نمایاں تھی۔

”آئی بابا“ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور لرزتے کانپتے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا البتہ چٹخنی نہیں لگائی۔ سامنے میز پر چائے کا کپ دھرا تھا۔ میں نے آؤدیکھانہ تاؤ گرم گرم چائے ایک ہی گھونٹ میں اپنے سینے میں اتار لی۔ چائے چونکہ بہت گرم تھی اس لئے یوں لگا جیسے میرے سینے میں کسی نے آگ بھردی ہے۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا۔ لڑکی دروازہ کھول چکی تھی اور اس کا بوڑھا باپ سبزی والا تھیلا ہاتھ میں پکڑے اندر داخل ہو رہا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر اس نے مشکوک نظروں سے پوچھا۔ ”بیٹی یہ تمہاری آنکھیں کیوں تر ہیں؟“

”کک..... کچھ نہیں بابا..... وہ..... اصل میں پیاز کا پانی چڑھ گیا ہے“ لڑکی نے جلدی سے بات بنائی اور بے چین نظروں سے کمرے کی طرف دیکھ۔ یہ کمرہ شاید اس کے باپ ہی کا تھا۔ بوڑھے نے تھیلہ لڑکی کے ہاتھ میں تھمایا اور خود کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی وہیں کھڑی تھی میں نے دروازے کی درز سے اسے آسمان کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے دیکھا اب جو ہونا تھا برا ہونا تھا۔

میں شدید پریشان کھڑا تھا ابھی تک میرا روپ نہیں بدلا تھا نہ میں فضاء میں اچھلا تھا اور نہ ہی طلسمہ سامنے آئی تھی۔ یقیناً کوئی نہ کوئی نئی مصیبت ضرور آنے والی تھی کیونکہ پہلے بھی یہ ہو چکا تھا کہ سائیں کی کوشی میں قورمہ کھانے کے باوجود میری شکل نہیں بدلی تھی۔ میں تباہوا کھڑا تھا۔ قسمت نے مجھے عجیب چکر میں ڈال دیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں جو طلسمہ کے وجود سے اتنا خوفزدہ تھا اب دعا کر رہا تھا کہ وہ کہیں سے آجائے اور بے شک مجھے مار ڈالے، زندہ رہنے میں بھی آخر کیا رکھا تھا۔ ایسی زندگی سے تو موت بدرجہا اچھی۔ مجھے علم تھا کہ میں غائب نہ ہوا اور اس بوڑھے نے مجھے کمرے میں دیکھ لیا تو لڑکی پر قیامت ٹوٹ پڑے گی اور یہ مجھے کسی قیمت پر

گوارہ نہ تھا۔ اس نے میری مدد کی تھی وہ میری محسنہ تھی۔ اگر میں اس کے احسان کا بدلہ یوں چکاتا تو میرے سے زیادہ کمینہ دنیا میں نہ ہوتا اور پھر میں نے اسے بہن کہا تھا زندگی میں پہلی بار یہ لفظ میری زبان سے ادا ہوا تھا پتا نہیں کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ اپنی بہن کی عزت کے لئے مجھے کچھ بھی کر جانا چاہئے۔

بوڑھا کسی بھی لمحے اندر داخل ہو سکتا تھا مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں ہاتھ روم میں کیوں نہیں چھپ گیا، اب تو صرف ایک ہی صورت تھی کہ بوڑھا دروازہ کھولنے کے بعد اسے دوبارہ بند نہ کرے کیونکہ دروازے کے عقب میں میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس وقت رابعہ نامی وہ لڑکی کس عذاب سے گزر رہی ہوگی۔ میں نے مٹھیاں بھیجنے لیں اب جو ہونا تھا چند لمحوں میں ہونا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ جو بھی ہو گا کچھ اچھا نہیں ہو گا۔ میری تمام توجہ باہر کی طرف مرکوز تھی جدھر سے بوڑھے کے بوٹوں کی آواز دھیرے دھیرے کمرے کی طرف آرہی تھی۔ میں نے دوبارہ خود کا جائزہ لیا لیکن کوئی تبدیلی نظر نہ آئی میں ویسے کا ویسا ہی تھا حالانکہ خالص آگ پر بنی ہوئی چائے میرے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور بوڑھا اندر داخل ہو گیا۔

اسی لمحے مجھے یوں لگا جیسے میں بالکل دیوار کے اندر گھس گیا ہوں۔ یہ احساس ہوتے ہی میرا جسم ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اتنا سکڑ گیا کہ دیوار پر لگا موٹا سا کیل بھی مجھے اپنے سے طاقتور نظر آنے لگا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ اب کی بار طلسمہ نے مجھے کیا بنایا ہے۔ خوفناک بات تو یہ تھی کہ میں اپنی گردن بھی ہلانے سے قاصر تھا میری گردن 90 ڈگری کے زوایے پر اکڑی ہوئی تھی اور میں کسی بے وزن چیز کی طرح ادھر ادھر ہچکولے کھا رہا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی بوڑھے نے پہلا کام یہی کیا کہ دروازے کے عقب میں جھانکا۔ پھر وہ سیدھا ہاتھ روم کی طرف بڑھا ایک نظر اس پر ڈالی کچھ دیر وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور مجھے اس اس کی آنکھوں میں طمانیت کے آثار دیکھ کر سکون سا آگیا۔ یقیناً وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ لڑکی صحن میں خوف سے منجمد کھڑی تھی۔ اس

کا باپ کمرے میں داخل ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ اب کسی بھی لمحے کوئی بھی آواز سنائی دے سکتی ہے اس کے چہرے کا رنگ مزید سفید ہو رہا تھا بوڑھے کو اطمینان بھرے انداز میں کمرے سے نکلنے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں ایک بند کمرے سے غائب ہو سکتا ہوں۔ لیکن بوڑھے کی آواز نے اسے حیران کر دیا۔

”بیٹے کھانا لے آؤ بہت بھوک لگی ہے۔“

لڑکی کا خیال تھا کہ میں کمرے میں چارپائی کے نیچے یا کسی ایسی جگہ چھپا ہوا ہوں جہاں اس کے باپ کی نظر نہیں پڑی اس لئے وہ ابھی تک خوف کے حصار سے باہر نہیں آ سکی تھی۔

”رابعہ بیٹی! کیا بات ہے کھانا کیوں نہیں لارہیں“ بوڑھے نے جھپٹے ہوئے لہجے میں کہا اور لڑکی چونک گئی۔

”لاتی ہوں بابا۔“

میں عجیب عذاب میں پھنسا ہوا بچکولے کھا رہا تھا۔ اسی لمحے باہر دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی اونچی آواز میں بولا عبد اللہ بھائی جلدی باہر آؤ۔

عبد اللہ غالباً بوڑھے کا نام تھا اپنا نام سنتے ہی وہ جلدی سے دروازے کی طرف لپکا مجھے ہولے ہولے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آتی رہی پھر بوڑھے کی آواز آئی۔

”رابعہ! کھانا رہنے دو میں آکر کھالوں گا..... مرزا صاحب کے بیٹے کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے میں ہسپتال جا رہا ہوں“

میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ اگر میں انسانی حالت میں ہوتا تو اسی وقت سجدہ شکر بجالاتا۔ مجھے پتا تھا کہ مجھ سے کہیں زیادہ خوش وہ لڑکی ہو گی جس کی لاج خدا نے رکھ لی تھی۔ باپ کے جاتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے اندر کا ایک جائزہ لیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولی۔

”تم کہاں ہو..... بابا چلے گئے ہیں..... جاؤ چلے جاؤ.....“ میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ مجھے تو دوبارہ انسانی حالت میں آنے کے لئے پورے دس منٹ درکار تھے۔ میں بے بسی کے عالم

میں کڑھتا رہا۔ کچھ دیر اس نے مجھے آوازیں دیں۔ پھر محتاط قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھا مجھے کہیں نہ پا کر اس کے چہرے پر خوف کی چھائیاں نظر آنے لگیں۔ یوں بند کمرے میں میرا غائب ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے ایک نظر دروازے کے پیچھے بھی ڈالی..... اور اسی وقت..... مجھے یوں لگا جیسے اس نے باقاعدہ میری طرف دیکھا ہے۔

وہ واقعی مجھے گھور رہی تھی۔ میں حیران ہو گیا کہ اس نے مجھے نئے روپ میں کیسے پہچان لیا ہے۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی، پھر بڑبڑائی ”یہ ہینگر کس کا ہے..... بابا تو ہینگر میں کپڑے نہیں لٹکاتے.....“

میں دل ہی دل میں طلسمہ کی فنکاری پر عیش عیش کراٹھا۔ اس نے مجھے ہینگر بنا کر لڑکی کا بھلا کر دیا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ میری گردن کیوں نہیں ہل رہی تھی میں چونکہ کافی حد تک بے وزن ہو گیا تھا اسی لئے ادھر ادھر ہچکولے کھاتا پھرتا تھا۔

لڑکی نے مجھے گریبان سے پکڑ کر کھوٹی سے اتارا اور کپڑوں کی الماری کا دروازہ کھول کر بغیر پھینک دیا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا۔ یہ جگہ روشنی سے بالکل عاری تھی لیکن کپڑوں کے ڈھیر کی وجہ سے خاصی نرم تھی جس کی وجہ سے مجھے کلائی چوٹ نہیں لگی ویسے میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے اس عالم میں چوٹ لگتی تو خون نکلتا یا گردن ٹوٹتی؟؟

لڑکی خاصی ہراساں تھی اس لئے مجھے الماری میں پھینک کر جلدی سے باہر صحن میں جا کر بیٹھ گئی۔ غالباً باپ کی آمد تک وہ کمرے میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے اب بھی یقین تھا کہ میں کمرے ہی میں کہیں موجود ہوں۔

ادھر ٹھیک پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی پٹاخ سے میرا سر الماری کی چھت سے ٹکرا لیا اور میں سمجھ گیا کہ میں دوبارہ نور ابن چکا ہوں۔ الماری کے دھماکے کی آواز خاصی بلند تھی۔ لڑکی یہ

آواز سنتے ہی اچھل پڑی۔ دہشت سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنا شروع ہو گئے تھے۔
میں نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک جھٹکے میں الماری سے باہر نکل
آیا۔ مجھے کمرے کے دروازے سے نکلتے دیکھ کر وہ گنگ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے اس کی آواز حلق
میں گھٹ کر رہ گئی ہے۔

مجھے پتا تھا میں اسے کسی طرح بھی مطمئن نہیں کر سکوں گا کہ آخر میں کہاں چھپ گیا تھا۔ اسی
لئے میں نے آرام سے دروازہ کھولا، باہر جھانکا، سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے موقع کا
فائدہ اٹھایا اور لڑکی کو حیران و پریشان چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل آیا۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے۔ مجھے رات بسر کرنے کے لئے کوئی محفوظ
جگہ چاہئے تھی۔ میں سڑک کے کنارے کنارے جھاڑیوں کے عقب میں چلتا جا رہا تھا۔ یہ
سائیں کا علاقہ تھا اور میں اس کے علاقے سے جلد از جلد دور ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم
تھا کہ قسمت مجھے کہاں لے جائیگی تاہم میں مزید کسی چکر میں نہیں پھنسا چاہتا تھا۔ مجھے ہر
حالت میں تبت کی مدھوپہاڑی پر پہنچنا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب ساری کوششیں طلسمہ
کی بربادی پر صرف کروں گا۔ اس نے نہ صرف میرے والدین کو موت کے گھاٹ اتارا تھا
بلکہ میرا جینا بھی محال کر رکھا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے کھڑی بھوسے کی ٹرائی
پر نظر پڑی غالباً اس کا ٹائر پنچر ہو گیا تھا کیونکہ ڈرائیور دوسرا ٹائر بدل رہا تھا۔

میں نے سوچا اب مجھے کیا کرنا ہو گا۔ ڈرائیور اکیلا تھا اور ٹائر بدلنے میں مشغول تھا۔ میں نے
اس کی نظر بچا کر ایک جست لگائی اور بھوسے کے ڈھیر میں جا پڑا۔ میرے کودنے سے ٹرائی
زور سے ہلی۔ ڈرائیور نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پھر پلٹ کر عقبی سمت میں آیا لیکن میں
اتنی دیر میں بھوسے کے خاصا اندر گھس چکا تھا۔ بھوسے کی درز میں سے میں نے دیکھا کہ
ڈرائیور نے ایک اچھتی نظر ڈھیر پر ڈالی اور پھر سر ہلاتا ہوا واپس جا کر ٹائر بدلنے لگا وہ کوئی
دیہاتی تھا جو غالباً اپنے گاؤں جا رہا تھا۔

بھوسے کے ڈھیر میں چھپنے کے مجھے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو میں دوسروں کی نظروں سے

محفوظ ہو گیا تھا دوسرے سردی کی بڑھتی ہوئی لہر سے بچاؤ کا ایک شاندار ذریعہ پیدا ہو گیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد ٹائر بدلا گیا۔ ٹرائل سٹارٹ ہوئی اور میں بھی اس کے ساتھ ساتھ سفر کرنے
لگا۔

کیا زندگی تھی یہ بھی..... کیا آپ نے کبھی کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جس کا دنیا میں کوئی نہ
ہو، آپ نے بے شک نہ دیکھا ہو لیکن مان لیجئے کہ ایسے ہزاروں ہوں گے جو میری طرح در
در کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہوں گے۔ کچھ لوگ خود ٹھوکریں کھانا چاہتے ہیں، کچھ کو
نقد پر ٹھوکریں کھلاتی ہے۔ میرا شمار دوسری قسم والے لوگوں میں تھا۔ زمانہ مجھے گھاگ سے
گھاگ بنائے جا رہا تھا۔ میں نے بھوسے کے ڈھیر میں لیٹے لیٹے مستقبل کی پلاننگ کرنا شروع
کر دی۔ کیسا عجیب منظر تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بیٹر کے سامنے بیٹھ کر ماں باپ کے
سامنے، دوست رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کرتے ہیں میں بھوسے کے
ڈھیر میں گھسا آئندہ کالائے عمل سوچ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے میری آنکھیں بوجھل ہوتی چلی گئیں اور میں گہری نیند سو گیا شاید میں دو تین
گھنٹے سویا تھا کیونکہ جب آنکھ کھلی تو رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ میری آنکھ کھلنے کی وجہ
کانوں میں پڑی آواز تھی۔ میں نے بھوسے کی درز سے جھانکا اور خوف سے کانپ اٹھا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک پرانا سا قبرستان تھا ٹرائل ایک قبرستان کے پاس رکی ہوئی
تھی۔ سامنے ایک قبر کے پاس سائیں کھڑا تھا اور ڈرائیور کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ میری
سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ سائیں یکدم یہاں کیسے پہنچ گیا اور یہ ڈرائیور اس کا کیا لگتا ہے دونوں
کے باتیں کرنے کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈرائیور بھی سائیں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔
میں پوری توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔

”دلورا! ہمیں تین گھنٹے تک مسلسل آگ جلائی ہے۔ بھوسہ کم تو نہیں پڑ جائے گا“
”نہیں سائیں! موٹا بھوسہ لایا ہوں جلتے جلتے جلے گا..... آپ یہ بتائیں کہ چلہ کب شروع
کرنا ہے؟“

”ابھی نہیں..... پہلے پیر سانول کو آ لینے دو“

”پیر سانول..... پیر سانول..... پیر سانول.....“ میرے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ یہ نام میں نے کہاں سنا تھا..... میں بے چین ہو گیا۔ پیر سانول کے ذکر نے میری ساری حیات بیدار کر دی تھیں۔ میں نے اپنی یادداشت کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ یہ نام میرے لئے بہت اہم تھا لیکن کس لحاظ سے، معلوم نہیں.....

”سائیں! پیر سانول سے کہنا کہ مجھ پر بھی کرم کر دے..... میں نے چھوٹے بچے کی بری کا گوشت انہیں پیش کر دیا تھا“ دیہاتی کے لہجے میں عاجزانہ پن تھا۔

”کیوں نہیں، کیوں نہیں..... اگر پوری لگن اور شوق سے کالا علم سیکھو گے تو پیر سانول ہر قدم پر تمہاری مدد کرے گا“

”اف خدایا!.....“ مجھے سب یاد آ گیا..... پیر سانول..... پیر سانول..... مجھے شکورے مورچی کے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے جو اس نے میرے باپ کی موت کے وقت مجھ سے کہے تھے، اس نے واضح طور پر بتایا تھا کہ پیر سانول نے ہمیں کالے علم پر لگایا تھا اور زور دیا تھا کہ قرآن کی آیتیں (نعوذ باللہ) الٹا کر کے پڑھیں..... مجھے اپنے باپ کے آخری جملے بھی یاد آ گئے جو مرتے وقت اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئے تھے وہ آخری وقت تک پیر سانول کے حوالے سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن موت نے انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دی۔

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ میری خوشیوں کا قاتل پیر سانول کچھ ہی دیر میں میرے سامنے آنے والا تھا۔ کاش میرے پاس اس وقت گولیوں بھری بندوق ہوتی تو میں ساری گولیاں اس شیطان کے سینے میں اتار دیتا۔ بڑا دردناک اور اذیت ناک ہوتا ہے وہ منظر جب آپ کا دشمن آپ کے سامنے ہو اور آپ کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔ میں بے حیثیت تھا۔ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

”اے رب العالمین! کیوں اتنے امتحانوں میں ڈال رہا ہے، اپنے محبوب ﷺ کے صدقے مجھے

وہ طاقت عطا کر کہ میں ان جیسے ہزاروں شیطانوں کا اکیلا مقابلہ کر سکوں۔ کب تک یہ مکروہ لوگ تیرے کلام کو اپنے ناپاک عزائم کیلئے استعمال کرتے رہیں گے۔ تو نے ہر دور میں فرعون کے لئے موسیٰ پیدا کیا ہے تو پھر اس شیطان پیر سانول کو اب تک کیوں زندہ رکھا ہوا ہے۔ یا الہی مجھے اس سے نکر لینے کی ہمت عطا کر.....“

دعائے مانگتے مانگتے میرا چہرہ آنسوؤں سے بھر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھ میں برداشت کا نیا مادہ بھر دیا ہے، یہ دعا بھی عجیب چیز ہے بعض اوقات مانگتے مانگتے پوری ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی یوں لگا جیسے میری دعا پوری ہو گئی ہے کیونکہ اب کی بار میں اپنے آپ میں بڑا حوصلہ محسوس کر رہا تھا۔ مجھے شدت سے انتظار تھا پیر سانول کا، وہ دونوں بھی اسی انتظار میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدالیں تھیں اور وہ بار بار بے چینی سے قبرستان کی اندرونی سمت دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد قبرستان کے اندر سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ اس نے لمبا سا چوٹا پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈنڈا تھا، پاؤں ننگے تھے اور بال لمبے لمبے۔

قریب آنے پر میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر عجیب سی خباثت رقاصاں تھیں۔ اس کے قریب آتے ہی سائیں اور دلاور سجدے میں گر گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی پیر سانول ہے۔ میں نے پورے عزم کے ساتھ ان کی ساری کارروائی دیکھنا شروع کر دی۔

”قبر کھودو“ پیر سانول نے آتے ہی حکم دیا۔

یہ سنتے ہی دلاور اور سائیں تیزی سے اٹھے اور کدال ہاتھ میں لے کر قبر کھودنا شروع کر دی۔ قبر کچی تھی اور مٹی خاصی نرم تھی اس لئے دھیرے دھیرے خالی ہوتی چلی گئی۔ میں آنکھیں پھاڑے یہ دہشت ناک کارروائی دیکھ رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک قبر کو کھلتے دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک، تو میں نے قبر کو بھرتے ہی دیکھا تھا معلوم نہیں قبر کھودی جائے تو کیسی ہوتی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے لیکن سائیں اور دلاور ہر قسم کے احساس سے بیگانے ہو کر پوری توجہ سے قبر کھود رہے تھے۔

قبر کی پہلی تہہ ختم ہوئی تو نیچے سے اینٹیں نظر آنے لگیں۔ اینٹوں سے نیچے لحد ہوتی ہے اور لحد میں میت..... میں کانپ گیا۔ پتا نہیں یہ شیطان کیا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سائیں نے کدال رکھ دی اور اینٹیں اکھیڑنے لگا۔ دلاور مسلسل اس کے ساتھ جتا ہوا تھا۔ اس سارے عمل کے دوران پیر سانول اطمینان سے ان کے سروں پر کھڑا تھا۔ اینٹیں اکھڑ گئیں تو نیچے سے میت کا کفن نظر آنے لگا۔ یہ شاید کوئی ایک دو ہفتے پرانی قبر تھی کیونکہ کفن ابھی تک قائم تھا کفن کو چھوتے ہی فضا میں ایک دم مشک کا فور کی بو پھیل گئی۔ یوں لگا جیسے پورا قبرستان جنازوں سے بھر گیا ہو۔ سائیں اور دلاور قبر کے اندر اتر گئے اور میت کو کھینچ کر باہر لے آئے۔

اس وقت شاید رات کے دو بجے تھے شدید سردی کے عالم میں قبرستان کی پر اسرار فضا میں میت قبر سے باہر پڑی تھی اور تین شیطان اسے گھور رہے تھے۔
 ”اسے دائرے کے اندر لٹا دو پیر سانول نے قبر کے قریب چھڑی سے ایک بڑا سا دائرہ بناتے ہوئے کہا حکم کی تعمیل ہوئی اور میت دائرے میں رکھ دی گئی۔
 ”تم دونوں اس کے دائیں بائیں لیٹ جاؤ“
 دونوں لیٹ گئے۔

پیر سانول نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ میں سانس روکے دم بخود تھا۔ ساری فضا پر عجیب سی پر اسراریت چھائی ہوئی تھی میں نے غور سے پیر سانول کی طرف دیکھا۔ جس کے ہاتھوں کی مٹھیاں مسلسل میت کی طرف اٹھ کر کھلتی اور بند ہو رہی تھیں۔

اچانک میت کے پیروں میں حرکت سی ہوئی اور میں لرز گیا۔

پیر سانول نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور پوری قوت سے چلایا۔ ”دیوتا..... اٹھا دے اس کو..... اٹھا دے اس کو..... ماترائے داشیو سان..... ماترائے داشیو سان..... ماترائے شیو سان..... اٹھا دے اس کو..... شیطان دیوتا تیرا پجاری تجھے سجدہ کرتا ہے..... اٹھا دے اس

دروازہ کھولیں میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

آپ کون ہیں؟؟ آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ ناگواری بھی تھی۔

بی بی آپ کسی مرد کو بھیجیں میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔

ابو گھر میں نہیں آپ اپنا نام بتادیں آواز میں شائستگی آگئی۔

میرا نام نور محمد ہے آپ کے ابو کب تک آجائیں گے ان کا تو پتا نہیں ٹھہریں میں امی کو بلاتی

ہوں وہ غالباً اندر کی طرف بھاگی تھوڑی ہی دیر میں کسی اور کے قدموں کی چاپ سنائی دی پیر

سانول اور سینوریتا خاموشی سے کھڑے تھے۔ آنے والی عورت جو غالباً لڑکی کی ماں تھی۔

تیکھے لہجے میں بولی۔

کیا بات ہے بھائی صاحب؟ مجھے یوں لگا جیسے میں گاؤں میں یہ آواز سن چکا ہوں میں نے حتی

المقدور لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا ”بی بی آپ لوگ کس کی اجازت سے اس گھر میں رہ

رہے ہیں۔

میری بات کے جواب میں اس نے غصے سے دروازہ کھولا سامنے آؤ ناں ذرا۔ کون ہو تم

عورتوں کو دھمکیاں لگانے والے۔

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ قریبی گھروں کی دس بارہ عورتیں باہر نکل آئیں دروازہ کھلتے ہی

عورت روشنی میں آئی اور..... اسے دیکھتے ہی میرے جسم میں انگارے دہکنے لگے۔

چاچی..... چاچی..... چاچی..... میں اسے کیسے بھول سکتا تھا میری زندگی کی بربادی کی ذمہ دار

وہی تو تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے آبائی گھر پر بھی میری خونخوار چاچی قابض

ہو جائے گی لیکن اس وقت معاملہ کچھ اور تھا اب کچھ اور.....

میں نے دانت پیسے

اوہو..... تو چاچی صاحبہ یہاں براجمان ہیں۔

میرا لہجہ سن کر ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا گئی کک..... کون ہو تم؟

میں..... میں وہی ہوں جس کو تم نے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانے پر تھپڑ مارا تھا میں وہی

ہوں جس کو تم نے غنڈوں کی مدد سے مارنے کی کوشش کی تھی میں وہی ہوں جس کو تم نے غلیظ جانور کی طرح سمجھ کر گھر میں پال رکھا تھا مجھے پہچان چاچی..... میں اتنا مشکل سوال بھی نہیں ہوں کہ تمہیں جواب میں کوئی مشکل پیش آجائے..... میں بھی روشنی میں آگیا۔
 نن..... نورے..... تو.....!! چاچی کے حلق میں الفاظ پھسنے لگے.....
 ہاں..... چاچی میں..... نور..... نور محمد۔

کیا کرنے آئے ہو یہاں چاچی نے اپنی آواز سنبھالنا چاہی۔
 کچھ بھی نہیں آپ کی گاڑی صاف کرنے آیا ہوں آپ کا کتا نہلانے آیا ہوں آپ کے زہریلے جملے سننے آیا ہوں۔
 تم..... تم چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ تم پولیس سے بھاگے ہوئے مجرم ہو۔ دفع ہو جاؤ ورنہ ابھی پولیس کو بلوا لوں گی۔

پولیس..... سبحان اللہ..... اب یہ لفظ مجھے خوفزدہ نہیں کرتے جاؤ تم پولیس کو بلواؤ تاکہ میں اپنے اقبالی بیان میں لکھوا سکوں کہ مجھے اس حالت میں لانے والے کون لوگ ہیں۔ چاچی.....
 تم سانپ بھی ہو اور بچھو بھی ڈنگ مارنا تمہاری فطرت میں شامل ہے مجھے پیار کا ایک جملہ بھی تمہاری طرف سے نصیب ہوا ہوتا تو میں تم پر اپنی جان بھی وارد دیتا تم نے اس وقت مجھے ذلت کی گہرائیوں میں دھکیلا جب میرے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ چکا تھا آج تمہارا یوم حساب ہے چاچی۔ میں غریبا۔

چاچی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں میرے عقب میں گاڑی اور پیر سانول کو دیکھ کر غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اب وہ نور نہیں رہا جسے وہ غنڈوں کی مدد سے پٹا سکے۔
 گلی میں خاصا رش ہو گیا تھا اس رش کو چیرتے ہوئے ایک نوجوان آگے بڑھا اور میرے سامنے آکھڑا ہوا میں نے چونک کر اسے دیکھا برسوں پرانا چہرہ میرے ذہن میں گھوم گیا وہ نعیم تھا نفرت کی ایک لہر میرے اندر اٹھی جسے میں نے بڑی مشکل سے دبایا۔ یہ وہی نعیم تھا جس کی خاطر چاچی نے میری ہڈی پہلی ایک کردادی تھی۔ ابھی میں اسے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس

نے ایک عجیب حرکت کی وہ یکدم سینوریتا کی طرف اشارہ کر کے زور زور سے ہنسنے لگا میں گڑ بڑا گیا سینوریتا بے اختیار پیر سانول کی اوٹ میں ہو گئی۔
”ہوش میں رہو“ میں گر جا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بلند آواز قہقہے لگانے لگا میں نے غصے سے چاچی کی طرف دیکھا اور پھر چونک اٹھا چاچی کی آنکھوں میں آنسو تھے میں نے زندگی میں پہلی بار چاچی کی آنکھیں نم دیکھی تھیں آنسو بھی قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں بد نصیب ہے وہ آنکھ جس میں آنسو نہ ہوں آنسو تو انسان کو پاک کرتے ہیں اندر دھوتے ہیں آنکھوں کی صفائی کرتے ہیں چاچی بھی آج اشک شوکی کے مرحلے سے گزر رہی تھی میں اس کے آنسوؤں سے زیادہ نعیم کے قہقہوں پر حیران تھا میری یہ حیرانی چاچی کی آواز نے توڑی۔
یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔

کیا مطلب؟ میں نے مڑ کر نعیم کی طرف دیکھا۔

بھائی جان کار کے حادثے میں ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔ میرے عقب سے درد میں ڈوبی ایک باریک آواز ابھری میں چونک کر پیچھے مڑا اور جیسے زمین نے میرے پاؤں پکڑ لئے شازیہ کا آنسوؤں بھر اچھرہ میرے سامنے تھا۔

شازیہ..... شازیہ..... میرا دماغ مسلسل گھومنے لگا یہ وہی شازیہ تھی جس کے لئے میں نے زندگی میں پہلی بار محبت کے جذبات محسوس کئے تھے۔ ایک بے زبان محبت جو شاید ابھی تک بے زبان تھی میں گنگ کھڑا تھا شازیہ کا چہرہ میرے سامنے تھا جس وقت نے مزید نکھار دیا تھا میں کافی دیر تک اسی عالم میں کھڑا رہا، دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں کاش وقت وہیں ٹھہر جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا پیر سانول نے مجھے جھنجھوڑا اور میں ایک جھٹکے سے شازیہ کے ٹرانس سے باہر نکل آیا۔ چاچا مختار کدھر ہیں؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ابو شہر گئے ہیں کام پر..... شازیہ نے نظریں نیچی کر لیں۔

”کون سے کام پر؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

وہ..... شازیہ نے کن اکھیوں سے چاچی کی طرف دیکھا چاچی نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گئیں شازیہ نے جملہ دوبارہ شروع کیا۔
 وہ..... ابو شہر کی ایک فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ کی جاب کر رہے ہیں۔
 چاچا مختار اور نوکری.....؟؟؟ میں گڑ بڑا گیا۔

ہاں نورے..... جب پہننے کو لباس نہ رہے کھانے کو روٹی نہ ملے رہنے کو مکان نہ ہو تو پھر نوکریاں کرنا ہی پڑتی ہیں تمہیں شاید کچھ بھی علم نہیں کہ اتنے طویل عرصے میں ہم پر کیا بیت گئی۔ شاید یہ ان ہی گناہوں کی سزا ہے جو ہمارے گھر میں تمہارے ساتھ روا رکھے گئے، نورے تم یقین نہیں کرو گے کہ ہم عالی شان گھر میں رہنے والے کاروں کو ٹھیوں والے نکلے نکلے کے محتاج ہو گئے ابو کا کاروباری پارٹنر کوڑوں کا فراڈ کر کے فرار ہو گیا کاروبار دیوالیہ ہو گیا بینک والوں نے ساری جائیداد قرق کر لی قرض خواہوں نے گھر پر ڈیرے جمائے۔ اس پریشانی میں ابو کو زبردست ہارٹ اٹیک ہوا جس کے بعد رہا سہا کاروبار بھی جاتا رہا ابھی ہم اس حادثے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ نعیم کی کار بکوحادثہ پیش آ گیا اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور نرگس.....

شازیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اگرچہ اس کے ادھر سے فقرے کا مطلب بہت واضح تھا تاہم میں نے تصدیق ضروری خیال کی۔ کیا ہوا نرگس کو؟؟؟
 چاچی بے اختیار رو پڑی ہائے ہائے مر گئی میری بچی میری پھولوں جیسی بچی کا سرتن سے جدا ہو گیا میری نرگس کو ظالم ٹرک والے نے کچل ڈالا میری بچی میری نرگس وہ شاید بے ہوش ہونے لگی تھیں میں نے بھاگ کر انہیں سنبھال لیا آخر وہ میری چاچی تھیں آنسو تو دیے بھی میری کمزوری ہیں میری اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں نرگس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا وہ چھوٹی سی گڑیا جو میرے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتی تھی مرتے وقت پتا نہیں کس اذیت سے گزری ہو گی چاچی کو گر تادیکھ کر میں نے شازیہ کو جلدی سے پانی لانے کا اشارہ کیا اور چاچی کو بڑے آرام سے ساتھ پڑی کر سی پر بٹھادیا۔ شازیہ ننگے پاؤں بھاگی گئی اور پانی کا گلاس لے آئی۔ میں نے پانی مٹھی میں ڈالا اور چاچی کے چہرے پر چھینٹے مارے دو چار چھینٹوں میں ہی

وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھیں۔ مجھے اپنے سامنے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ہونٹ کپکپانا شروع ہو گئے خدا گواہ ہے کہ میں نے اس وقت ان کے چہرے پر عجیب سی پاکیزگی دیکھی۔ یہ وہ چاچی نہیں تھیں جن کا چہرہ ہر وقت میک اپ میں تھڑا رہتا تھا جو شہر کی امیر بیگمات کے ساتھ مل کر پارٹیاں انینڈ کرتی تھیں یہ تو کوئی اپنی اپنی سی چاچی تھیں ماں جیسی۔ میک اپ سے لبریز فیشن ایبل عورت ماما تو ہو سکتی ہے ماما تو ہو سکتی ہے، ماں نہیں۔ ماں صرف اس ہی پر چلتا ہے جو سفید کپڑوں میں ملبوس تخت پوش پر بیٹھی کوئی وظیفہ پڑھ رہی ہو جو ذرا سی بات پر گھبرا جائے شہر کی زندگی نے انسان کو اعتماد کی وہ خطرناک طاقت بخش دی ہے کہ اب اس کی بدولت وہ انجانے میں نہ جانے کتنے دلوں کا خون کر جاتا ہے۔ بات بات پر گھبرانے والے لوگ اب کہاں !!!

چاچی غالباً اپنے آپ میں ہمت محسوس نہیں کر رہی تھیں۔

آپ آرام کریں۔ میں چلتا ہوں میں کھڑا ہو گیا۔

نورے..... وہ..... شازیہ کے لہجے میں بے چینی تھی۔ میں خود بھی عجیب سے احساس میں مبتلا تھا چاچی چپ تھیں۔

باہر میرے مہمان کھڑے ہیں میں نے شازیہ کو یاد دلایا۔

نورے..... وہ..... وہ تمہارے ساتھ لڑکی کون ہے؟ شازیہ کے لہجے میں شکایت تھی میں نے کچھ دیر سوچا پھر ایک مناسب جواب دیا جو میں پہلے بھی دے چکا تھا۔

شہر کی فیکٹری میں جہاں میں کام کرتا ہوں یہ اس کے مالک کی بیٹی ہے مالک اس کے ساتھ ہی کھڑا ہے۔

تم کہاں چلے گئے تھے شازیہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور میرا دل چاہا میں چیخ چیخ کر روؤں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں کہاں گیا تھا اور مجھ پر کیا ہوتی تھی لڑکیاں کب ایسی باتوں کا یقین کرتی ہیں میرا وجود کچھلنے لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں زیادہ دیر وہاں رہا تو پھر شاید کبھی باہر نہ جاسکوں گا۔

شازیہ میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز پر قابو پایا شازیہ یہ گھر تمہارا ہے۔ چاچی کا ہے جب تک چاہو رہو، میرا کیا ہے میں تو دھکے کھانا سکھ گیا ہوں، آوارگی نے مجھے درد رکاشیدائی بنادیا ہے مجھے اجازت دو..... میں اٹھا۔

نہیں نورے پتر..... چاچی نے کھڑے ہونے کی کوشش کی میں نے جلدی سے انہیں سہارا دیا تم ادھر ہی رہو گے، اب کہیں نہیں جاؤ گے ہمارا تو پہلے ہی کوئی نہیں رہا، اب تم بھی جا رہے ہو۔

چاچی نے پہلی دفعہ مجھے پتر کہا تھا حیرت ہے کہ یہ لفظ ان کے منہ سے اوپر انہیں لگا تھا۔ نہیں چاچی۔ مجھے نہایت ضروری کام سے جانا ہے زندگی رہی تو واپس ضرور آؤں گا میں تو وہ گھر دیکھنے آیا تھا جہاں میری ماں رہتی تھی میرا باپ اور میں رہتا تھا..... میں نے گھوم کر گھر پر نظر ڈالی، وہ صحن جہاں میرے باپ نے تڑپتے ہوئے جان دی تھی وہ برآمدہ جہاں سے میں جلتی ہوئی لکڑی لے کر آیا تھا سب جگہیں ویسی کی ویسی تھیں میں نے چشم تصور میں اپنی ماں کو دیکھا جو مجھے پراٹھا کھلا رہی تھی ماؤں کے ہاتھ بھی عجیب ہوتے ہیں ان میں سادہ روٹی بھی آجائے تو پراٹھے کا مزہ دیتی ہے لیکن میں ان بد قسمتوں میں سے تھا جو ماں اور باپ دونوں کے سائے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو چکے ہوتے ہیں۔

نہیں پتر۔ اب تو بھی یہیں رہے گا ہمارے ساتھ۔ چاچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا میں نے کہنا تھا چاچی۔ مجھے ابھی زندگی کا آخری کام کرنا ہے بس چند دن اور اللہ نے چاہا تو ضرور واپس لوٹوں گا میں نے شازیہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ میرا ارادہ ڈالو ڈالو ہونے لگا میں تیزی سے واپس مڑا۔

نورے واپس آؤ گے ناں۔ شازیہ کی آواز نے میرے قدم روک لئے میں نے مڑے بغیر کہا انشاء اللہ اور باہر نکل آیا۔

پیر سانول اور سینوریتا گاڑی میں بیٹھے تھے مجھے دیکھتے ہی پیر سانول نے چیپ سٹارٹ کر لی میں نے دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا گھر کے دروازے سے شازیہ ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھ

رہی تھی میں نے اس کے آنسوؤں کی تاب نہ لاتے ہوئے چہرہ نیچے کر لیا جیب آگے بڑھ گئی کچھ ہی دیر میں ہم پختہ سڑک پر تھے۔

خوبصورت تھی۔ سینوریتا بولی۔

کون!!! میں نے بے اختیار پوچھا۔

وہی جو تمہیں رخصت کرنے آئی تھی سینوریتا کے لہجے میں باریک سا طنز شامل تھا میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ پیر سانول ویسے ہی ہم دونوں کی گفتگو میں محمل نہیں ہوتا تھا اس لئے آرام سے جیب چلاتا رہا۔

رات کا اندھیرا خاصا گہرا ہوتا شروع ہو گیا تھا گاؤں سے کافی دور نکل آنے کے بعد پیر سانول نے اچانک ایک طرف جیب روک دی۔ جیب سے ایک رومال نکال کر اس پر کچھ پڑھنے لگا دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی اتنی بڑی ہو گئی کہ ہم با آسانی اس میں سو سکتے تھے سیٹیں خود بخود چارپائی کے سائز جتنی بڑی ہو گئی تھیں۔ پیر سانول نے باہر نکل کر گاڑی پر کچھ پھونکا اور واپس آگیا میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اب گاڑی عام نظروں سے ماورا ہو چکی ہے اور اسے کوئی انسان نہیں دیکھ سکتا۔ پیر سانول کے جادو نے مجھے حیران نہیں کیا۔ مجھے پتا تھا ایسا ہی کچھ ہو گا۔

یہ رات بڑی اطمینان سے کٹی۔ صبح سویرے ہم بیدار ہوئے اور دوبارہ سفر پر رواں دواں ہوئے راستے میں میرے لئے پھل اور سینوریتا کے لئے چٹ پٹی چیزیں خریدی گئیں میں حیران تھا کہ پیر سانول اتنے عرصے میں بھوک پیاس سے بے نیاز ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا غالباً اس کی خوراک کا ذریعہ کچھ اور تھا میں نے اس بارے میں اس سے کبھی نہیں پوچھا۔

تین دن کی مسلسل ڈرائیونگ کے بعد ہم شاہراہ ریشم پر آ نکلے۔ پہاڑی سلسلے تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے یہاں سے ہمیں چمین جانا تھا اور وہاں سے تبت۔ ”تبت“ چمین اور بھارت کے درمیان واقع ہے پہاڑوں میں لپٹی ہوئی یہ سرزمین اپنے اندر بے شمار اسرار شمائے ہوئے ہے ابھی ہمیں تبت پہنچ کر مدھو پہاڑی کا بھی پتا چلانا تھا ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ

تمام راستے گاڑی خراب نہیں ہوئی تھی۔ چیکنگ کے تمام مراحل پیر سانول خود نمٹاتا جا رہا تھا۔ ہمارے اور گاڑی کے کاغذات کے بارے میں ابھی تک کسی بھی نا کے پر کوئی مشکوک سوال نہیں ہوا تھا جس رفتار سے ہم جا رہے تھے اس رفتار سے ہمیں شاہراہ ریشم سے چین پہنچنے کے لئے پانچ دن درکار تھے میں زندگی میں پہلی بار پہاڑ دیکھ رہا تھا میرے دل میں بے اختیار تحسین کے جذبات پیدا ہونے لگے ان سنگلاخ پہاڑوں کو کاٹ کر جس انداز سے سڑک بنائی گئی تھی وہ یقیناً ایک عجوبہ تھا۔ پیر سانول نے بتایا کہ یہ سڑک ہمارے ملک اور چین کے انجینئرز نے مل کر بنائی ہے۔

کیا تمہارے جنات ایسی سڑک بنا سکتے ہیں میں نے پوچھا اگرچہ یہ سوال مزاحیہ پیرائے میں کیا گیا تھا لیکن پیر سانول نے اسے سنجیدگی سے لیا۔
ہاں..... بنا سکتے ہیں لیکن وہ صرف وقتی ہوگی۔
کیا مطلب۔

مطلب یہ کہ وہ کسی بھی وقت نظروں سے اوجھل ہو جائے گی کسی بھی وقت کسی بھی موڑ پر اس کا اختتام ہو سکتا ہے۔ جنات بنیادی طور پر مست مخلوق ہیں یہ مخلوق دوسروں پر زیادہ انحصار کرتی ہے تم خود دیکھو یہ پھل گندم اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں مثلاً حلوہ وغیرہ بھی انسانوں کا بنایا ہوا ہی چٹ کرتے ہیں میں نے ہنکارہ بھر اور چپ ہو گیا۔

گاؤں سے یہاں تک کے سفر میں ہمیں چار دن ہو چکے تھے لیکن سینوریتانے کوئی بات نہیں کی تھی مجھے بھی اس سے بات کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا اس لئے چپ رہا۔ سفر کے پانچویں روز ہمارے ساتھ ایک عجیب حادثہ پیش آ گیا پہاڑ کا موڑ مڑتے ہی اوپر سے ایک چٹان گری اور راستہ بند ہو گیا اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا پیر سانول نے تیزی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا کچھ پڑھا پھر سامنے کی طرف پھونکا۔

چٹان تھوڑا سا ہلی لیکن پھر اپنی پہلے والی پوزیشن میں آ گئی۔

گاڑی سے نکلو فوراً..... پیر سانول چیخا۔ میں اور سینوریتا تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل

آئے۔

پیر سانول نے ایک ہاتھ سے مجھے اور دوسرے سے سینوریتا کو پکڑا اور آنکھیں بند کر لینے کے لئے کہا آنکھیں بند کرتے ہی ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم کسی کنویں میں گرتے جا رہے ہیں ٹھوس زمین کا احساس ہوتا ہی اس نے ہمیں آنکھیں کھولنے کے لئے کہا۔

آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ ہم چٹان کے دوسری طرف کھڑے تھے اور جیپ بھی دوسری طرف آچکی تھی۔ پیر سانول نے تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم دونوں دوبارہ سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اچانک میرے عقب سے سینوریتا کے ڈکرانے کی آواز آئی میں ایک جھٹکے سے مڑا اور خوفزدہ ہو گیا۔ سینوریتا کے چہرے پر عجیب سی قسم کے موٹے موٹے کیڑے رنگ رہے تھے پیر سانول نے جیپ روک کر ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر ڈیش بورڈ میں سے ایک انسانی کھوپڑی نکالی اور سینوریتا کے سر پر پھیرنے لگا کیڑے تیزی سے غائب ہونے لگے۔

ساورتی پڑھو۔ پیر سانول چیخا۔

سینوریتا کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلنے لگے۔

پڑھو۔ پڑھو میری بچی۔ شاباش خود پڑھو۔

سینوریتا آہستہ آہستہ منتر پڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں کیڑے غائب ہو گئے البتہ سینوریتا ابھی تک نڈھال پڑی تھی۔

پیر سانول نے ساتھ پڑی چھاگل اس کے منہ سے لگادی پانی کے دو گھونٹ لیتے ہی وہ کافی حد تک سنبھل گئی۔

بابا..... طلسمہ کو ہمارے آنے کی خبر ہو گئی ہے سینوریتا کراہی۔

ہاں۔ پیر سانول نے مٹھیاں بھینچیں اب اس کا اور ہمارا سامنا زیادہ دور نہیں غمقرب طلسمہ

تمہارے قدموں میں ہو گی میری بچی۔

ہم پھر سے سفر شروع کر چکے تھے میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے آگ پر بنی ہوئی کسی بھی چیز کی

طلب بڑی شدت سے ہونے لگی تھی میں نے اپنی اس کیفیت کا ذکر پیر سانول سے کیا تو وہ چونک اٹھا۔

خبردار۔ نہایت احتیاط کرنا۔ طلسمہ تمہارے اندر کھانے کی ہوس پیدا کر رہی ہے تاکہ تمہیں برباد کر سکے ہم روز بروز اس کے قریب ہوتے جا رہے ہیں ہم تینوں میں سے کسی کی بھی موت تینوں کی موت ہوگی اس لئے خود کو قابو میں رکھو۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ اب کی بار مجھے خواب بھی نہایت ڈراؤنے آنے لگے تھے یہ خواب حقیقت سے اتنے قریب لگتے کہ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا سانس رکنے لگتی اور یوں لگتا جیسے خواب میں نظر آنے والی خوفناک بلائیں میرے وجود کو کچا چبا جائیں گی۔

میری مانو تو یہ پڑھو۔ پیر سانول نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔
یہ کیا ہے؟

یہ منتر ہے۔

اس سے کیا ہوگا۔ اس سے تمہارا دل آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کی خواہش نہیں کرے گا۔
میں اسے پڑھنے سے قاصر ہوں۔

گلے میں لٹکالو۔

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر حامی بھر لی پیر سانول نے تعویذ میرے گلے میں لٹکا دیا اور گرہ لگا دی تعویذ پہنتے ہی جادوئی کام ہوا مجھے اچانک پھل اچھے لگنے لگے میں نے تعریفی نظروں سے پیر سانول کی طرف دیکھا اس کے تعویذ نے واقعی کام کر دکھایا تھا میں نے سیٹ پر پڑے ہوئے کیلے کھانے شروع کر دیئے یہ کیلے میری بھوک اس طرح مٹا رہے تھے جس طرح روٹی۔ مجھے غصہ بھی آیا کہ آج تک پیر سانول نے مجھے یہ تعویذ کیوں نہ دیا۔ میں خواہ مخواہ ہی روٹی کے لئے ترستار ہا۔

کوشش کرنا کہ یہ اترے مت۔ پیر سانول کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ لگا کر تعویذ کے دھاگے کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور اثبات میں سر ہلادیا طلسمہ سے محفوظ رہنے کا ایک اور اہم ذریعہ

ہاتھ آگیا تھا۔

ہمارا یہ سفر 5 دنوں میں اختتام پذیر ہوا اس سفر میں ”طلسمہ“ کی بھرپور کوشش رہی کہ وہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکے۔ لیکن ہمیں شائد نیکی اور بدی کی دونوں طاقتیں حاصل تھیں میں نے دیکھا ہے کہ اکثر جب آپ کا واسطہ اپنے سے بھی بڑی برائی سے پڑتا ہے تو اپنا آپ یکدم نیک اور پرہیزگار لگنے لگا ہے 5 دن کا طویل سفر طے کرنے کے بعد جب ہم چین کی سرحد پہنچے تو دن کے بارہ بجے ہوئے تھے چین سخت گرمی کی لپیٹ میں تھا۔ سرحد پر مسلح اہلکاروں نے ہمیں چیکنگ کے لئے روک لیا چینی پولیس کا لہجہ ایسا ہے کہ سختی سے بھی بات کریں تو اتنی باریک آواز نکلتی ہے کہ سننے والے کو ہنسی آ جاتی ہے چینی پولیس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ لوگ پوری طرح سے مستعد ہوتے ہیں اسلحے کی ٹریننگ کے علاوہ یوگا، مارشل آرٹس اور دیگر اہم جسمانی ورزشیں ان کے معمول کا حصہ ہوتی ہیں۔ جیسے ہی ہماری جیپ رکی تین چار وردی والوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا پیر سانول نے ہمیں بیٹھے رہنے کا کہا اور خود باہر نکل آیا باہر نکل کر وہ چینی زبان میں پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتا رہا مجھے اس کے منہ سے چینی زبان سن کر حیرت بالکل نہیں ہوئی۔ وہ خبیث روح تھا اور خبیث روح کی باتوں پر حیرت چہ معنی!

پتا نہیں یہ اس کی باتوں کا اثر تھا کہ یہاں بھی اس نے اپنے عمل کا کمال دکھایا تھا مجھے اور سینوریتا کو جیپ سے اترنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی جیپ میں بیٹھے بیٹھے ہمارے کاغذات چیک ہوئے اور آگے جانے کی اجازت مل گئی ہم چین کے سرحدی گاؤں میں تھے یہ گاؤں اگرچہ ہمارے گاؤں کی طرح ہی تھا لیکن لہلہاتا ہوا سبزہ دیکھ کر یقین ہو رہا تھا کہ یہاں کی حکومت گاؤں کی ترقی میں پیش پیش ہے۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں چین سے تبت جاتے ہوئے دو چار روز ضرور لگ جائیں گے لیکن پیر سانول کے اعلان نے میرے کان کھڑے کر دیئے کہ ہم اگلے روز تبت میں ہوں گے۔

تبت کوئی اتنی بڑی ریاست نہیں لیکن پہاڑی علاقہ اور پراسرار ہونے کی وجہ سے یہاں کئی

کہانیاں جنم لے چکی ہیں۔

رات ہوئی تو پیر سانول نے اسی طرح گاڑی کو گھر کا روپ دے دیا۔ میں نے اس موقع پر سینوریتا کے چہرے میں ایک عجیب بات نوٹ کی ہر وقت بولتے رہنے والی یہ لڑکی جوں جوں تبت کے قریب ہوتی جا رہی تھی اس کی زبان کو تالا لگتا جا رہا تھا۔ شاہراہ ریشم کے سفر میں بھی اس نے کھانے پینے کی کوئی فرمائش نہیں کی مجھ پر کوئی جملہ نہیں کسا میں نے یہی خیال کیا کہ وہ شازیہ کی وجہ سے مجھ سے خفا ہے۔ رات کے وقت پھل کھاتے ہوئے میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا تو پیر سانول غائب تھا میں سمجھ گیا کہ وہ یقیناً اپنے چلے کے لئے جا چکا ہے سینوریتا باہر کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

”موسم اچھا ہے ناں“..... میں نے بات کی ابتداء کی اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ باہر دیکھنے لگی میں نے اسے کہا ”کیلے کھا لو.....“ اس نے نفی میں سر ہلادیا میں نے کندھے اچکائے اور کیلوں والا لفافہ ڈیش بورڈ کے اوپر رکھ دیا جیپ کے ماحول میں پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے شیشہ تھوڑا سا گھما کر اسے سینوریتا کے چہرے پر فوکس کر دیا۔ اسے شاید میری اس حرکت کا پتا نہیں چلا تھا اس لئے بدستور باہر دیکھتی رہی میں بڑے آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اس کی طرف ٹکلی باندھ کر دیکھ رہا تھا پھر شاید اسے بھی کسی گرم لمحے کا احساس ہوا اس نے بے اختیار ادھر ادھر دیکھا شیشے پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی یہ لڑکیاں بھی عجیب چیز ہوتی ہیں کبھی ایسا لگتا ہے کہ انہیں سب کچھ پتا ہے اور کبھی یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔ سینوریتا کے چہرے پر بھی عجیب سی معصومیت تھی اس کی اس حرکت سے میرے دل میں بے اختیار جلتنگ سے بچنے لگے۔ اگر یہ کوئی جذبہ تھا تو واضح طور پر اس وقت اس کے حصار میں تھا عورت واقعی عورت کے روپ میں ہی اچھی لگتی ہے۔ پر اعتماد، بہادر اور اپنے اداروں میں اٹل عورتیں ایک خاص طبقہ کو ہی زیب دیتی ہیں عورت سمجھتی ہے کہ شاید وہ برابری کی سطح پر مرد کا سامنا کر کے اپنا آپ منوا سکتی ہے وہ واقعی ایسا کر سکتی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے برابری چاہے یا محبت۔ درخت کی تمام تر

شادابی اور زندگی زمین کے دم سے ہوتی ہے وہ زمین سے کٹ جائے تو کہیں کا نہیں رہتا ویسے بھی ہیرا زمین پر پڑا ہو تو اسے اٹھانے کے لئے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ بغیر جھکے آپ ہیرا نہیں اٹھا سکتے سینوریتا کے اس ایک لمحاتی تاثر نے اسے اور بھی خوبصورت بنادیا تھا۔

”یہ شیشہ ایسے کیوں کیا ہے؟“ اس نے خفگی سے کہا۔

”یہ ایسے ہی تھا“..... میں نے مسکرا کر کہا اور سینوریتا دوسری طرف دیکھنے لگی مجھے پتا تھا خود وہ بھی مسکرا رہی ہے کچھ دیر خاموش رہی پھر سینوریتا کی آواز سنی۔

”نورے.....!!! تمہیں پتا ہے کل ہم نے زندگی اور موت کی جنگ لڑنی ہے۔“

”ہاں تو پھر.....؟؟؟“

”پھر یہ کہ.....“ وہ چپ ہو گئی میں ادھر رے لفظوں کے مفہوم سمجھنے میں کافی ماہر ہو چکا تھا تاہم میں نے اپنی قابلیت ظاہر کرنے سے گریز کیا اور خود بھی چپ رہا میں اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتا تھا مجھے پتا تھا وہ بات مکمل ضرور کرے گی اور ایسا ہی ہوا۔

”نورے..... تم..... تم واپس چلے جاؤ“ اس کی طبیعت سے سخت اضطراب نمایاں تھا میں حیران ہو گیا۔

”یہ کیسا مشورہ دے رہی ہو..... اب آخری منزل پر پہنچ کر نیچے سے سیڑھی کھینچ رہی ہو۔“

”میں سیڑھی نہیں کھینچ رہی بلکہ تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں“

میری ہنسی نکل گئی۔

”فکر نہ کرو مجھے یقین ہے کہ اگر میں مر بھی گیا تو تم جادو سے مجھے دوبارہ زندہ کر لو گی۔“

سینوریتا نے ایک گہرا سانس لیا..... ”نورے..... میرا جادو سب پر چل سکتا ہے لیکن شاید تم پر نہیں.....“ ویسے ایک بات تو بتاؤ..... اگر میں مر گئی تو.....؟؟؟

”تو میں نہایت اعزاز کے ساتھ دفنا دوں گا۔“ میں نے فوراً کہا۔ وہ کافی دیر تک باہر خلاء میں جھانکتی رہی کالے جادو نے ابھی تک اس کی معصومیت پر اپنی سیاہی منتقل نہیں کی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دوبارہ بند کر لیا پیر سانول آگیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر

اس کے ظاہر ہوتے ہی میں نے غیر محسوسانہ طریقے سے شیشہ دوبارہ ٹھیک کر دیا۔
 ”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ پیر سانول نے احتیاطاً پوچھا۔ میرے الفاظ ابھی حلق ہی میں تھے کہ
 سینوریتا بول اٹھی۔

”بابا..... نورے نے ایک حرکت کی تھی“

اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اس نے شاید میرے شیشہ
 گھمانے کا برا منایا تھا پیر سانول نے چونک کر پوچھا..... ”کیا ہوا؟“

میں سمجھ گیا کہ برے پھنسے..... سینوریتا ترے بولی.....

”بابا..... یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے روٹی کھانی ہے اصلی.....“

پیر سانول ایک جھٹکے سے میری طرف مڑا اور گرجا..... ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا“

..... لیکن میرا دماغ تو بہت سکون میں آ گیا تھا۔ پیر سانول کا جملہ سننے کی بجائے میں نے

سینوریتا کے جملے پر اطمینان کا سانس لیا۔

”خبردار! ہم نہایت خطرے میں ہیں تم یہ تعویذ مت اتارنا..... کل کا دن طلسمہ کی آزادی کا

آخری دن ہوگا۔“

”اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یہ بہت ضروری بات ہے دیکھو پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں طلسمہ کو مارنا نہیں بلکہ قبضہ

میں کرنا ہے تقریباً ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد ہم مدبو پہاڑی پہنچیں گے یہ پہاڑی تبت کی

سب سے خطرناک پہاڑی شمار ہوتی ہے بیس ہزار فٹ اونچی ہے اور بالکل سپاٹ ہے کہا جاتا

ہے کہ کسی نے اس کا دوسرا سرا یعنی چوٹی نہیں دیکھی۔ اس کی چوٹی کا حصہ نہایت تاریک اور

سرد ہے اتنی گرمی میں بھی وہاں منفی ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت متوقع ہے یہ پہاڑی تین

سطحوں پر مشتمل ہے پہلی سطح میں سانپ ہیں اس سے اوپر خطرناک کھائیاں اور بچھو، اور سب

سے اوپر وہ پر اسرار غار ہے جس میں طلسمہ کی لاش موجود ہے یا دوسرے معنوں میں طلسمہ

خود موجود ہے یا در ہے کہ طلسمہ تک پہنچنے کے 90 فیصد طریقوں کا انحصار جادو ہی ہے

پہاڑی پر چڑھنے کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا لہذا میرا کالاعلم ہم سب کو پہاڑی تک پہنچائے گا۔ جب تک ہم پہاڑی کی دونوں سطحوں کو عبور نہیں کرتے تیسری سطح پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اب غور سے سنو..... کل رات ٹھیک 12 بجے مدھو پہاڑی کے سامنے میں ایک چلہ شروع کروں گا اس عمل کے لئے دو دائرے بنائے جائیں گے ایک میں تم رہو گے دوسرے میں سینور تیارہ دائرے تمہاری حفاظت کے لئے ہوں گے تاکہ دوران عمل اگر کسی بھی قسم کی کوئی خطرناک صورتحال پیش آجائے تو طلسمہ تم پر وار نہ کر سکے۔

”تو کیا تم اپنے لئے کوئی دائرہ نہیں بناؤ گے میں نے پوچھا۔

”نہیں..... میری بات اور ہے جو دائرہ میں بنانا چاہتا ہوں وہ ہم پہاڑی کی تیسری سطح پر پہنچ کر بنائیں گے فی الحال تم اس کی بات چھوڑو اور جو میں کہتا ہوں وہ غور سے سنتے جاؤ اس عمل کے دوران سینور تیارہ کے بائیں ہاتھ کے خون کا ایک پیالہ اور تمہارے دائیں ہاتھ کے خون کا پیالہ دائرے میں موجود ہوگا۔

میں کانپ گیا..... ”خ..... خون..... میرا.....!!!“

”ہاں..... تمہارے خون کا اصلی پیالہ..... اگر نہیں دو گے تو طلسمہ کے شر سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکو گے.....“ پیرسانول کے لہجے میں دھمکی تھی لیکن میں اس کی دھمکی میں کہاں آنے والا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اپنے ہاتھ پر زخم لگا کر اسے پورا ایک خون کا پیالہ بھر دیتا، ویسے بھی میرے جسم میں خون رہا ہی کب تھا، وہ تو سارا طلسمہ اور جنات کے خوف سے خشک ہو چکا تھا۔ اچانک مجھے کوئی خیال آیا، میں نے جلدی سے سینور تیارہ کی طرف دیکھا اور کہا

”تم دو گی خون.....؟؟؟“

”بڑے آرام سے“..... اس نے ازلی لا پرواہی سے کہا اور میرا خون کھول اٹھا، وہ مجھ پر اپنی برتری جتانا چاہ رہی تھی۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ مزید بولی ”لگتا ہے تم نے پہلے کبھی کسی مریض کو خون نہیں دیا“

میں بھڑک اٹھا..... ”طلسمہ مریض نہیں ہے“

”بات خون نکالنے کی ہو رہی ہے“

”تو کیا یہ خون بھی اس طرح نکالا جائے گا جس طرح ڈاکٹرز نکالتے ہیں“

”ڈاکٹرز جسم سے خون نکالتے ہیں جو عموماً بازو کے ذریعے نکالا جاتا ہے جبکہ تم نے شاید سنا نہیں، بابا تمہارے ہاتھ سے خون نکالنا چاہتے ہیں“

”مطلب؟؟“

”مطلب یہ کہ تمہاری ہتھیلی کی ایک رگ کاٹ کر خون نکال لیا جائے گا، یقین کرنا چاہتا بھی نہیں چلے گا“

”واہ..... پتا بھی نہیں چلے گا..... کسی کا ہاتھ کٹ جائے اور اسے پتا بھی نہ چلے، ایسا کبھی ہوا ہے؟؟؟“

اپنے اپنے طریقے کی بات ہے..... بابا کو تم پوری طرح سے نہیں جانتے“

اسے مت روکو سینوریتا..... پیر سانول نے اسے ٹوکا..... ”یہ خود طلسمہ سے چھٹکارہ نہیں چاہتا تو ہم کیا کر سکتے ہیں“

میں نے کچھ دیر سوچا، پھر جلدی سے کہا..... ”ٹھیک ہے، لیکن پہلے سینوریتا کا ہاتھ کٹے گا“

میری بات سن کر سینوریتا، چونک کر شکایت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے میرے اس جملے سے اسے خاصی تکلیف پہنچی ہو۔ البتہ پیر سانول نے میری اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

رات کافی بیت چکی تھی لہذا دھیرے دھیرے سب نے آنکھیں موند لیں۔ سوائے پیر سانول کے۔

تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ یہیں سے واپس پلٹ جاؤں پھر خیال آیا کہ اتنی رات گئے کہاں جاؤں گا۔ سردی اتنی بڑھ چکی تھی کہ کچھ دیر مزید اسی طرح ٹھٹھرتا رہتا تو نمونیا ہو جاتا گا یا کھڑا کھڑا برف بن جاتا۔ میں نے جھوپڑی کے اندر جھانکنے کا فیصلہ کیا۔ مدد لینے سے پہلے اندر کی پوزیشن کا اندازہ لگانا ضروری تھا۔ میں ریگتا ہوا جھوپڑی کے قریب ہوا اور ایک آنکھ لگا کر پردے کی درز سے اندر جھانکا۔

سامنے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر کوئی میلا پھیلا کبیل اوڑھے محو خواب تھا۔ جھوپڑی کی ایک طرف ایک بیمار سی لائین اپنی زرد روشنی پھیلا رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کبیل دیکھ کر مجھے اور بھی زیادہ ٹھنڈ لگنے لگی تھی۔ میں نے اپنا جائزہ لیا اور میرا اندازہ صحیح نکلا میں باقاعدہ کپکپا رہا تھا۔ میرے لئے حرارت بہت ضروری تھی لیکن میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ پتا نہیں جھوپڑی والا میری آمد کو کیا، معنی دے؟۔ ویسے تو جھوپڑی میں موجود کدال وغیرہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ گورکن ہی ہے لیکن حیرانگی یہ تھی کہ اس کی جھوپڑی سے کچھ ہی فاصلے پر تھوڑی دیر پہلے ایک خونی کھیل کھیلایا تھا اور اسے کوئی خبر نہیں تھی۔ یا تو اس کے کانوں تک آواز نہیں پہنچی تھی یا وہ نیند کا بہت پکا تھا میں نے سوچا کہ میں اس سے کیا بہانہ بنا کر مدد مانگ سکتا ہوں۔ میری حالت تو ایسی تھی گویا میں میں سیدھا کسی قبر سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک کہانی ترتیب دی اور اللہ کا نام لے کر زور سے آواز دی۔

”کوئی ہے.....“

میری آواز خاصی بلند تھی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا نہ ہی اس کے خراٹوں کی مقدار میں کوئی کمی واقع ہوئی۔

میں زور سے کھنکارا اور پھر اونچی آواز میں کہا

”کوئی ہے.....“

وہ پھر سویا رہا، مجھے بہت غصہ آیا یہ بھی کوئی طریقہ ہے سونے کا، انسان کو اپنے ارد گرد کا کوئی

ہوش ہی نہ رہے۔ دنیا دماغیہا سے بے خبر ہو کر سونے والے ایسے لوگ مجھے کبھی بھی اچھے نہیں لگے۔ لیکن اب تو مجبوری تھی۔ میں نے جھوپڑی کے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ یہ ایک خلاف قانون اور اخلاقی ضابطہ سے باہر بات تھی لیکن میں مصیبت میں تھا اور میرا خیال ہے اس کیفیت میں اس طرح کسی کی مدد حاصل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

میں نے نپے تلے قدم اٹھائے اور میلا پردہ اٹھا کر جھوپڑی میں داخل ہو گیا۔ باہر کی نسبت جھوپڑی کی فضا خاصی گرم تھی۔ میں آہستہ سے چلتا ہوا اس کی طرف آنے لگا لیکن پھر رک گیا۔ سوچا ایک بار پھر آواز دے دیتا ہوں یوں کسی کے گھر میں گھس کر اسے جھنجھوڑ کر اٹھانا اچھا نہیں لگتا۔

”بابا اٹھو.....“

کبل میں تھوڑی سی حرکت ہوئی لیکن وہ پھر کروٹ بدل کر خرائے لینے لگا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ کہا۔

”باباجی..... باباجی اٹھو..... مجھے مدد چاہئے“

لیکن باباجی شاید گھوڑے بچ کر سوئے تھے، ان کے کان پر جوں تک نہ رہیگی۔ میں نے ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر باباجی کو جھنجھوڑا۔

”اٹھو بزرگوار! اتنی گہری نیند نہیں سوتے“

وہ تھوڑا سا کسمسایا لیکن لیٹا رہا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے سیدھا کیا اور..... اس کا چہرہ سامنے آتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

وہ میں تھا..... بالکل میں..... اور میں اپنی طرف دیکھ کر مسلسل مسکرائے چلا جا رہا تھا.....

مجھے یوں لگا جیسے مجھے غش پڑنے والا ہے میرے ہاتھ پاؤں بالکل بے جان ہونے لگے تھے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور ٹھوکر کھا کر قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گر۔ میری چیخیں نکل گئیں۔ جیسے ہی میں فرش سے اٹھا میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ چابپائی بالکل خالی تھی۔ اس پر کوئی شخص تو درکنار

کوئی کپڑا تک بھی موجود نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میں کسی لور چکر میں پھنسنے والا ہوں میں نے بھاگنے ہی میں عافیت جانی اور تیزی سے واپس مڑا اور..... میرا سانس جہاں تھا وہاں رک گیا.....

دروازے پر ”میں“ کھڑا عجیب سی نظروں سے مسکرا رہا تھا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں عالم نزاع میں ہوں۔ اس کی مکمل توجہ میری طرف تھی۔ مجھے رکتا دیکھ کر اس نے آہستہ سے قدم بڑھائے اور قریب آتے ہوئے بالکل میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی تیسرا ہمیں اس عالم میں دیکھ لیتا تو اسی وقت فوت ہو جاتا۔ آپ نے دو جڑواں بھائیوں میں اکثر مشابہت دیکھی ہوگی۔ لیکن ہم تو سو فیصد ایک جیسے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرے چہرے پر خوف تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ.....

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے کی مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی اور اس نے بھی بالکل میرے جیسا خوفزدہ منہ بنالیا۔

”کک..... کون..... کون ہو تم“ میں کپکپلا۔

”کک..... کون..... کون ہو تم؟“ اس نے بھی بالکل میری طرح کہا۔

”مم..... مجھے جانے دو.....“ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

”مم..... مجھے جانے دو.....“ اس نے جملہ دہرایا اور میری حالت مزید خراب ہو گئی۔ ایسا لگ کر رہا تھا جیسے میرے سامنے آئینہ رکھا ہوا ہے جس میں میرا عکس بالکل میری جیسی حرکات کر رہا ہے۔ میری ٹانگوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ میں کانپتی ٹانگوں سے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ بھی بالکل اسی پوزیشن میں میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”خدا کے لئے..... چلے جاؤ.....“ میں لرز رہا تھا۔

”خدا کے لئے..... چلے جاؤ.....“ اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اب اس سے جان چھڑانا بہت مشکل ہے وہ بالکل میرے سائے کی طرح میرے ساتھ چپکا بیٹھا تھا۔ ذرا انصوری سمجھے کہ اندھیری رات میں قبرستان کے ایک کونے میں ایک جھونپڑی میں آپ ایک بدروح کے ساتھ اکیلے موجود ہوں تو کیسا محسوس کریں گے

میرا تو پورا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا!
”مجھ سے بات تو کرو.....“

”مجھ سے بات کرو.....“ وہ بولا

”یہ تو تم میری نقل کر رہے ہو“ میں نے کہا۔

”یہ تو تم میری نقل کر رہے ہو“ اس نے کہا۔

”کیا تم طلسمہ ہو؟“

”کیا تم طلسمہ ہو؟“ وہ بولا۔

”خدا کی قسم میرا کالے علم سے کوئی تعلق نہیں“ میں گڑ گڑایا۔

”خدا کی قسم میرا کالے علم سے کوئی تعلق نہیں“ وہ بھی گڑ گڑایا۔

میں بری طرح حواس باختہ ہو گیا وہ میری بات سننے پر تیار ہی نہیں تھا بلکہ جو میں کہہ رہا تھا اسی کو دہرائے جا رہا تھا اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اگر میں چاہتا تو باہر جاسکتا تھا کیونکہ اس نے ابھی تک مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے آہستہ سے قدم اٹھائے۔ میرے ساتھ ہی بالکل اسی طرح اس نے بھی قدم اٹھادیئے اور میرے سامنے آکھڑا ہوا میں کچھ سوچ کر پانچ قدم پیچھے ہٹا، اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں کمرے میں دائرے کی شکل میں گھومنے لگا وہ بھی میرے ساتھ گھوم رہا تھا گھومتے گھومتے جیسے ہی میں دروازے کے قریب پہنچا، میں نے پوری قوت سے دوڑ لگا دی۔ وہ بھی میرے پیچھے لپکا، رات کی تاریکی میں ہم قبریں پھلانگتے ہوئے اندھا دھند بھاگے چلے جا رہے تھے کافی دور نکل آنے کے بعد میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا وہ نظر نہیں آ رہا تھا میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ آگے کی طرف قدم بڑھائے اور سامنے نظر پڑتے ہی میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

پیر سانول گہری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا.....

کون ہو تم..... اور اتنی رات گئے اس ویران قبرستان میں کیا کر رہے ہو؟“
میں بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس لئے سانس درست کرنے میں چند لمحے گزر گئے۔ اتنی دیر میں تیزی
سے سوچتا رہا کہ مجھے کیا جواب دینا چاہئے اور پھر میں نے کہا۔
”میں راستہ بھول کر ادھر آ گیا تھا۔“

”کہاں سے آئے ہو؟“ اس نے چھپتے ہوئے لہجے میں پوچھا
”مم..... میں..... وہ..... شہر سے آیا ہوں“ میں گھبرا گیا۔
لیکن شہر سے تو یہاں کوئی دیکھ نہیں آتی، تم کیسے پہنچے؟“ پیر سانول میرے قریب آچکا تھا۔
مجھے لگ رہا تھا کہ میں زیادہ دیر تک اس سے جھوٹ نہیں بول سکوں گا۔ پھر بھی اپنی کوشش
جاری رکھی۔

”وہ..... اصل میں، میں لفٹ لے کر آ رہا تھا“ میں نے بات بنائی۔

”کس سے؟“ اس نے سوال کیا۔

”نرالی والے سے“ میرے منہ سے نکلا اور اگلے ہی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا میرا

جملہ سنتے ہی پیر سانول یکدم چونکا، ٹرائی کے ذکر نے اس کی ساری حیات بیدار کر دی تھیں اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس ٹرائی میں تو نہیں جس میں بھوسالہ اہوا تھا؟؟؟“ میں بری طرح پھنس گیا تھا، انکار کرتا تو کوئی اور سوال آسکتا تھا میں نے فوراً کہا ”ہاں!“

یہ سن کر پیر سانول کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے سامنے کچھ اس طرح سے کھڑا ہو گیا تھا کہ اگر میں بھاگتا بھی چاہوں تو وہ مجھے فوراً پکڑ لے۔ لیکن میں فی الحال بھاگتا نہیں چاہتا تھا قبرستان کے اندر مجھ پر کسی بھی قسم کی مافوق الفطرت چیز حاوی ہو سکتی تھی جب کہ پیر سانول کے ہوتے ہوئے گمان تھا کہ میں کم از کم ایسی بلاؤں سے دور رہوں گا۔ میں نے پیر سانول کے ساتھ ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ قبرستان سے باہر آتے ہی میں کسی اور طرف کو بھاگ نکلوں گا لیکن تقدیر میری خام خیالی پر مسکرا رہی تھی۔ پیر سانول نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلیوں سے اس پر دباؤ ڈال کر بولا۔

”کیا تم نے سب کچھ دیکھا ہے؟“

واضح طور پر اس کا اشارہ سائیں کی موت والے بھیانک کھیل سے تھا تاہم میں نے اقرار نہیں کیا اور حیرت سے کہا۔

”کس چیز کی بات کر رہے ہو؟“

پیر سانول کچھ دیر میری آنکھیں پڑھتا رہا پھر دوبارہ بولا، اب کی بار اس کی آواز میں خاصی سختی تھی۔

”جس ٹرائی کی تم بات کر رہے ہو اسے دلاور لایا تھا اور وہ جس ٹریکٹر کے ساتھ ٹرائی لگا کر لایا تھا اس پر صرف ایک بندے کے بیٹھنے کی گنجائش تھی دیے بھی وہ اس موقع پر کسی کو ساتھ لانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ تمہیں سچ بتانا ہو گا کہ تم کیوں یہاں آئے ہو؟ ورنہ تم مجھے جانتے نہیں کہ میں کون ہوں؟“

میں اسے کیسے بتاتا کہ شیطان کے چیلے، میں ہی تو تھے پہچانتا ہوں میں ہی تو تیری تلاش میں

تھا..... لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔ مجھے ہر حالت میں قبرستان سے باہر نکلنا تھا میں نے پینتر ابدلا۔

”تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو..... پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور قبرستان میں کیا کر رہے ہو۔“

پیر سانول کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا مجھے یقین تھا کہ میں آئندہ زندگی میں کبھی اس سے زیادہ مکروہ مسکراہٹ نہیں دیکھ سکوں گا۔ اسے بھی شاید میرے اس سوال سے یقین ہو گیا تھا کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا اس نے میرے کندھے سے ہاتھ اٹھایا اور خاصے نرم لہجے میں بولا۔

میں کون ہوں..... یہ جانتا تمہارے لئے ضروری نہیں ہاں البتہ تم مجھے اپنا ہمہ رد سمجھ سکتے ہو..... میرا خیال ہے اتنی رات گئے تم محفوظ پناہ گاہ کے بغیر کہیں ابھی نہیں رہ سکو گے..... میرے ساتھ چلو..... یہاں سے دوسری طرف سڑک سے کچھ ہی فاصلے پر میرا کمرہ ہے۔ رات وہیں رہو، صبح چلے جانا۔“

میں نے کچھ دیر سوچا، ممکن ہے مجھے اسے ختم کرنے کا کوئی موقع مل جاتا لہذا رضامندی ظاہر کر دی۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ساتھ لئے قبرستان کی بغلی طرف بڑھتا چلا گیا شدید بارش کی وجہ سے ہمارے پاؤں پانی میں پڑتے تو شڑاپ شڑاپ کی تیز آواز ابھرتی اور یوں لگتا جیسے کسی کو سر عام کوڑے مارے جا رہے ہیں۔

ہو کے اس عالم میں پیر سانول بڑے اعتماد کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا تھوڑی ہی دیر میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سائیں اور دلاور کتے کی موت مرے تھے میں کانپ گیا لمحہ بھر کے لئے میرے ذہن میں وہ سارا منظر گھوما اور میں لرز گیا۔

”ٹھنڈ لگ رہی ہے؟“ پیر سانول نے میری لپکی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... م..... میں بالکل بھیگ چکا ہوں“

”فکرمت کرو..... ابھی ہم گھر پہنچ جائیں گے“ اس نے میرا ہاتھ دبا دیا۔

ہم تیزی سے چلتے ہوئے قبرستان کی حدود سے باہر نکل آئے۔ سامنے پختہ سڑک تھی چاندنی رات کی وجہ سے سڑیٹ لائٹس نہ ہونے کے باوجود سڑک خاصی روشن تھی قبرستان سے باہر آتے ہی میرے گیلے جسم نے اپنا احساس دلانا شروع کر دیا پیر سانول نے قدم تیز کر دیئے کچھ دیر بعد وہ مجھے سڑک کے کنارے بنے ایک کچے سے گھر میں لے آیا برآمدے سے گزر کر ہم لوگ سامنے والے کمرے میں آگئے، گھر بالکل ویران تھا اور لگ رہا تھا کہ پیر سانول یہاں اکیلا ہی رہتا ہے میں نے فرش پر نگاہ ڈالی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف انسانی کھوپڑیاں بکھری پڑی تھیں۔

پیر سانول بھی شاید میری کیفیت کو بھانپ گیا تھا اس لئے جلدی سے بولا۔

”خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں..... یہ مکان بھی اصل میں کافی عرصہ پہلے قبرستان کا حصہ تھا پچھلے دنوں سیلاب آیا تو اس میں موجود قبروں کی ہڈیاں وغیرہ باہر آ گئیں..... آؤنا اندر آ جاؤ“ میں پہلے تھوڑا سا جھجکا..... پھر اندر داخل ہو گیا کمرہ میری توقعات کے بالکل برعکس تھا دو دیوار پر قرآنی آیات کندہ تھیں صاف ستھرا بستر اور ساتھ میں دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اس کمرے کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پیر سانول جیسے مکار اور عیار عامل کا کمرہ ہے۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر برقی ہیٹر آن کر دیا ہیٹر کی گرمی نے میرے مساموں میں چھپی ٹھنڈ کو نکالنا شروع کر دیا۔ پیر سانول اتنی دیر میں صاف کپڑوں کا ایک جوڑا لے آیا اور مجھے ہاتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں کپڑے بدل کر آ گیا۔ کمرہ خاصا گرم ہو رہا تھا۔

”اس چارپائی پر آ جاؤ“ اس نے اشارہ کیا اور میں گرم کمرے میں لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

پیر سانول میرے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا میں اپنے باپ کے قاتل کے گھر میں موجود تھا، قاتل میرے سامنے تھا لیکن میں بے بس تھا۔

پیر سانول نے غور سے میری طرف دیکھا۔
 ”کیا کرتے ہو؟“ پیر سانول نے سوال کیا اور میں چونک اٹھا پھر خود بخود میرے منہ سے نکل گیا۔

”شہر کی ایک کوٹھی میں ملازم ہوں۔“

”کتنے پیسے مل جاتے ہیں؟“

”تمہیں اس سے کیا“

”ممکن ہے میں تمہیں اس سے کہیں زیادہ پیسوں کا کام دلا دوں۔“

”مثلاً“

”یہ بعد کی بات ہے پہلے تم موجودہ تنخواہ بتاؤ“ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ”تقریباً دو

ہزار مل جاتے ہیں۔“

”دو ہزار“ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے چہرہ اوپر کیا اور

بولا ”دس ہزار پر کام کرو گے؟“

”دس ہزار.....!!!!“ الفاظ میرے حلق میں پھنسنے لگے۔

”کم ہیں تو زیادہ بھی ہو سکتے ہیں“ اس نے میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا اور میں بے چین ہو گیا۔ آخر وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا تھا میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس کے کسی شیطانی کام میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔ پھر بھی میں اسے کریدنا چاہتا تھا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ اس لئے دوبارہ پوچھا۔

”دس ہزار..... یہ تو بہت زیادہ رقم ہے“

”ممکن ہے“..... اس نے کندھے اچکائے..... ”لیکن تمہیں شاید یہ سن کر زیادہ خوشی ہوگی کہ یہ رقم تمہیں بغیر کوئی کام کئے ملے گی“

میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلانے لگی۔ پیر سانول نے اپنی بات جاری رکھی۔

”دیکھو! کیا نام ہے تمہارا“.....

”نورا“

”ہاں! نورے!..... اس دنیا میں جینے کے دو طریقے ہیں ایک عزت کا ایک ذلت کا پہلے طریقے میں انسان خود مرتا ہے جب کہ دوسرے طریقے میں دوسرے مرتے ہیں اور حقیقتاً یہی طریقہ بہترین طریقہ ہے اگر تم چاہتے ہو کہ تم بھی اپنے مالکوں کی طرح رہو تو میں تمہاری یہ خواہش پوری کر سکتا ہوں۔“

میں ہمہ تن گوش تھا، میرا خیال تھا مجھے درمیان میں چپ ہی رہنا چاہئے، اس نے بات پھر شروع کی ہر انسان اپنے حقوق حاصل کرتا ہے کچھ لوگ پالیتے ہیں کچھ چھین لیتے ہیں۔ میں نے ان سب سے علیحدہ طریقہ کار اپنایا ہے جو ان سب پر حاوی ہے۔ جس طرح ایک بلڈنگ بناتے وقت ٹھیکیدار خود اینٹ گارا نہیں اٹھاتا بلکہ اس کی تعمیر کا سارا کام مزدور کرتے ہیں اسی طرح میرا کام بھی دوسروں کا محتاج ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنی اس عظیم قوت کو یوں ضائع جانے دوں۔“

”کون سی قوت.....“ میں نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بننے میں ہی عافیت جانی۔
 ”ہے ایک.....“ اس نے گہرا سانس لیا۔ ”بس مختصر لفظوں میں اتنا سمجھ لو کہ میں اگر چاہوں تو بیٹھے بٹھائے اس گھر کو محل میں تبدیل کر سکتا ہوں۔“
 ”تو کیا تم کوئی جادوگر ہو؟“ میں نے حیرانی ظاہر کی۔
 ”بہت معمولی لفظ استعمال کیا ہے تم نے میرے لئے.....“

وہ ہنسا..... ”سنو! میں کالے علم کا پجاری ہوں شیطان دیوتا کا سب سے چہیتا چیلہ۔ میں اپنے دیوتا کی اتنی شغتی اپنے اندر بھر لینا چاہتا ہوں کہ وہ خوش ہو کر مجھے اپنا نائب بنالے۔ لیکن یہ شغتی مجھے اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک شیطان دیوتا خوش نہ ہو اور شیطان دیوتا صرف اس صورت میں خوش ہو گا اگر میں اس کے چیلوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کروں گا۔“
 ”تنت..... تم..... کہنا کیا چاہتے ہو.....“ میں واقعی ڈر گیا۔

”جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو..... میری خواہش ہے کہ تم کالے علم کی اس راہ میں میرے ہم سفر بنو..... میرے دیگر کئی مرید مجھ سے یہ علم سیکھ چکے ہیں، ان میں کئی ناکام بھی ہوئے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کالا جادو تم پر ایک نئی دنیا کے دروا کرے گا۔ تم اپنے آپ میں اتھاہ قوت محسوس کرو گے۔ جب تمہیں پتا چلے گا تم محض اپنی پھونک سے ٹرک الٹا سکتے ہو تو پھر تمہیں زندہ رہنے کا مزہ آئے گا۔“

پیر سانول کا چہرہ پوری طرح مکروہ ہو چکا تھا مجھے اس سے شدید گھن آرہی تھی لیکن برداشت کرنا مجبوری تھی۔ میں نے پوچھا۔

”پیر سانول! یہ بتاؤ کہ تمہارے مرید بالآخر ناکام ہی کیوں ہوتے رہے ہیں؟“
 میرے منہ سے اتنا سننا تھا کہ پیر سانول نے ایک چھلانگ لگائی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا میں خوفزدہ ہو گیا، اس نے تیزی سے ہاتھ میری طرف کرتے ہوئے منہ ہی میں کچھ پڑھ کر میری طرف پھونکا اور میرا پورا جسم سخت دھار رسی میں لپیٹ لیا؟
 ”یہ..... یہ..... کیا کر رہے ہو.....“ میں چلایا۔

”مجھ سے جھوٹ بولا..... تمہیں کیسے پتا ہے کہ میرا نام پیر سانول ہے“ وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

میرا دل چاہا کہ اپنے سر میں اینٹ دے ماروں خواہ اس کا نام زبان سے نکل گیا تھا اس کا اعتراض بھی ٹھیک تھا کہ اگر واقعی میں اسے نہیں جانتا اور زندگی میں پہلی دفعہ مل رہا ہوں تو مجھے اس کا نام کیسے پتا چلا۔ میں سمجھ گیا کہ اب کوئی بات چھپانے کا فائدہ نہیں اس لئے اس کے مزید کچھ پھونکنے سے پہلے چپ کر کہا۔

”پیر سانول پہلے میری بات سن لو..... میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیتا ہوں۔“

میری آواز سنتے ہی اس نے کوتر کے خون کی طرح سرخ آنکھیں کھولیں اور مجھے گھور۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ لے کئے اور میری گردن جکڑی میں بستر پر لوٹیاں لینے لگا بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے میں اپنی گردن بھی چھڑانے سے قاصر تھا میرا سانس رکنے لگا مجھے یوں لگا جیسے میں مر جاؤں گا اس کیفیت میں مجھے آدھا منٹ گزر گیا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہوتا اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ ہٹائے۔ آکسیجن میرے پیچھے ہٹنے تک پہنچی تو گویا مجھ میں دوبارہ سے جان پڑ گئی۔ میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

”بولو..... کون ہو تم..... اور یاد رکھنا اب اگر جھوٹ بولا تو تمہاری کھوپڑی بھی ان ہی کھوپڑیوں میں شامل کر دوں گا جو تم نے صحن میں دیکھی ہیں۔“

”م..... میں بالکل سچ بولوں گا خدا کے لئے مجھے ان رسیوں سے تو نکالو“ میں نے التجائی۔

ہر گز نہیں..... یہ رسیاں تمہارے گوشت میں اس وقت تک پیوست رہیں گی جب تک تم ہتا نہیں دیتے کہ تم کون ہو؟“ اس نے کھا جانے والے انداز میں کہا اور میری زبان جواب دے گئی۔ میں پوری قوت سے چلایا۔

”پیر سانول..... میں چک مو من گ ب والے سلطان کا پتر ہوں -----“

”کیا؟“.....

یہ سنتے ہی پیر سانول ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کافی دیر تک بے یقینی کی کیفیت میں مجھے دیکھتا رہا۔ میں تذبذب کے عالم میں تھا پتا نہیں اب وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے ویسے بھی جہاں تک میری معلومات تھیں کہ میرے باپ نے کوئی منتر زائد پڑھ دیا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی تھی اس لحاظ سے تو پیر سانول کو میرا شکر گزار ہونا چاہئے تھا کہ میرا باپ اس کے کالے اور مخصوص علم کی پیروی میں جان سے گزر گیا تھا۔

”تم چک مومن گب سے آئے ہو ناں؟“ پیر سانول نے تصدیق چاہی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن تم شہر کیسے آ گئے، تمہارے باپ کی زمینیں تو گاؤں ہی میں تھیں۔“

پیر سانول کی بات سن کر میں نے بے چارگی سے اپنے جسم کی طرف دیکھا وہ بھی شاید میری مصیبت سمجھ گیا تھا اس لئے فوراً میری طرف ہاتھ کر کے کچھ پڑھا اور مجھ پر پھونک ماری۔ اگلے ہی لمحے میرے جسم سے تمام نشانات اور تکلیف پہنچانے والے تمام لوازمات غائب ہو چکے تھے اور میں پورے جسم میں نہایت طمانیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا“ پیر سانول نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”کک..... کون سی بات“ میں گھبرا گیا۔

”یہی کہ تم شہر کیسے آئے۔“

”میں شہر کیسے آیا؟“ میں نے اس کا جملہ زیر لب دہرایا اور ایک گہرا سانس لیا پتا نہیں مجھے طلسمہ کے بارے میں بتانا چاہئے تھا کہ نہیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا جھوٹ میرے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ٹھیک ٹھیک صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے میں نے کہا۔

”پیر سانول! میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا قسمت نے اگر ہمیں ملا ہی دیا ہے تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ تمہارے کالے علم نے میرے خاندان کو کس طرح تباہ کیا کس طرح میری ماں اور میرا باپ میری آنکھوں کے سامنے سسک سسک کر مر گئے، کس طرح گاؤں والوں نے مجھے گاؤں بدر کیا، کس طرح میرے سگے چاچا کے گھر میں مجھ پر ظلم ڈھائے گئے کس طرح تمہارے کالے علم کی پیدوار طلسمہ نے مجھ سے زندگی کا لطف چھینا.....“ میں بے اختیار رو پڑا۔

پیر سانول خاموش کھڑا بڑی توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس نے مجھے چپ کرانے کی کوشش بھی نہیں کی میں دو تین منٹ تک سسکیاں لیتا رہا ماں باپ کا ذکر مجھ پر ہمیشہ ایسی ہی کیفیت طاری کر دیا کرتا تھا۔ کافی دنوں بعد آنسو بہائے تھے، یوں لگا جیسے دل کا سارا ابر آلود مطلع صاف ہو گیا ہے میں نے قمیض کے پلو سے آنکھیں صاف کیں اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پیر سانول کو اب تک کے گزرے ہوئے تمام واقعات بتانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ طلسمہ کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ پیر سانول کو گزشتہ واقعات سناتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں دوبارہ اسی دور سے گزر رہا ہوں کہانی کے آخری موڑ پر پہنچتے پہنچتے پیر سانول کی آنکھوں میں نمایاں طور پر اضطراب نظر آنے لگا تھا وہ بار بار ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ کس طرح

میں بھوسے کی ٹرائی میں چھپا قبرستان میں ہونے والی ساری کارروائی دیکھتا رہا تھا..... میرا بیان ختم ہوا تو کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ کافی دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔ صرف تیز تیز سانسوں کی آواز آتی رہی۔ ماحول پر عجیب سی وحشت طاری ہو گئی تھی میری کہانی ختم ہوتے ہی پیر سانول نے آنکھیں موند لیں تھیں اور کافی دیر تک اسی عالم میں رہا مجھے یوں لگا جیسے وہ مراقبے میں ہے اسے گرد و پیش کی بالکل بھی ہوش نہیں۔ میں اسے بلانا چاہتا تھا لیکن ڈر رہا تھا کہ کہیں میری یہ خلل اندازی اس کو مشتعل نہ کر دے تقریباً دس منٹ تک اسی عالم میں رہنے کے بعد اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور میں خوفزدہ ہو گیا۔

اس کی آنکھیں حسب سابق کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں مجھے یوں لگا کہ وہ پیر سانول نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کوئی اور ہی مخلوق ہے میرا خیال تھا کہ وہ مجھے مخاطب کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ پانچ منٹ بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں سکون آچکا تھا اس نے طویل خاموشی کے بعد اپنے لب کھولے۔

”طلسمہ جب تمہارے اندر آتی ہے تو کیا محسوس کرتے ہو؟“

میں کانپ کر رہ گیا۔ ”ایسا لگتا ہے..... ایسا لگتا ہے جیسے پورا جسم بھٹی کی آگ میں دھک رہا ہو، ایسا لگتا ہے..... ایسا لگتا ہے جیسے لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے جسم کا کونا کونا داغا جا رہا ہے لیکن یہ کیفیت صرف کچھ دیر کے لئے ہوتی ہے۔“

”کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ تم نے آگ پر پکی ہوئی چیز کھائی ہو اور طلسمہ تمہارے اندر نہ آئی ہو؟“ پیر سانول نے سوال کیا اور میں نے نفی میں سر ہلادیا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد طلسمہ نے کبھی مجھے معاف کیا ہو..... لیکن..... اچانک میرے ذہن میں ایک جھپکا سا ہوا..... مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب سائیں نے میرے سامنے لذیذ کھانے کے ڈھیر لگا دیئے تھے اور اسے کھانے کے باوجود طلسمہ مجھ میں نہیں آئی تھیں۔ میں نے فوری طور پر یہ بات پیر سانول کو بتائی وہ چونک اٹھا۔

”وہ کھانا کہاں سے آیا تھا؟“

”سائیں نے جادو کے زور سے منگوایا تھا۔“

”اوہ.....“ پیر سانول کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ”یعنی اس کا مطلب ہے کہ طلسمہ جادوئی کھانا

کھانے پر تمہارے اندر نہیں آتی۔“

”واقعی.....!!“ میں کھل اٹھا میرے ذہن میں یہ خوشگوار خیال کروٹیں لینے لگا تھا کہ پیر سانول

کی مدد سے کم از کم میں جادوئی کھانا تو کھا سکتا تھا شاید پیر سانول بھی میری خوشی سے میرا

مقصد سمجھ گیا تھا اس لئے فوراً بولا۔

”یاد رکھو! جادوئی کھانا جتنا مرضی کھا لو..... تمہاری بھوک نہیں مٹے گی۔“

”تو پھر؟.....“ میں پریشان ہو گیا۔

”فکر کرنے کی ضرورت نہیں..... طلسمہ سے نشئنہ کے لئے ہمیں کوئی مضبوط لائحہ عمل تیار

کرنا ہو گا تم شاید نہیں جانتے کہ طلسمہ کتنی بڑی چیز ہے وہ اتنی آسانی سے قابو نہیں آئے گی

لہذا جب تک ہم کسی ٹھوس نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے تم صرف پھل کھاؤ گے۔“

”لیکن کب تک..... میں روٹی کو ترس گیا ہوں۔“

”تم روٹی کو ترس رہے ہو اور وہ تمہاری موت کو ترس رہی ہے..... احمق مت بنو! وہ تمہیں

بار بار ایسے روپ دے رہی ہے کہ جس میں تم اتفاقی طور پر کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہو کر

موت کی بھیٹ چڑھ جاؤ راز غور کرو کہ چوہا بننے کے بعد اگر کوئی بلی تمہیں کھا جاتی یا تم چوہے

دان میں پھنس جاتے تو پھر؟ پینگر بننے کے بعد اگر کوئی تمہیں توڑ دیتا تو پھر..... لڑکی بننے

کے بعد تمہیں اغوا کر کے مار دیا جاتا تو پھر؟..... میں تم سے زیادہ ان جنات کی چالاکیوں کو

سمجھتا ہوں، یہ قوم مارتی کم اور خوفزدہ زیادہ کرتی ہے۔ اکثر لوگ اسی خوف کا شکار ہو کر مرتے

ہیں جنات کبھی خود سے کسی کو نہیں مارتے بلکہ ایسے اسباب پیدا کر دیتے ہیں کہ انسان خود بخود

موت کے پنجوں میں جکڑا جاتا ہے۔ طلسمہ بھی تمہیں موت کی طرف گھسیٹ رہی ہے۔ اس

سے بچو..... جتنا ہو سکتا ہے بچو..... میں اس لئے تم سے ہمدردی کر رہا ہوں کہ تم میرے

مرید کے بیٹے ہو، طلسمہ ایک طوفان کا نام ہے جسے صرف تم قابو کر سکتے ہو۔“

”میں..... لیکن کیسے؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔ ”تم شاید نہیں جانے کہ تمہارے باپ نے کالے علم کی آخری حدوں کو بھی پھلانگ لیا تھا۔ طلسمہ پر قابو پانا کوئی آسان بات نہیں میں چالیس سال سے کالا علم کر رہا ہوں لیکن طلسمہ کو آج بھی حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ طلسمہ بدی کی وہ قوت ہے جو اگر قابو میں آجائے تو پھر دنیا بدل کے رکھ سکتی ہے تم کالے جادو کو نہیں جانتے ورنہ طلسمہ کی اہمیت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے۔ یوں سمجھ لو کہ طلسمہ جنات کے باغی گروہ کی وہ پراسرار دیوی ہے جو کبھی کسی کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتی، لیکن..... تمہارے باپ کے جنوبی پن نے اسے بھی قابو کر ہی لیا۔ بد قسمتی سے اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اس پر قابو نہ رکھ سکا اور یہی طلسمہ اس کی بربادی کا باعث بن گئی چونکہ تمہارے جسم میں تمہارے باپ کا خون ہے اس لئے طلسمہ تمہیں جان سے نہیں مار سکتی۔ میں یہ موقع ہاتھ سے گنونا نہیں چاہتا۔ مجھے پتہ ہے کہ طلسمہ کا اب قابو میں آنا ناممکن ہے لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ طلسمہ کا مکمل خاتمہ کر دو تو ایسا کرنا میری مدد کے بغیر ناممکن ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے شدید نفرت ہوگی آخر تمہارا باپ میرے علم کی وجہ سے ہی مرا ہے۔ لیکن..... یاد رکھو..... طلسمہ کو کھلی آزادی مل گئی تو پھر وہ پوری دنیا کے لئے بربادی کا پیغام بن کر آئے گی، اسے روک لو..... یہ تمہارے اختیار میں ہے۔“

”مم..... مجھے کیا کرنا ہوگا؟“..... میں بے اختیار بولا میرا جملہ سنتے ہی پیر سانول کے چہرے پر ایک خبیث سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”جو میں کہوں گا وہی کرنا ہوگا۔“

”کیا؟“

”کچھ زیادہ..... نہیں چند چلے، چند عملیات..... اور چند منتر.....۔“

”یعنی کالا جادو؟“ میں دہل گیا۔

”ہاں“

نہیں..... یہ مجھ سے نہیں ہوگا“ میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”سائیں مجھ سے یہی چاہتا تھا لیکن میں نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ میں ہرگز وہ عمل نہیں کروں گا جس کی وجہ سے میرا خاندان تباہ ہوا ہے۔“

”تم غلطی پر ہو..... تمہارا خاندان تمہارے باپ کی غلطی کی وجہ سے تباہ ہوا ہے اور اب تمہاری غلطی کی وجہ سے لاکھوں بے گناہ انسان مر رہے گے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ طلسمہ کے وجود کو حرارت مل چکی ہے ٹھیک ایک سال بعد وہ تبت کی مدھوپہاڑی پر دوبارہ جنم لے گی۔ اور اگر اس کا یہ جنم مکمل ہو گیا تو..... تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گی، طلسمہ قہر و غضب بن کر ہر چیز کو نیست و نابود کر دے گی تمہیں کالا علم انسانیت کی بربادی کے لئے نہیں بھلائی کے لئے سیکھنا ہے“ پیر سانول نے میرا کندھا ہلایا اور میں منہ میں پڑ گیا۔

اس کی باتوں نے حقیقتاً مجھے پریشان کر دیا تھا میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اقرار کرتا تو دل نہیں مانتا تھا انکار کرتا تو حالات ہی بدل جاتے۔

”کچھ اور سوچنے کی بجائے صرف یہ سوچو کہ کیا طلسمہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے“ پیر سانول کی آواز مجھے کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے پتا نہیں کیسا مرحلہ تھا یہ کیسی آزمائش تھی۔ میں خود کو ہر لحاظ سے بے بس محسوس کر رہا تھا۔ تقدیر میرے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ایسے ایسے گھن چکروں میں پھنسانے چلی جا رہی تھی جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہیں یہ بھی پیر سانول کی کوئی چال ہی نہ ہو۔ لہذا پوچھا۔

”کیا تم مجھ سے محض ہمدردی کی بنا پر سب کر رہے ہو؟“

پیر سانول ہنسا۔ ”میں تمہارے دماغ کی داد دیتا ہوں میرا خیال ہے جس طرح تم نے مجھ

سے کچھ نہیں چھپایا مجھے بھی تم سے کچھ نہیں چھپانا چاہئے..... سنو! میں طلسمہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، سائیں بھی یہی چاہتا تھا اگرچہ میں نے اسے مکمل یقین دلایا تھا کہ طلسمہ اسے مل جائے گی لیکن میں جانتا تھا کہ سائیں ابھی اس مقام تک نہیں پہنچا کہ طلسمہ اس کے سامنے ہار مان لے۔ میری مجبوری تھی کہ مجھے سائیں کو ساتھ رکھنا تھا اسی لئے اسے آس دلائے رکھی، سائیں کے ساتھ ساتھ اس کا دوست دلاور بھی یہ علم سیکھنے پر بضد تھا۔ پتا نہیں لوگ کالے علم کو اتنا آسان کیوں سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ علم رگوں سے خون تک پنچوڑ لیتا ہے۔ بہر حال سائیں اور دلاور اپنی نا تجربہ کاری کے ہاتھوں مار کھا گئے، یہی کچھ تمہارے باپ کے ساتھ بھی ہوا تھا اب صورتحال بہت مختلف ہے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔ ہمارے مقاصد مختلف مگر راستے ایک ہیں۔ تم بھی طلسمہ تک پہنچنا چاہتے ہو اور میں بھی فرق صرف اتنا ہے کہ تم اسے مارنا چاہتے ہو جب کہ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”فرض کیا تم اسے حاصل کر لیتے ہو اور زندگی میں وہ کبھی تمہارے ہاتھ سے پھر نکل جاتی ہے..... تو پھر!“ میں نے ممکنہ خطرے کے پیش نظر دل کی بات اگل دی۔ سائیں سنجیدگی سے بولا۔

”اول تو یہ ممکن ہی نہیں کہ طلسمہ میرے قبضے سے نکل سکے اور اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی ہے تو تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ پھر تم اس کا شکار نہیں ہو گے۔“

لیکن اس سارے عمل کے لئے میرا کالا جادو سیکھنا کیوں ضروری ہے؟“ میں نے جرح کی۔ ”اس لئے کہ اس منصوبے کے دوران ہم پر جنات کی طرف سے طرح طرح کے حربے خوفزدہ کرنے کے لئے آزمائے جائیں گے، میں تو اپنے آپ پر قابو پالوں گا لیکن تم نے اگر کالا علم نہ سیکھا تو یہ مخلوق تمہارے درپے ہو جائیگی اور قسم شیطان دیو تا کی تم ان کا دار نہیں سہہ سکو گے“

”میرے پاس قرآنی علم ہے“ میں نے فخر سے کہا۔

یہ سنتے ہی پیر سانول نے بلند آواز سے قہقہہ لگایا۔ میں ناگواری سے اسے دیکھنے لگا۔ سچی بات ہے کہ مجھے اس وقت اس کا یہ قہقہہ بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔

”قرآنی علم.....“ اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”تمہیں پتا ہے کہ ہم لوگ اس وقت شیطانی علم پر عبور حاصل کرتے ہیں جب پوری طرح شیطان کی پیروی کرتے ہیں اس کی اطاعت کرتے ہیں، اس کا حکم مانتے ہیں..... لیکن تم لوگ خدا سے بے بہرہ ہو کر اپنی عبادتوں سے غافل رہ کر بھی محض لفظی بناوٹوں سے اپنے اللہ کو خوش کئے رکھتے ہو..... میں ایک طویل عرصہ کالے علم میں گزار چکا ہوں اور میرا تجربہ ہے کہ سارے کا سارا علم قرآن کے ایک لفظ کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا لیکن ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ تم لوگ قرآن سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جا رہے ہو۔ تمہاری قرآن سے اسی دوری نے شیطان دیوتا کو یہ ہمت عطا کی ہے کہ وہ ہم جیسوں کو بدی کی طاقت سے نواز رہا ہے۔ شیطان دیوتا اپنا علم دنیا کے ہر خطے تک پہنچائے گا۔ اسے ایسے معاشرے اور ایسے لوگوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے جو خدا کی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہوئے اس کے پاس آجائیں..... نورے!..... ہو سکتا ہے جنات کو دیکھ کر تمہیں قرآنی آیات بھول جائیں لیکن مجھے اپنے منتر نہیں بھولیں گے..... اپنے دل کو ٹٹولو..... دیکھو کہ اس میں صرف باتیں ہی بھری ہوئی ہیں یا خدا کی تعلیمات کا کوئی عملی رنگ بھی شامل ہے.....“ پیر سانول نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔

میں نے تصور کی آنکھ سے اپنے اندر جھانکا مجھے ہر سمت تاریکی ہی تاریکی نظر آئی میں نے گردن جھکالی۔

”اسی لئے تو کہتا ہوں کہ کالا علم سیکھو..... کالا علم نہیں سیکھو گے تو طلسمہ تک نہیں پہنچ سکو گے اور اگر طلسمہ تک نہیں پہنچ سکو گے تو مارے جاؤ گے اور اگر مر گئے تو اپنے ماں باپ کی موت کا انتقام کس سے لو گے..... ان کی موت میرے ہاتھوں نہیں طلسمہ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ طلسمہ نے تمہارا خاندان اجاڑا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اسے نیست و نابود کر دو تھوڑی سی ہمت کرو اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ دو، زہر کو مارنے کے لئے زہر ہی لایا جاتا

ہے۔ طلسمہ ایک زہر ہے تم بھی کالے علم کے زہر سے اس کا تریاق کرو۔۔۔۔۔ بدلہ لو۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔ میرے ہاتھوں میں ہاتھ دو۔۔۔۔۔ وہ چیخ رہا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اپنے اندر ایک ہلچل سی محسوس کی میرا پورا جسم ٹوٹنے لگا تھا۔ بلاشبہ پیر سانول کی باتوں میں سحر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا باپ اور میری ماں شکایت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں کہ میں نے ابھی تک طلسمہ سے ان کی موت کا بدلہ کیوں نہیں لیا میرا پورا وجود نفرت کے شعلوں سے بھڑکنے لگا۔ طلسمہ کی موت کا جنون میرے دل و دماغ پر حاوی ہوا جا رہا تھا۔ میں نے جادوئی انداز میں ہاتھ اٹھا کر پیر سانول کے ہاتھوں میں دے دیا اور کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں کالا علم سیکھوں گا“

یہ صورتحال اتنی غیر یقینی تھی کہ پیر سانول جیسا گھاگ انسان بھی کچھ دیر تک حیران کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ غالباً اسے اپنی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں پیر سانول کے گندے وجود سے دنیا کو پاک کرنا چاہتا تھا۔ لیکن طلسمہ کا خاتمہ بھی ضروری تھا۔ ان حالات میں درمیانی راستہ یہی ہو سکتا تھا کہ جو میں نے اپنایا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں پیر سانول کے ذریعے طلسمہ تک پہنچوں اور طلسمہ کے خاتمے کے ساتھ ہی پیر سانول کا خاتمہ بھی کر دوں مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ پیر سانول کی موت کا آسان راستہ کون سا ہوگا، کالا جادو کرنے والا یہ شیطان یقیناً اپنی حفاظت کے سلسلے میں اتنا بے خبر نہیں ہوگا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے علم اور کړتوتوں کی گہرائی تک جائے بغیر میں کوئی بھی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکوں گا اور اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی تو میری جان تو جائے گی ہی لیکن پیر سانول کے کالے کړتوت اور بھی زور پکڑ جائیں گے۔

پیر سانول نے بغور میرا جائزہ لیا، اس کی آنکھوں میں تحسین کے آثار تھے۔

”تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے بہت جلد تمہیں احساس ہوگا کہ یہ فیصلہ تمہیں بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔“

”پیر سانول میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے، تمہارے کہنے سے ہو سکتا ہے مجھے اتنا

اثر نہ ہوتا لیکن میں اس لئے بھی یہ عمل سیکھنا چاہتا ہوں کہ اب مجھ سے دنیا میں مزید تکلیفیں نہیں اٹھائی جاتیں، میں بھی ایک شاندار زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں، میں نے ساری زندگی اچھی چیزوں کے خواب ہی دیکھے ہیں، اب میں انہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھے دو اہم انتقام لینے ہیں، ایک اپنی چاچی سے اور دوسرا طلسمہ سے“

پیر سانول کی آنکھوں میں چمک لہرائی ”ہاں ہاں..... تم ضرور لو گے یہ انتقام..... میں تمہیں ان سب پر حاوی کر دوں گا، یہ سب تمہارے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے اور تم دیکھنا کہ تمہارے ہاتھ کے ایک اشارے سے کیسے یہ لوگ ترپنے لگ جائیں گے“

میں خاموشی سے پیر سانول کی باتیں سنتا رہا۔ اس روز اس نے مجھے تفصیلی طور پر سمجھایا کہ کالے علم کے حصول کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا، اس نے مجھے بتایا کہ مجھے زیادہ تر قبرستان میں اس کے ساتھ رہنا ہوگا تمام چلوں کو انتہائی دھیان سے دیکھنا ہوگا اور سب سے پہلے اپنے خوف پر قابو پانا ہوگا۔ پیر سانول نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں نماز کے قریب بھی نہ جاؤں۔ میں نے دل میں اپنی بد قسمتی پر غور کیا کہ میں پہلے کہاں نماز پڑھتا تھا کبھی کبھی جمعہ کی یا پھر عید کے عید لیکن اب اس پر بھی دھیان رکھنا ضروری تھا۔ پیر سانول کے ہاں رہتے ہوئے مجھے پانچ روز گزر گئے تو اس نے مجھے عملی کام کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا، مجھے سب سے بڑی سہولت جو میسر تھی وہ یہ تھی کہ میں مزے مزے کے آگ پر پکے ہوئے کھانے کھا سکتا تھا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ میری بھوک نہیں مٹی تھی کالے علم کے زور سے آئے ہوئے بیسیوں نان اور گرم گرم کباب میں ہڑپ کر جاتا لیکن بالکل ایسے لگتا جیسے ہدیوں کا بھوکا ہوں، پیر سانول بھی میری اس کیفیت کو سمجھتا تھا اس لئے روزانہ ساتھ والی بستی سے تازہ پھل لے آتا جو میری بھوک مٹانے کے کام آتے میٹھے سے اکتا جاتا تو نمک لگا کر امرودیا مالٹے کھا لیتا۔ مسلسل پھل کھانے کی وجہ سے میرے چہرے پر عجیب سی سرخی دوڑنے لگتی تھی اگرچہ میرا وزن کچھ بڑھ گیا تھا لیکن اندرونی نقاہت ابھی بھی محسوس ہوتی تھی جو صرف روٹی کھانے سے ہی دور ہو سکتی تھی۔

میں پیر سانول کے معمولات کو بغور نوٹ کرتا جا رہا تھا، وہ روزانہ صبح چار بجے اٹھ کر انسانی خون سے نہاتا، یہ خون وہ پتا نہیں کہاں سے حاصل کرتا تھا مجھے اس نے یہی بتایا تھا کہ یہ جادوئی خون ہے لیکن پتا نہیں مجھے یقین کیوں نہیں آتا تھا۔ اگر واقعی یہ جادوئی خون تھا تو اسے لانے کیلئے پیر سانول کو شہر کیوں جانا پڑتا تھا ایسا خون تو وہ چنگی بجاتے میں بیٹھے بیٹھے حاضر کر سکتا تھا آخر میرا کھانا بھی تو اسی طرح آجاتا تھا۔ لیکن یہ سوال میں نے پیر سانول سے اس لئے بھی نہیں پوچھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ میں پیر سانول سے کسی بحث میں الجھ سکتا۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ دیکھنا تھا۔

صبح سویرے غسل کرنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں بنی قبر میں لیٹ جاتا اور ایک گھنٹے کے لئے سانس روک لیتا، اس عمل کے دوران اس کے منہ سے لایعنی آوازیں نکلتی رہتیں، میں نے کئی دفعہ دروازے کی درز سے جھانک کر دیکھا کہ پیر سانول کی آنکھیں بند ہیں اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ کمرے کے اندر گہری تاریکی چھائی ہوتی لیکن پیر سانول اور قبر صاف نظر آرہی ہوتی چونکہ کمرے کا دروازہ خاصی اونچائی پر تھا اس لئے قبر میں لیٹا پیر سانول بھی صاف نظر آتا تھا کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے اس کے جسم میں کوئی بدروح داخل ہو گئی ہے کیونکہ اس کی آنکھیں یکدم چوڑی ہو جاتی اور نتھنے پھیل جاتے، مجھے خوف محسوس ہوتا اور میں واپس پلٹ آتا۔

ناشتے میں پیر سانول عجیب عجیب سی مکروہ چیزیں کھاتا، میں ہر دفعہ گھبرا جاتا کہ کہیں پیر سانول مجھے بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لئے نہ کہہ دے لیکن خدا کا کرم ہوا کہ اس نے مجھ سے ایسی کوئی فرمائش نہ کی، ناشتے کے بعد وہ لمبا سا چونچہ پہن کر بغل میں ایک انسانی کھوپڑی دبا کر صحن میں آجاتا اور آسمان کی طرف رخ کر کے ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا اس کا یہ عمل بھی تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہتا۔ اس عمل کے دوران میں نے نوٹ کیا کہ تیز آندھی چلتی شروع ہو جاتی جو صرف اور صرف ہمارے گھر تک ہی محدود رہتی۔ پھر وہ باہر نکل جاتا اور رات گئے اس کی واپسی ہوتی۔ مجھ سے اس کی ملاقات بہت ہی کم ہوتی، میرا خیال

تھا کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جایا کرے گا لیکن وہ تو جیسے مجھ سے بالکل ہی لا تعلق سا ہو گیا۔ اگرچہ وہ میری نگرانی نہیں کرتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھ مکمل یقین تھا کہ میں اگر اس کی عدم موجودگی میں بھاگنا بھی چاہوں تو نہیں بھاگ سکوں گا۔

ایک روز میں نے اس کا تجربہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ اس روز سخت بارش ہو رہی تھی پیر سانول حسب معمول قبرستان گیا ہوا تھا میں اکیلا تھا، گھر کے دروازے پر صرف کنڈی لگی ہوئی تھی، میرے ذہن میں خیال آیا کہ کوشش کر کے دیکھنی چاہئے کہ کیا گھر سے باہر جایا جاسکتا ہے۔ میں کمرے سے باہر آیا، ادھر ادھر دیکھا اور صحن کی طرف بڑھا۔ بارش سے بچنے کے لئے میں نے اپنے اوپر پلاسٹک کا ایک تھیلا لے لیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ابھی کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ہوگی کہ مجھے دوبارہ کمرے میں جانا پڑے گا لیکن مجھے حیرانی ہوئی کہ دروازہ کھولنے تک مجھے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں نے بڑے آرام سے دروازہ کھولا اور باہر آگیا۔

گلی میں آتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، کیونکہ یہ گلی نہیں تھی بلکہ وہی کمرہ تھا جہاں سے میں باہر نکلا تھا میں نے دوبارہ کمرے سے باہر آکر بیر ونی دروازے سے باہر قدم نکالے..... لیکن میں پھر دوبارہ کمرے میں آگیا۔ ابھی تیسری دفعہ میں یہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دیوار پر سے ایک کالے سیاہ رنگ کا بلا اچھل کر میرے سامنے آ موجود ہو اور غرا کر انسانی آواز میں بولا!

”تیری رگوں سے خون نچوڑ لوں گا، جاندر چلا جا.....“ اس کی یہ بات سنتے ہی گھر میں موجود ہر چیز ہنسنے لگی، فرش پر بکھری کھوپڑیاں، دروازے کی کنڈی، چارپائی، میز، برتن..... میرے رگ و پے میں خوف کی سرسراہٹ دوڑنے لگی اور میں تیزی سے واپس ہو گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی سارا ماحول پہلے کی طرح ہو گیا، یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ میں چارپائی پر گر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ گویا پیر سانول کو ابھی تک مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کی اس حرکت نے مجھے ایک عجیب سے وسوسے میں ڈال دیا تھا میں کالا علم سیکھنے کی حامی تو بھر بیٹھا تھا لیکن

اب مجھے خیال آرہا تھا کہ اگر اس نے مجھے چلہ کاٹنے کے لئے کہا اور میں نے چلہ غلط کاٹ دیا تو یہ عمل بھی تو موت ہی ہو گا میں سائیں اور دلاور کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور قطعاً اس اذیت ناک موت سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ اتنے دن ہو گئے تھے لیکن طلسمہ نے مجھ پر کوئی وار نہیں کیا تھا۔ میں اپنے طور پر سمجھا کہ پیر سانول کے گھر میں وہ مجھ پر کوئی وار نہیں کر سکے گی اور شاید یہ سچ بھی تھا پیر سانول بھی اسی کی طرح شیطان کا پجاری تھا اور شیطان کے پجاری ایک دوسرے کے سامنے جانے سے اکثر گھبراتے ہیں۔

جب مجھے پیر سانول کے گھر میں رہتے ہوئے بیس دن سے اوپر ہو گئے تو ایک روز اس نے مجھے بلایا اور اپنے سامنے بٹھالیا۔

”نورے! آج میں تمہیں کالے علم کی بنیادی تربیت کے بارے میں بتاؤں گا اگر اس دوران کوئی سوال تمہارے ذہن میں آئے تو تم بلا جھک پوچھ سکتے ہو، میری باتیں تمہیں نہایت توجہ سے سننا ہو گی کیونکہ انہی کی بنیاد پر تم کالے علم کے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچو گے“

پیر سانول آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، رات کے گیارہ بجنے والے تھے اس نے ہیٹر بند کر دیا اور آتش دان کی طرف ہاتھ کر کے پھونک ماری ایک دم ساری لکڑیاں جل اٹھیں اور کمرے کا ماحول اور بھی خوفناک ہو گیا۔ میں نے پیر سانول کی طرف دیکھا اس کے ہونٹ ہلے.....

”جادو..... ایک خوفناک حقیقت ہے، شیطان کو خدا نے چھوٹ دی ہے۔ بدی کی طاقت اپنی پوری توانائی کے ساتھ دنیا میں سرگرم عمل ہے کروڑوں سال پہلے جب جادو نے اپنی تباہ کاریوں سے بستیاں اجاڑنا شروع کیں تو شیطان کے پجاریوں نے ان تباہ کاریوں کو مزید ہولناک بنانے کے لئے برسوں کی ریاضت کے بعد ایک ایسا علم تیار کرنے کا سوچا جو پچھلے تمام جادوؤں کا توڑ ہو، جو ہر علم پر دسترس پا جائے جو اپنی سیاہ کاریوں اور تباہ کاریوں میں بے مثال ہو، جو سر بلع الاثر ہونے کے ساتھ ساتھ طویل المعیاد بھی ہو، جس کا اثر سات سمندر پار بھی اثر دکھائے جو بدی کی طاقت کا سرچشمہ ہو..... جس کے اندر طوفان بھرا ہو۔ تم شاید نہ جانتے

ہو کہ جادو کیا چیز ہے تمہاری مہذب دنیا یعنی آج کی ماڈرن دنیا میں اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں جس طرح تم لوگ ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتے ہو اور بغیر تار کے بھی ٹی وی خود بخود آن ہو جاتا ہے اسی طرح جادو بھی اپنی فریکوئنسی پر عمل کرتا ہے۔
 ”یہ کیا ہوتی ہے“ میں نے پوچھا۔

”فریکوئنسی وہ غیر مرئی قوت ہے جو ہوا میں اپنی سمت طے کرتی ہے، سادہ سی مثال سے یوں سمجھ لو کہ جیسے گلوکار ہارمونیم کے سر کے ساتھ اپنی آواز ملاتے ہیں اور ہماری اور ہارمونیم کی آواز کے ساتھ مل جاتی ہے اب آواز بذات خود کوئی وجود نہیں رکھتی لیکن گلوکار اور ہارمونیم کی آواز کا اتار چڑھاؤ نہیں ایک دوسرے میں مدغم کر دیتا ہے یعنی دونوں کی فریکوئنسی مل جاتی ہے۔ یہی حال جادو کا ہوتا ہے، تم نے سنا ہو گا کہ پرانے زمانے کے گویے راگ گاکر بارش برسا دیتے تھے اور آگ لگا دیتے تھے آج کل کے لوگ اس بات کو حقیقت نہیں سمجھتے حالانکہ یہ بالکل درست ہے، راگوں کی فریکوئنسی مل جائے تو ایسا ممکن ہے جادو میں بھی دو اہم چیزیں ہوتی ہیں، ایک منتر، ایک تعویذ، منتر وہ ہوتا ہے جو منہ سے بولا جاتا ہے اور تعویذ وہ جو لکھ کر استعمال کیا جائے۔ یہ دونوں اپنی اپنی مختلف صورتوں میں مختلف اثر رکھتے ہیں۔ تاہم منتر کا اثر زیادہ تیزی سے ہوتا ہے۔ منتر اصل میں وہ جملے ہوتے ہیں جو جنات یا دوسری ہوائی مخلوق کے ذریعے کام کروانے کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ مافوق الفطرت چیزوں کی کمزوریوں کو مد نظر رکھ کر وجود میں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کو انسانوں سے بڑھ کر طاقت تو دی ہے لیکن ان کی دنیا بالکل ہی الگ رکھی ہے۔ چونکہ شیطان بھی جنات کی نسل میں سے ہے اس لئے اس نے کالے علم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا منتر کی۔ منتر زبانی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اکثر ایسی چیزوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے جو سامنے نہیں آتیں یا بے وقت سامنے آ جاتی ہیں ایسی چیزوں اور مرحلوں کے لئے شیطان کی پجاریوں نے شیطانی تعویذ کا سلسلہ شروع کیا۔ تعویذ اسلامی بھی ہوتے ہیں لیکن انکا ذکر اس لئے نہیں کروں گا کہ اسلام سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں.....“

پیر سانول کی یہ بات سنتے ہی میں نے کمرے کی دیواروں پر نظر ڈالی اور حیرت سے پوچھا، ”تم کہتے ہو کہ تمہارا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں تو پھر کمرے میں یہ قرآنی آیتیں کیوں لٹکا رکھی ہیں؟“

میری بات سن کر پیر سانول کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری..... ”تو تم نے غور نہیں کیا“

”کیا؟؟؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”یہی کہ یہ آیتیں یہاں کیوں موجود ہیں، غور سے سنو! یہ آیتیں ہیں تو قرآن ہی کی لیکن قرآن میں موجود آیتوں سے تھوڑی بہت مختلف بنادی گئی ہیں۔ کالا علم کرنے والے ایسا نہ کریں تو وہ بدی کی قوتیں حاصل نہیں کر سکتے“

”نعوذ باللہ..... میرا دل ڈول گیا۔ وہ میری توقع سے بھی بڑا شیطان ثابت ہو رہا تھا۔ میں اس کی بات سمجھ گیا تھا قرآن کی آیتوں میں تبدیلی کر کے وہ جو کچھ کر رہا تھا اس کا انجام بھی مجھے نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی بربادی کی دعا مانگی۔

پیر سانول نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی بات شروع کی.....

”جب جادو کا سلسلہ شروع ہوا تو جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ ایک ایسے جادو کی ضرورت محسوس ہوئی جو سب پر حاوی ہو جس دور کی میں بات کر رہا ہوں وہ سارے کا سارا جادو گروں کا تھا۔ کالا علم بے شمار مصائب و مشکلات اور کروڑوں خون کی ندیاں بہانے اور ہر لحاظ سے شیطان کو اپنا سب کچھ بنالینے کے بعد عملی شکل میں سامنے آیا۔ یہ علم افریقہ میں اپنی پوری اصلیت کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اگر تم نے سنا ہو تو یاد کرو کہ وہاں کے وچ ڈاکٹر اصل میں کالے علم کے ماہر ہوتے ہیں۔ افریقہ چونکہ پر اسرار جنگلوں کی سرزمین ہے اسی لئے وہاں کے اسرار بھی خالص ہیں۔

”تو کیا جادو افریقی زبان میں بھی ہوتا ہے“ میں نے بے تابلی سے پوچھا۔

”جادو کسی بھی زبان میں ہو سکتا ہے لیکن افریقہ والے اس علم میں لکیروں سے کام لیتے ہیں وہ

لکیروں کو بھی آواز کی شکل میں بولتے ہیں“
”وہ کیسے“

وہ ایسے کہ چھوٹی لکیر کو ”سایم ایم“ اور بڑی لکیر کو ”سایلیا“ کہتے ہیں، منتر کی زبان میں گولائی کو ”ہوراث“ اور چوکور کو ”باباسواٹ“ کہا جائے گا۔ مختلف علاقوں میں اس کا تلفظ مختلف ہے خیر یہ ضمنی باتیں ہیں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ کالا علم اس لئے بھی زیادہ خطرناک ہو گیا کہ اس میں شیطانی قوتوں کو قابو میں لانا ہوتا ہے۔ اکثر جنات بڑے سر پھرے ہوتے ہیں تم نے سائیں اور دلاور کا انجام بھی دیکھا ہے، یہ مخلوق انتقام پر اتر آئے تو بہت دردناک موت دیتی ہے، لیکن اس کو قابو میں رکھنے کے بھی طریقے ہیں“

”اگر یہ اتنی دردناک موت دیتے ہیں اور اتنے خطرناک ہیں تو لوگ ان کو قابو کرنے کا جنون چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نورے! تمہاری دنیا میں روزانہ بسوں اور ویکنوں میں بم دھماکے ہوتے ہیں لیکن کیا کبھی ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان میں سفر کرنا چھوڑ دیا ہو..... سب کو پتا ہے کہ اگر وہ گاڑی تیز چلائیں گے تو ان کی موت بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ چلاتے ہیں، ہر کوئی جانتا ہے کہ ہوائی جہاز ہوا میں کام کرنا چھوڑ دے تو نتیجہ موت ہے لیکن دیکھ لو کروڑوں لوگ روزانہ جہازوں میں سفر کرتے ہیں..... یہی حال کالے علم کا بھی ہے ہر چیز جو نقصان رکھتی ہے، فائدہ بھی دیتی ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کے سارے کام گھر بیٹھے سدھر جائیں، دنیا اس کے پیچھے آئے وہ ساری دنیا پر حکومت کرے اس کے ایک اشارے پر نوٹوں کے ڈھیر لگ جائیں، لوگ جھک جھک کر اسے سلام کریں۔ حکمرانی اور طاقت کا نشہ ہی انسان کو کالے جادو کی طرف راغب کرتا ہے..... اب میری بات جاری رہنے دو!“

جنات انسان کے قابو میں آجائیں تو بظاہر دوست بن کر رہتے ہیں لیکن ان کی ہر لمحہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اس کے چنگل سے نکل جائیں، یاد رکھنا لوگوں میں ایک بات مشہور ہے کہ کالا علم کرنے والے کے ہاں لڑکا نہیں ہوتا، یہ غلط ہے، لڑکا ہوتا ہے، تمہاری

مثال سامنے ہے، تمہارا باپ بھی تو کالا علم کرتا تھا ناں لیکن شاید لوگ یہ نہیں جانتے کہ کالا علم کرنے والے کے ہاں لڑکا کس صورت میں ہوتا ہے، میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارا باپ کالے علم میں اس حد تک آگے چلا گیا تھا کہ اس نے تمہاری صورت میں ایک بیٹا بھی حاصل کر لیا۔ تمہارا باپ ارادوں کا پکا تھا ایسے مضبوط اعصاب کے لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں، جنات کو دیکھنا اور ان کی حرکتوں کو برداشت کرنا معمولی دل گردے کے آدمی کا کام نہیں بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ یہ ہوائی مخلوق اپنے اندر اتنی دہشت اور خوف رکھتی ہے کہ عام بندہ تو شائد ان کی شکل بھی نہ دیکھ سکے۔ تمہارا باپ میرے چیلوں میں وہ واحد شخص تھا جو نہایت محنت کے ساتھ کالا علم سیکھا کرتا تھا۔ جن دنوں اس کی شادی قرار پائی تھی میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ شادی مت کرو، جنات تمہیں تو کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن تمہاری اولاد اور تمہاری بیوی ان کے شر سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے، لیکن تمہارا باپ اپنے ارادوں کا پکا تھا کہتا تھا سارے چلے کاٹ چکا ہوں، کسی کو اپنی بیوی یا اولاد پر حاوی نہیں ہونے دوں گا لیکن جب تیرے باپ کی شادی ہوئی تو بیوی کی محبت نے اسے کالے علم سے خاصا دور کر دیا۔ یہی وہ دن تھے جب جنات نے اس کی غیر حاضری کو بری طرح محسوس کیا اور مختلف حوالوں سے اسے احساس دلایا کہ وہ ان کے پاس آیا کرے۔ ان ہی دنوں تیرے باپ نے ایک نیا چلہ میرے کہنے پر شروع کیا وہ اپنا تن من دھن حتیٰ کہ ایمان تک کالے علم کے حصول کے لئے پس پشت ڈال چکا تھا اسی لئے قرآن پاک کی بے حرمتی کا بھی مرتکب ہو تا رہا اس کے اس عمل نے اسے شیطان کی نظروں میں بہت معتبر بنا دیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ تیرا باپ اپنے مقصد میں کامیاب جا رہا تھا لیکن وہی ہوا جو سائیں بنے کیا تھا، چلے کے دور ان تیرا باپ ایک لفظ زیادہ پڑھ گیا اور یوں طلسمہ زندہ ہو گئی۔ طلسمہ جنات کی سب سے کریہہ اور خطرناک چیز ہے، تیرے باپ کی بد قسمتی کہ وہ اس کے ہتھے چڑھ گیا بے شمار چلوں کی وجہ سے وہ اسے مار تو نہیں سکتی تھی لیکن اس نے تیرے باپ کو پابند کر دیا تھا کہ وہ ہر جمعرات کا کھانا اس کے ساتھ کھایا کرے، چیلوں اور جنات کا کھانا کیا ہوتا ہے، میرا خیال ہے تمہیں اچھی طرح پتا چل چکا ہو گا۔ بس جوں جوں تم بڑے ہوتے چلے گئے۔ تمہارے باپ کا ذہن بدلتا چلا گیا، وہ اب کالے علم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا کالے جادو سے تو ممکن

ہے وہ کسی حد تک بچ جاتا لیکن طلسمہ سے بچنا بہت محال تھا، وہ پوری طرح اس پر حاوی ہو چکی تھی پتا نہیں تیرے باپ میں یہ تبدیلی کیسے آئی ایک روز اس نے طلسمہ کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کیا اور غالباً وہی دن اس کی موت کا دن ثابت ہوا۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے..... تنہائی کا احساس بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے، ابھی تو میں نے پوری طرح سے ماں باپ کا پیار پایا ہی نہیں تھا ابھی تو مجھے اپنی ماں سے ضد کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا ابھی تو مجھے باپ کی مار بھی نہیں پڑی تھی، ابھی تو مجھے ماں سے روٹھنا تھا کھلونے مانگنے تھے ساتھ سونا تھا، باپ کے کندھے پر سیر کرنا تھی، ماں کی ٹانگیں دبانا تھی..... میرا دل بھر آیا..... ایک سنگین غلطی نے میرے باپ اور ماں کو مجھ سے جدا کر دیا تھا۔ میں نے آنسو پونچھے اور سر جھکا لیا۔

پیرسانول اگرچہ میری حالت دیکھ رہا تھا اس نے ماحول کو مزید رنجیدہ بنانے سے بچانے کے لئے زبان نہیں روکی اور بولتا رہا.....

”بات پھرو ہیں پر آ جاتی ہے کہ کالا علم اسی وقت خطرناک ثابت ہوتا ہے جب اس کو کرنے والا اس میں احتیاط نہ کرے اور میں سمجھتا ہوں کہ احتیاط تو زندگی کے ہر شعبہ میں لازم ہے گاڑی چلانے والا بھی اگر احتیاط سے گاڑی نہیں چلائے گا تو جان سے جائے گا اور.....“ عین اسی لمحے باہر سے کسی کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ ہم دونوں چونک گئے، میرے چہرے پر خوف اور پیرسانول کے چہرے پر اضطراب نمودار ہو گیا، وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور باہر کی طرف لپکا میں بھی اس کے پیچھے بھاگا.....

”نہیں..... تم یہیں رہو، کمرے سے باہر ہر گز مت نکلتا“ اس نے مجھے سختی سے اشارہ کیا اور خود باہر نکل گیا۔ میں دروازے کی درز میں سے جھانکنے لگا سنائی دینے والی چیخ کسی لڑکی کی لگتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کوئی سخت اذیت کے عالم میں ہے۔

گھپ اندھیرے کی ملگجی روشنی میں پیر سانول کا ہیولہ ہی نظر آرہا تھا وہ کھلے صحن میں پہنچ کر دائیں طرف مڑ گیا ، ہاتھ اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور زمین کی طرف پھونکا، ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین اپنی جگہ سے سر کی اور خلاء سا بن گیا پیر سانول اس خلاء کے اندر اتر گیا اور اگلے ہی لمحے خلاء پر ہو چکا تھا۔

یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر مجھے کچھ بھی تو سمجھ نہ آیا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی چیخیں پھر سنائی دینے لگیں، میں بے چین ہو گیا۔ معاملہ پر اسرار ہوتا جا رہا تھا باہر جانا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ پیر سانول سختی سے منع کر گیا تھا۔ کافی دیر ہو گئی تو مجھے تشویش ہونے لگی، پتا نہیں کیا ہو رہا تھا باقی کی تمام رات پیر سانول اس گڑھے سے باہر نہیں نکلا ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹی، میں بار بار دروازے کی درز سے جھانکتا لیکن باہر سوائے ایک پر اسرار خاموشی اور تاریکی کے کچھ نظر نہ آتا۔

دن نکلا تو میں نے سوچا کہ باہر ضرور آنا چاہئے اسی عالم میں اچانک دروازہ آہستہ سے کھلا اور پیر سانول تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اندر داخل ہوا اس کا چہرہ بجا ہوا تھا اور وہ صدیوں کا

بیمار لگ رہا تھا۔ اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں تذبذب کے عالم میں تھا کہ اس سے کچھ پوچھوں یا نہیں پیر سانول جیسا گھاگ اور چالاک انسان اتنا خاموش بیٹھا ہوا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے کہیں طلسمہ تو حملہ آور نہیں ہو گئی، یہ بھی ممکن تھا کہ طلسمہ پیر سانول سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی ہو اور اس نے باور کرا دیا ہو کہ وہ میرے حصول سے دستبردار ہو جائے۔

میں انتظار کرنے لگا کہ کب پیر سانول مجھے کوئی بری خبر سناتا ہے ہم دونوں دم سادھے بیٹھے تھے کمرے کی فضا مزید بوجھل اور دبیز ہو گئی تھی کافی دیر تک یہی عالم رہا پھر پیر سانول نے دھیرے سے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھے بغیر آنکھیں بند کر کے ہونٹ ہلانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اسی عالم میں رہا پھر اچانک اس کے چہرے کی سرخی بڑھنے لگی، میں غور سے اس میں ہونے والی ان تمام تبدیلیوں کو دیکھ رہا تھا، آہستہ آہستہ اس کا چہرہ پھر کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہوتا جا رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ بالکل لال ہو گیا اور اسی لمحے اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور میں کانپ گیا۔

اس کی آنکھیں بھی خون سے لبریز تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی اور ہی بلا موجود ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں مڑ گئیں اور سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ یہ عمل اتنا خوفناک اور ڈرا دینے والا تھا کہ میں اپنی جگہ سن ہو گیا۔

پیر سانول کے منہ سے ایک گرجدار آواز نکلی..... ”وہ اب نہیں بچ سکتی.....“

میں حیران رہ گیا..... وہ شاید طلسمہ کی بات کر رہا تھا لیکن اسی لمحے پیر سانول کے منہ سے بدلی ہوئی آواز نکلی جو اس کی اپنی تھی، وہ کہہ رہا تھا.....

”لیکن تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے.....“

گر جدار آواز پھر گونجی..... ”یہ تمہاری بھول ہے“

میں سمجھ گیا کہ یہ باتیں مجھ سے نہیں کی جا رہی ہیں بلکہ پیر سانول کسی اور سے مکالمہ کر رہا

ہے..... پیر سانول بولا..... ”وہ لڑکا نہیں..... تم صرف لڑکے کے مخالف ہو“

”ہاہاہا..... بد بخت..... وہ تیری پریشانی کا باعث تو ہے ناں“

”اگر کہتے ہو تو اپنا ایک کان کاٹ کر نذرانہ دے دوں“ پیر سانول بولا۔

”ہاہاہاہا..... کان نہیں یار..... مجھے گردن چاہئے..... خون میں ڈوبی ہوئی گردن..... میرے یار

مجھے اپنی گردن دے دو..... ورنہ میں اس کی گردن کاٹ لوں گا.....“

”ہرگز نہیں.....“ پیر سانول پوری قوت سے چیخا..... ”میں تمہارے ایک ایک بال کو اپنی قید

میں جکڑ لوں گا..... تم جانتے نہیں پیر سانول کو..... میں تمہیں زمین چاٹنے پر مجبور

کر دوں گا، تمہیں ہنر سے ماروں گا..... ابھی ابھی وقت ہے باز آ جاؤ“

”پیر سانول..... یار مجھے اپنی گردن کاٹ دو.....“ گر جدار آواز میں عجیب سی فرمائش تھی، میں

سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

”پیر سانول ہل ہل کر پڑھنے لگا۔ جواب میں کبھی قہقہے بلند ہوتے اور کبھی پیر سانول کی آواز

بلند ہو جاتی، کمرے کے آئینہ کی جلی ہوئی لکڑیاں پھر سے جل اٹھی تھیں ہر چیز گویا اپنی

جگہ سہمی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک منتر پڑھنے کے بعد پیر سانول نے فضاء میں ہاتھ لہرا کر

پھونک ماری اور اس کے ساتھ ہی کمرہ کسی کی خوفناک چیخوں سے گونج اٹھا، یہ چیخیں اسی آواز

کی تھیں جو ابھی پیر سانول سے اس کی کٹی ہوئی گردن مانگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس

چینٹے ہوئے وجود کو دیکھ رہا ہے۔ البتہ میری آنکھیں اس سارے تماشے کو دیکھنے سے محروم

تھیں۔ چیختی ہوئی آواز کے کچھ جملے بھی سنائی دے رہے تھے.....

”پیر سانول..... مار دیا مجھے..... آگ لگا رہا ہے..... میں مروں گا نہیں..... ویسے چلا جاتا

ہوں..... بجھا دے آگ..... میں چلا جاتا ہوں لیکن..... پھر آ جاؤں گا..... بجھا دے

آگ..... بجھا دے آگ..... بجھا دے آگ.....“

آواز دھیرے دھیرے کم ہوتی چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں بالکل ہی معدوم ہو گئی، پیر سانول

نے ایک گہرا سانس لیا اور انگلیوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبائے لگا۔ میں خاموش تماشائی تھا سوال

پوچھنے کی پوزیشن میں تو نہیں تھا لیکن ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔
 ”یہ..... یہ سب کیا تھا۔“

میرا خیال تھا کہ پیر سانول مجھے جھڑک دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اس نے کچھ دیر میری طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔ ”تم سے چھپانا اس لئے بھی مناسب نہیں کہ بہر حال آگے چل کر یہ بات کبھی نہ کبھی تو تم پر کھلنی ہی ہے، اور تم ہی اس کے اہم کردار بنو گے۔“
 میں سمجھا نہیں..... میں نے چونک کر کہا۔

”رات تم نے جو نسوانی چیخیں سنی تھیں، پتا ہے وہ کسی کی تھیں؟؟؟“
 میں نے نفی میں سر ہلایا.....

”وہ سینوریتا تھی“ پیر سانول کی آواز بھرا گئی۔

”سینوریتا!!!!..... وہ کون ہے؟ میں نے حیرانی سے پوچھا، جواب میں پیر سانول نے جو کہا اسے سن کر میں بے اختیار اچھل پڑا۔

”سینوریتا..... میری بیٹی ہے“ پیر سانول کے ہونٹ ہلے میرے لئے یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہیں تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کالے جادو کی وجہ سے دوسروں کو شادی سے منع کرنے کے مشورے دینے والا پیر سانول نہ صرف شادی شدہ ہو گا بلکہ ایک بیٹی کا باپ بھی ہو گا۔

”تم..... تم سچ کہہ رہے ہو؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا پیر سانول کے چہرے پر ایک کرب سا آکر گزر گیا اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے خلاء میں گھورنے لگا۔ میرے پاس سوالوں کا بہت بڑا ذخیرہ ایک لمحے میں اکٹھا ہو گیا تھا، اب میں چپ نہیں رہ سکتا تھا لہذا ابے دھڑک بولا۔

”کیا تم اپنی بیٹی کو بھی کالے جادو کی طرف لگا رہے ہو؟“

”وہ چیخ.....“ میں تو اسے جنات سے پہچانا چاہتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ وہ بھی.....“

پیر سانول کی آنکھوں میں آنسو آگئے مجھے اس لمحے وہ اس بچے کی طرح معصوم لگا جس کی ماں

اسے بھرے میلے میں چھوڑ کر چلی گئی ہو اور وہ ایک ایک شخص کا دامن پکڑ کر اپنی ماں کا پتا پوچھ رہا ہو۔ میں نے ٹوٹتے ہوئے بند کے آگے رکاوٹ بننا مناسب نہیں سمجھا اور اسے بولنے دیا۔ وہ کچھ دیر اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتا رہا پھر قدرے سکون کے ساتھ بولا!

”کالے علم کا شوق مجھے بارہ سال کی عمر میں ہی ہو گیا تھا تم شاید حیرت محسوس کرو گے کہ میں ایم اے پاس ہوں اور دنیا کی چار زبانیں مکمل طور پر جانتا ہوں۔ مجھے شروع ہی سے ڈراؤنی کہانیاں اور قصے سننے کا بہت شوق تھا میری دادی جب سب بچوں کو جمع کر کے پوچھتی کہ آج کون سی کہانی سنو گے تو میں بے اختیار بول اٹھتا کہ لاش والی کہانی سنائیں میرے والدین نے بھی یہ بات بغور نوٹ کی تھی کہ میں محلے میں ہونے والی ہر موت پر میت کا چہرہ بڑے غور سے دیکھتا ہوں اس کو دفن ہوتے ہوئے بڑے انہماک سے دیکھتا ہوں اور بعد میں کئی کئی دن تک اس کی قبر پر جا کر بیٹھا رہتا ہوں۔ میرے دوست احباب جو میرے ساتھ سکول میں پڑھتے تھے وہ مجھے مذاق میں بھوت سانول کہا کرتے تھے، مجھے خود بھی نہیں پتا کہ ڈراؤنے واقعات اور ہوائی چیزوں کے ذکر سے میری کیوں تسکین ہوتی تھی۔ جب میں سکول سے کالج میں پہنچا تو مجھے محسوس ہونا شروع ہو گیا کہ بدی کی کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جو مجھ سے کوئی خاص کام لینا چاہتی ہے، حیرت انگیز طور پر میرا ذہن مذہب سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ میری ماں مجھے روزانہ نماز کی اہمیت کے بارے میں بتاتی باپ مارنے پر قتل جاتا لیکن یہ دونوں چیزیں مل کر بھی مجھے دین کی طرف راغب نہ کر سکیں۔ میں صرف اور صرف قبرستان کا اسیر ہوتا جا رہا تھا ٹوٹی پھوٹی پرانی قبریں میرے لئے انمول خزانہ بنتی جا رہی تھیں، تم یقین نہیں کرو گے کہ میں اٹھارہ سال کی عمر میں ایک دفعہ رات کے تین بجے سخت سردی کے عالم میں گھر سے نکل کر ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر میں جا کر لیٹ گیا، سچ کہتا ہوں کہ وہاں مجھے اپنی ماں کی گود سے بھی زیادہ تحفظ محسوس ہوا۔

رات کو جب میری ماں نے مجھے موجود نہ پایا تو شور مچادیا، فوری طور پر سارے گاؤں والے

میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے اغواء کر لیا گیا ہے۔ کئی لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں گھر والوں کے رویے سے تنگ آکر بھاگ گیا ہوں، وہ کافی دیر تک مجھے ڈھونڈتے رہے اسی اثناء میں میرے باپ نے کسی خیال کے تحت قبرستان کا رخ کیا گاؤں والے مجمع کی صورت میں بھی رات کے وقت اسی قبرستان کی طرف آنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ گاؤں کا بہت پرانا قبرستان تھا اور خوف اور دہشت کی ایسی علامت بن چکا تھا کہ دن کے اجالے میں بھی لوگ اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ میرے باپ کے اصرار کے باوجود لوگ اس کے ساتھ آنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ وہ اکیلا ہی قبرستان کی طرف چل پڑا اور مجھے آوازیں دینے لگا تم یقین نہیں کرو گے کہ جب میرے کانوں تک میرے باپ یقین نہیں کرو گے کہ جب میرے کانوں تک میرے باپ کی آوازیں پہنچیں تو میرا بالکل بھی دل نہ چاہا کہ میں قبر سے نکل کر اپنے باپ کے پاس جاؤں لیکن پھر پتا نہیں کیوں سامنے آگیا، میرے باپ نے مجھے ایک قبر سے نکلتے دیکھا تو گنگ رہ گیا۔ اس دن کے بعد اس نے میرے باہر نکلتے پر پابندی لگا دی وہ مجھے بہت سے عالموں کے پاس بھی لے کر گیا جنہوں نے سوائے پیسے بٹورنے کے اور کوئی کام نہ کیا۔ کوئی عامل یہ بتاتا کہ مجھ پر جنات کا سایہ ہے اور کوئی یہ کہتا کہ ایک پری مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ میں حیران تھا کہ جب میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے دورے بھی نہیں پڑتے تو خوا خواہ کیوں مجھے عالموں کو دکھایا جا رہا ہے۔

ایک دفعہ میرا باپ مجھے قریبی علاقے کے ایک عالم کے پاس دکھانے کے لئے لے گیا۔ میں نے اس عامل کے کمرے میں تین چار انسانی کھوپڑیاں لٹکی ہوئی دیکھیں۔ یہ منظر میرے لئے بہت پسندیدہ ثابت ہوا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے باپ پر ظاہر کیا کہ اس عامل کے دم درود کی وجہ سے مجھے اب خوفناک باتوں اور خوفناک چیزوں سے واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔ میرے والدین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میرا عامل کے پاس آنا جانا بھی شروع ہو گیا اور مجھ پر لگی پابندیاں بھی آہستہ آہستہ ختم ہوئی چلی گئیں اور میں پھر سے سکول جانا شروع ہو گیا۔ مجھے پتا تھا کہ یہ عامل بھی پہلے عالموں کی طرح ایک ڈھکوسلا ہے لیکن ایک کشش جو مجھے

اس کی طرف کھینچتی تھی وہ ان کھوپڑیوں کی تھی۔

کبھی کبھار تو مجھے یوں لگتا جیسے میرے وہاں جانے سے کھوپڑیاں بھی خوش ہوتی ہیں، اور ایک دن تو واقعی اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔

میں حسب معمول عامل سے پڑھا ہو پانی لینے کے لئے آیا ہوا تھا۔ عامل صاحب غالباً دوسرے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ میں کھوپڑیوں کو ہاتھ لگا کر محسوس کر رہا تھا۔ کھوپڑیاں مجھے اتنی پیاری لگیں کہ میں نے فرط جذبات سے ایک کھوپڑی کا سر چوم لیا۔ ایسا کرتے ہی میرے جسم میں گویا بہت سی تبدیلیاں یکفخت رونما ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھ میں کسی نے بے پناہ قوت بھر دی ہے۔ میری عمر اس وقت بمشکل 18 سال ہو گئی لیکن مجھے ایسا لگا جیسے میں تیس پینتیس سال کا بھرپور جوان بن گیا ہوں۔ کھوپڑیوں میں بھی ذرا سی حرکت ہوئی اور پھر میں نے ایک ہلکی سی سرگوشی سنی جو بالکل واضح سنائی دی۔ کوئی ہلکی سی آواز میں بولا تھا۔

”شیطان تمہارے انتظار میں ہے، آؤ ہمارے پاس آ جاؤ“

اس وقت پورے کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں اس آواز میں اتنا کھو گیا کہ مجھے عامل کی آمد کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو میں کھوپڑیوں کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک لمبا سا ڈکار لیا، پھر کہنے لگا ”کل آتا..... آج مجھے ضروری کام سے دوسرے شہر جانا ہے“

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور عامل سے سلام لے کر باہر نکل آیا۔ اب میرے پاس سارا دن پڑا تھا۔ میں اس موقع کو کھوتا نہیں چاہتا تھا لہذا آرام سے بڑے قبرستان کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر ایک ویران سے گوشے میں ایک پرانی سی قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ یوں لگا جیسے کسی نے سرگوشی میں مجھے پکارا ہے۔

بالکل ایسی آواز میں نے عامل کے کمرے میں بھی سنی تھی خوف کی بجائے مجھے خوشی اور طمانیت سی محسوس ہونے لگی میں نے آواز کی سمت دیکھا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ میں پوری طرح تیار ہو کر بیٹھ گیا کہ اب اگر یہ آواز مجھے دوبارہ آئی تو میں ضرور اسے آواز دوں گا ٹھیک

تین منٹ بعد دوبارہ سرگوشی سنائی دی۔

”آ جاؤ..... ہمارے پاس آ جاؤ“

میں نے بے چینی سے کہا ”کون ہو تم..... میں تمہارے ساتھ آنا چاہتا ہوں“

میری بات کے جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہی سرگوشی سنائی دی ”رات کو آنا، رات کو آنا، رات کو آنا“ آواز بار بار آنے لگی۔

میں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔ میں قبرستان سے نہیں جانا چاہتا تھا لیکن سرگوشی کی ہدایت تھی کہ میں رات کو آؤں۔ مجھے پتا تھا کہ اگر میں واپس گھر چلا گیا تو رات کو یہاں آنا ناممکن ہو جائیگا۔ اس لئے فیصلہ کیا کہ گھر نہیں جاؤں گا۔ تم حیران ہو گے کہ میری حالت اتنی زیادہ خراب ہو چکی تھی کہ مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔

رات تک میں بے چینی سے قبرستان سے ملحقہ سڑکوں پر بلا مقصد گھومتا رہا۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ میرا ہاسپتال ایماں بھی ختم ہو تا جا رہا ہے۔ میری شدید خواہش ہو رہی تھی کہ میں جلد از جلد بدی کی طاقتوں سے ملوں۔ سڑکوں پر گھومتے ہوئے مجھے پتا نہیں کیوں یقین سا ہو تا جا رہا تھا کہ عنقریب مجھے کوئی شکتی حاصل ہونے والی ہے۔ اس شکتی کی نوعیت تو میرے علم میں نہیں تھی لیکن اتنا احساس ضرور تھا کہ میں کسی غیر معمولی صلاحیت کا مالک بننے والا ہوں۔ ادھر رات گئے تک گھر نہ پہنچنے کی وجہ سے میرے گھر میں ہر کوئی پریشان تھا۔ میرے باپ کو یقین تھا کہ میں اسے کسی نہ کسی قبرستان میں ہی ملوں گا۔ اس نے عامل سے بھی میرے بارے میں پوچھا۔ بڑے قبرستان کی طرف بھی آیا لیکن مجھے نہ دیکھ سکا کیونکہ میں احتیاطاً رات ہوتے ہی قبرستان میں موجود بوڑھے کے گھنے درخت کے اوپر چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ کو پاگلوں کی طرح ایک ایک ٹوٹی قبر میں جھانکتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی بے بسی تھی لیکن مجھ پر تو بدی کا نشہ سوار تھا میں نے اس کی بے بسی کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اور اس کے ساتھی کچھ دیر تک مجھے قبرستان میں ڈھونڈنے کے بعد واپس چلے گئے۔

یہ رات میری زندگی کی پہلی رات تھی جو میں نے قبرستان میں اکیلے کافی اس رات میرے ساتھ جو کچھ ہوا اس نے میری زندگی میں بدی کے تمام راز آشکار کر دیئے۔ اس قبرستان کا گورکن جو کہ اصل میں کالے علم کا بہت بڑا شیدائی تھا میرا سہارا تھا بن گیا اس رات اس نے مجھے کالے علم کی ان تمام جذبات کے بارے میں بتایا جن کے بارے میں میں تمہیں ابتدائی درس دے چکا ہوں۔ میں بھی اس وقت کالے علم کے بارے میں تمہاری طرح نابلد تھا۔ تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے کہ تم کالا علم مجبوراً سیکھنا چاہتے ہو جبکہ میں نے اسے بصد خلوص سیکھا ہے۔

میں پھر دوبارہ اپنے گھر نہیں گیا۔ البتہ مجھے کچھ عرصہ بعد اپنی ماں کے مرنے کی اطلاع مل گئی۔ مائیں بچوں کے بغیر زیادہ دیر زندہ نہیں رہتیں۔ بچہ اگر مر جائے تو ممکن ہے کہ ماں کو سکون آجاتا ہو لیکن جب ماں کو یہ پتا ہو کہ اس کا لخت جگر زندہ ہے اور پتا نہیں کس حال میں ہے تو پھر وہ روز جیتی ہے روز مرتی ہے۔ میری ماں بھی روز روز مرنے سے تنگ آگئی ہوئی تھی۔ اس نے جان ہار دی اور خالق حقیقی سے جا ملی۔ میرا باپ مرد تھا، ماں کی نسبت تھوڑا زیادہ حوصلہ رکھتا تھا لیکن یکدم بیٹے اور پھر بیوی سے جدائی نے اسے بالکل ہی تباہ کر کے رکھ دیا اور وہ دیوانوں کی طرح مارا مارا پھرنے لگا۔

گاؤں والے بتاتے ہیں کہ وہ اس طرح مجہول کیفیت میں کسی لاری سے ٹکرا گیا تھا۔ بعد میں وہ زندہ رہا یا نہیں۔ اس بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔

میں نے اپنی زندگی کا تمام رخ غلاظتوں کی طرف موڑ دیا تھا گورکن نے مجھے اپنے ساتھ کالے علم کی وہ وہ منزلیں دکھائیں کہ میں ان میں بالکل ہی ڈوب گیا اسی کام میں ہوتے ہوتے میں جوان ہو گیا۔

قبرستان میرا سب سے بڑا میرا بن چکے تھے۔ ہم دونوں شہر کا قبرستان چھوڑ کر سلطان پور کے ویران قبرستان میں آئے اور شیطان کو خوش کرنے میں مگن ہو گئے۔

کالا علم اتنا آسان نہیں جتنا لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے اس علم کو حاصل کرنے کے لئے لگ بھگ 40 انسانوں کا خون بہایا۔ میرا ساتھی گورکن اگرچہ کالے علم میں مجھ سے کہیں آگے تھا لیکن جلد باز تھا۔ اس جلد بازی نے اسے وہ نقصان پہنچایا کہ میں لرز گیا۔ ہوا یوں کہ ایک بار اس نے مجھے بتایا کہ اگر ہم ”کالی ماتا“ کا چلہ مکمل کر لیں تو ہمیں کالے علم کی وہ طاقت بھی حاصل ہو جائے گی جس کی بدولت ہم کسی بھی شخص کو سات سمندر پار بھی اذیتیں دے دے کر مار سکیں گے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ ”کالی ماتا“ کا چلہ کالے علم کا سب سے مشکل اور سب سے خطرناک چلہ ہے۔ یہ عموماً چالیس کی بجائے 22 دنوں کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے سخت سردیوں کا موسم شرط ہے اور یہ بھی از حد ضروری ہے کہ چلہ کرنے والا 22 دن مسلسل بھوکا پیاسا رہے۔ 22 دن بھوکا پیاسا رہنا آسان کام نہیں۔ میڈیکل سائنس کے مطابق بھی عام انسان 10 دنوں بعد اس حالت میں مر جاتا ہے لیکن ہم دونوں نے یہ چلہ کرنے کی ٹھانی اور اس سلسلے میں تمام ضروری اقدامات کر لئے۔ گورکن نے مجھے بتایا تھا کہ قدرت نے ہر انسان کو سانسوں کی ایک خاص مقدار عطا کی ہے۔ یہ مقدار جب ختم ہو جاتی ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان یہ سانسیں بچا کر رکھے اور احتیاط سے استعمال کرے تو جب تک اس کی سانسیں پوری نہیں ہوں گی وہ نہیں مرے گا۔ اس نے بتایا کہ اگر ہم یوگا سیکھ لیں اور دیر دیر تک اپنی سانسیں روکیں تو ہم اپنی زندگی کم از کم ڈیڑھ گنا زیادہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کی اس بات نے میرے اندر ایک نیا جوش پیدا کر دیا تھا۔ میں نے فوری طور پر حامی بھر دی اور اس عمل میں اس کا مکمل ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

گورکن نے مجھے تین ماہ تک یوگا کی تربیت دی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ میں تقریباً پانچ منٹ تک سانس روکنے میں کامیاب ہو گیا گورکن کہا کرتا تھا کہ کالے علم کے جو منتر سانس روک کر پڑھے جاتے ہیں ان میں نہ صرف تاثیر دو گنا ہو جاتی ہے بلکہ وہ دیرپا بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ”کالی ماتا“ کا چلہ میرے اور گورکن کے لئے نہایت اہم حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اور پھر وہ وقت بھی آن پہنچا جب ہمیں اس چلے کے لئے عملی طور پر ایک خالی قبر میں داخل ہونا تھا

عام بندہ اگر یہ عمل ہوتے ہوئے دیکھ لیتا تو شاید اس کا دل دو گنا پھول جاتا۔ لیکن ہماری تمام تر حوصلہ افزائی بدی کی طاقتیں کر رہی تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب قبر میں جانے سے پیشتر گورکن نے کالے علم کا ایک انتہائی اہم اور لازمی کام مجھے دیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ انسان میں وہ قوت موجود ہے جس کی بدولت وہ بڑے بڑے کام کر سکتا ہے اس سے وہ پہلے بے خبر ہوتا ہے۔ جس طرح ہاتھی کو اپنی معمولی طاقت کا علم نہیں اسی طرح انسان بھی اپنی پوشیدہ قوتوں سے آگاہ نہیں۔ یہ قوت متخیلہ اور مقناطیسیت صرف انسانوں میں ہے کیونکہ انسان اس وقت کی بدولت جو کام کر سکتا ہے وہ کوئی اور جاندار نہیں کر سکتا۔ سانپ میں مقناطیسیت دوسرے حشرات الارض کی نسبت زیادہ ہوتی ہے تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ سانپ کو دیکھتے ہی مینڈک خود بخود اچھلتا ہوا آتا ہے اور اس کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اصل میں سانپ کی قوت مقناطیسی کے مقابلے میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ دوڑتا ہوتا آئے اور اس کا لقمہ بن جائے۔ یہی حال بلی کا ہے۔ کبھی غور کرنا کہ اگر سانپ اور بلی آمنے سامنے آجائیں تو بلی یکدم اپنی جگہ پر مبہوت رہ جاتی ہے۔ سانپ کی نظر سے نظر ملتے ہی بلی پر ایسی مقناطیسیت طاری ہوتی ہے کہ وہ یکدم ایک سحر میں آجاتی ہے اور حرکت بھی نہیں کرتی کبھی کبھی گھنٹوں یہ عمل رہتا ہے بعض اوقات بلی اس عمل میں مر بھی جاتی ہے تم نے شیر کو لکارتے نہیں دیکھا مگر اسے فلموں میں تصویروں میں دیکھا ہو گا۔ کبھی اس کی آنکھوں پر غور کرنا۔ اس کی آنکھوں میں حد درجہ کی مقناطیسیت ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے اپنے شکار کو جکڑ لیتا ہے۔

ہماری باتیں بیان کرنے کا مقصد ہے کہ ”کالی ماتا“ کے چلہ میں جو چیز سب سے اہم کردار ادا کرے گی وہ تمہاری قوت متخیلہ ہوگی۔ اگرچہ مجھے بھی اس عمل سے گزرنا ہے لیکن تمہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ تم ابھی نئے ہو یہ کہتے ہوئے گورکن نے مجھے قبر کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ قبر میں داخل ہوتے وقت مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ اس قبر سے صرف میں زندہ بچ نکلوں گا اور گورکن مارا جائے گا۔

اصل میں اُسے حد سے زیادہ خود اعتمادی لے ڈوبی۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی قبر میں داخل ہوا۔ ہم دونوں نے اکٹھے چلہ شروع کیا۔ یہ چلہ کیا تھا اور کیسے ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ گورکن نے بھی وہی ہولناک غلطی دہرائی جو تمہارے باپ اور سائیں نے دہرائی تھی۔ حسب معمول اس نے ایک منتر زیادہ پڑھا اور پھر..... ہوائی مخلوق نے اس کا وہ حشر کیا کہ بیان سے باہر ہے۔

یاد رکھو کسی بھی چلے کے دوران جنات کی یہ شدید خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ عمل کرنے والے کو ایک منتر زائد پڑھنے پر آمادہ کر لیں۔ 90 فیصد عامل اس عمل میں دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ میں یہ عمل مکمل کر گیا۔ پھر تو جیسے بدی کی قوتیں خود بخود میرے گرد اکٹھی ہونا شروع ہو گئیں۔ میں نے شیطان کے ہر عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پانچ سال تک میں ہر اہم چلہ کاٹ چکا تھا۔ میں ان دنوں بھرپور جوانی کے دنوں میں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری شادی بھی ہوگی۔ وہ اس لئے کہ کالے علم کرنے والے اس جھنجھٹ سے دور ہی بھاگتے ہیں۔ ان کی اولاد زینہ نہیں ہوتی اور لڑکیوں کے پیدا ہونے کا خوف انہیں خوفزدہ کئے رکھتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور یوں میری زندگی میں شاہدہ داخل ہوئی۔

ہوایوں کہ میں نے ایک چلے کے دوران ایک پرانی قبر میں رہائش رکھی ہوئی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس قبر پر کوئی ہر ہفتے فاتحہ پڑھنے آتا ہے۔ یہ قبر اصل میں ایک عورت کے باپ کی تھی اسے اپنے باپ سے بہت پیار تھا اور وہ ان کی وفات کے بعد بڑی باقاعدگی سے یہاں فاتحہ پڑھنے آتی تھی چونکہ غریب تھی اس لئے قبر تو مرمت نہ کروا سکی لیکن فاتحہ پڑھنے باقاعدگی سے آتی، مجھ پر یہ راز اس وقت کھلا جب میں نے ایک روز دن کی روشنی میں اسے قبر پر فاتحہ پڑھتے دیکھا۔ میں اس وقت قبر سے باہر تھا۔ پھر دو تین دفعہ میں نے اسے یہ عمل کرتے دیکھا تو مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں ایک نہایت اہم چلہ کر رہا تھا۔ اور وہ قرآنی دعائیں پڑھ پڑھ کر میرے چلے کو ناکام بنائے دے رہے تھی۔ میں پورا ہفتہ اپنی جان عذاب میں ڈال

کر ایک چلہ مکمل کر تا اور وہ بڑے آرام سے آیتیں پڑھ کر قبر پر پھونکتی اور میرا سارا چلہ غارت ہو جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت سے کیسے نمٹوں۔ منع اس لئے بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح وہ اور زیادہ شک میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ بھلا میں کون ہو تا تھا اسے اس کے باپ کی قبر پر فاتحہ خوانی سے روکنے والا۔

اسی دوران مجھے ایک طریقہ سوچا۔ میں نے سوچا کہ اسے اتنا خوفزدہ کر دیا جائے کہ وہ دوبارہ قبر تو کیا، قبرستان میں ہی قدم نہ رکھے۔ میرا ارادہ اسے صرف خوفزدہ کرنے کا تھا۔ میں نے ایک روز جب وہ قبر پر فاتحہ پڑھ رہی تھی اور میں قبر کے اندر تھا۔ اچانک ایک زوردار چیخ ماری اور چلا کر کہا.....

”میں تیرا خون پی جاؤں گا“

خدا کی قسم میں نے قبر کے ایک سوراخ میں سے دیکھا کہ میری آواز سن کر عورت یکدم سن ہو گئی، میں نے اسے کھڑے کھڑے زرد ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اچانک خوف کا اتنا زبردست سایہ اُمڈ آیا تھا کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ قبر سے آنے والی آواز نے اس سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ چیخ مارے گی اور بھاگ جائیگی لیکن ایسا نہیں ہوا وہ عورت کافی دیر تک سکتے کے عالم میں وہاں کھڑی رہی اور پھر کھڑی کھڑی گر گئی۔ اس کا دم نکل گیا تھا۔

میرے لئے کسی کامرنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ میں اپنے ہاتھوں سے شیطان دیوتا کو خوش رکھنے کے لئے کئی انسانوں کے خون کا نذرانہ پیش کر چکا تھا۔ لیکن اس عورت کی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس پر بے حد ترس آیا لیکن یہ کیفیت وقتی تھی۔ فوراً ہی شیطان کا ہاتھ میرے سر پر حاوی ہو گیا اور مجھے اپنے آپ میں بہت توانائی محسوس ہوئی۔ اس وقت تو میں سنبھل گیا لیکن جب دو تین روز بعد جب میں نے ایک جوان لڑکی کو قبر پر فاتحہ پڑھتے دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ یہ کون ہے؟

میری سمجھ سے بالاتر تھا کہ وہ لڑکی کس تعلق سے آرہی ہے۔ مسئلہ پھر وہی پیدا ہو گیا تھا کہ

میری عبادت میں خلل کا خطرہ تھا۔ میں چاہتا تو اس لڑکی کو بھی ڈرا سکتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں چاہا میں نے کچھ دن اس کا پیچھا کیا تو مجھے پتا چلا کہ اس کا نام شاہدہ ہے اور وہ اس عورت کی لڑکی ہے جو میرے خوف سے مر گئی تھی میں آج تک حیران ہوں کہ اس عورت کی موت نے مجھ پر ایسا کیا شرمندگی کا تاثر قائم کر دیا تھا کہ میں نے اس کے ازالے کی کوششیں شروع کر دیں۔

لڑکی کے بارے میں مجھے یہ بھی علم ہوا کہ وہ اپنی ماں کی وفات کے بعد بالکل تنہا ہے۔ جب وہ اپنے نانا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتی تو مجھے اسکی آنکھوں میں عجیب سی معصومیت اور بے بسی تیرتی ہوئی نظر آتی۔ پتا نہیں میرے کالے جادو کے سامنے اسکی آنکھوں کا جادو کیسے چل گیا۔ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

شیطان کو بھی میرے اس فیصلے کا پتا چل گیا تھا۔ ماورائی طاقتوں نے مجھے بہتر احساس دلایا کہ یہ عمل میری زندگی میں کیا کیا مشکلات پیدا کر سکتا ہے لیکن میں تو محبت کے ذائقے سے پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ میری یہ محبت خود غرضی کے جذبے سے بالکل عاری تھی۔

انسان کی پہلی محبت سردیوں کی دھوپ کی طرح ہوتی ہے۔ چھلپاتی بھی نہیں اور کپکپاتی بھی نہیں۔ اس وقت میں خود بھی حیران تھا کہ یہ یکدم مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ایک بالکل ہی انجان لڑکی مجھے کیوں اتنی اچھی لگنے لگی ہے۔ میں نے کئی دفعہ خود کو سمجھایا کہ شادی کے بعد یہ لڑکی میرے علم کے سیکھنے میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن دل بار بار مجھے سمجھاتا رہا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ دل و دماغ کی اس جنگ میں جیت دل کی ہوئی اور میں نے شاہدہ سے شادی کر لی۔

شاہدہ میری زندگی میں بہار بن کر داخل ہوئی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ شاہدہ کے بغیر میں کس قدر ادھورا اور نامکمل تھا۔ اس کی محبت نے مجھے یکنخت کالے علم سے دور کر دیا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں نے شیطانی قوتوں کی خواہش کے برخلاف شاہدہ سے شادی کی تھی۔ وہ مجھے تو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے لیکن شاہدہ ان کی ہٹ لسٹ پر آگئی تھی۔

شاہدہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اسکے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں کالے علم کا بچاری

ہوں۔ اس نے مجھے زبردستی دوبارہ تعلیم کی طرف راغب کیا اور میں پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کرنے لگا۔ یہ اس کی محبت اور توجہ کا نتیجہ تھا کہ میں نے چار سالوں میں ایم اے کر لیا۔ اسی دوران اچانک ہی میرا دماغ پلٹا اور مجھے پھر سے قبریں اچھی لگنے لگیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ شاہدہ نے بھی مجھ میں رونما ہونے والی یہ تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ چار سال تک مجھے کالے علم کے ہلکے پھلکے چلوں کے علاوہ اور کوئی خاص طلب محسوس نہ ہوئی۔ لیکن ٹھیک چار سال بعد ایک روز جب سخت بارش ہو رہی تھی اور رات کے بارہ بجے تھے۔ اچانک ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ یوں اچانک بیدار ہونے کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ میری آنکھوں کے سامنے شاہدہ سو رہی تھی۔ میرے دماغ میں غیر مرئی خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں آہستہ سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس آگیا۔ میرا یہ گھر قبرستان سے کچھ ہی فاصلے پر تھا اور کرائے کا تھا۔ کھڑکی سے قبرستان کی عقبی سمت بڑی واضح نظر آتی تھی۔ شاہدہ کو یہ گھر لینے پر بہت اعتراض تھا لیکن میں نے اس معاملے میں اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اس جگہ گھر لینے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ میں قبرستان تک با آسانی آ جاسکتا تھا۔ شاہدہ سے شادی کے بعد میں پرائیویٹ ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے بظاہر گزارا کسی نہ کسی طرح ہو رہا تھا۔ ابھی تک شاہدہ کے علم میں یہی تھا کہ میں رات کو دیر سے اس لئے آتا ہوں کہ ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے دیر ہو جاتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں آدھی رات کو قبرستان میں پرانی قبروں اور مردوں سے بھی ہم کلام ہوتا ہوں۔

جیسا کہ میں بتا رہا تھا کہ اس رات مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں کھڑکی میں سے جھانک ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں یکدم پلٹا تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ میری بیوی شاہدہ مجھے غصے سے گھور رہی تھی۔ میں اسے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا دیکھتے ہی دیکھتے اسکے دانت تین فٹ تک لمبے ہو گئے، آنکھیں ابل پڑیں، پاؤں مڑ گئے اور ہاتھ میری گردن کے گرد آ گئے۔ میں چونکہ ایک طویل عرصہ سے جنات کی نگری میں تھا اس لئے ان کی

اس خوفناک حرکت سے زیادہ اس بات سے ڈر گیا کہ ہوائی مخلوق نے مجھ پر براہ راست حملہ آور ہونے کی بجائے میری بیوی کو نشانہ بنالیا ہے۔ میں نے تیزی سے تریاق منتر پڑھ کر اسکے چہرے پر پھونکا اور وہ فوراً اپنی اصل حالت میں واپس آگئی۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ اسکے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔ میں اسے کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے بتا دیتا کہ میں کالا علم کرتا ہوں اور تمہاری ماں کی موت کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب کالے علم کی اس حد تک جاؤں گا کہ کوئی بھی بدروح یا ہوائی چیز شاہدہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔ لیکن اسکے لئے شاہدہ کو اعتماد میں لینا بہت ضروری تھا۔ وہ بیچاری معصوم سی لڑکی تھی۔ صوم و صلوة کی پابند۔ میری بات سنتے ہی اچھل پڑی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اسے مناسب الفاظ میں سمجھا سکوں لیکن وہ نہیں مانی۔ پڑھے لکھے لوگوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دلائل بڑے دیتے ہیں۔ وہ بھی دلیلوں پر اتر آئی۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اسے رام کرنے میں ناکام رہا، میں اس پر جتنے بھی منتر اور چلے کر کے پھونکا اس کی ایک نماز ان سب کا اثر ختم کر دیتی۔

ان ہی دنوں مجھ پر انکشاف ہوا کہ جنات اسے صرف خوفزدہ کر رہے ہیں ورنہ اس کے روشن دل اور ایمان بھرے وجود کو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ عمل میرے لئے طمانیت کا باعث تھا۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ خدا کا کلام، کالے علم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ان ہی دنوں خدا نے ہمیں سینوریتا سے نوازا، سینوریتا فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے خوبصورت، پیاری اور ہنسنے ہنسانے والی۔ یہ لفظ میں نے ایک غیر ملکی رسالے میں پڑھا تھا۔ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے اپنی بیٹی کو اسی نام سے بلانا شروع کر دیا۔

شاہدہ کی خواہش تھی کہ بیٹی کا نام ریشم ہو لہذا وہ ریشم اور میں سینوریتا کہہ کر بلاتا رہا۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد میں نے کالے علم کے چلے اور بھی سخت کر دیئے کیونکہ اب مجھے ایک نہیں دو جانوں کی حفاظت کرنا تھی۔

میری بد قسمتی کہ ایک روز میرے غلط منتر پڑھ جانے کی وجہ سے جنات کو موقع مل گیا کہ وہ

شایدہ پر وار کر سکیں۔ انہوں نے اس رات اتنے خوفناک طریقے سے شایدہ کو ڈرایا کہ وہ بیچاری غش کھا کر گری اور پھر نہیں اٹھ سکی۔ اس دن سے آج تک میں اپنی بیٹی سینوریتا کو ساتھ ساتھ لئے پھر رہا ہوں۔ جنات اس کی جان کے درپے ہیں میں نے اسے اسی گھر کے ایک تہہ خانے میں اپنی حفاظت میں رکھا ہوا ہے۔ وہ بہت ذہین لڑکی ہے میں نے اسے بی اے تک تعلیم دلوائی اس دوران ہر قدم پر میں نے اپنے منتروں کی بدولت اسکی حفاظت کی اسے جنات کے شر سے بچایا لیکن جوں جوں میرے کالے علم کے چلے سخت ہوتے گئے جنات کی نفرت بڑھتی گئی۔ وہ مجھ سے میری بیٹی چھیننے کے درپے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ پیر سانول ان کو جلا کر بھسم کر سکتا ہے..... پیر سانول کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ پیر سانول کی کہانی سن کر میں کافی زیر تک سوچتا رہا کہ ہر انسان اپنے اندر کوئی نہ کوئی کہانی ضرور رکھتا ہے۔ میں نے پیر سانول سے پوچھا۔

”کیا سینوریتا بھی کالا علم جانتی ہے؟“

”پہلے نہیں جانتی تھی لیکن اب میں نے اسکی تربیت شروع کر دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی ان شیطانی قوتوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جائے۔ میں سینوریتا کو کالے علم کی ایک ایسی طاقت بنادوں گا کہ دنیا اس کے نام سے کانپے گی۔ اب اگر میں نے تمہیں ساری کہانی سنا دی ہے تو یہ بھی سنتے چلو کہ ”طلسمہ“ کو بھی میں سینوریتا کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ سینوریتا کے قبضے میں ”طلسمہ“ ہوگی تو کوئی شیطانی طاقت اس پر حاوی نہیں ہو سکے گی۔“

مجھے پیر سانول کی ساری پلاننگ سمجھ میں آگئی۔ وہ میرے ذریعے اپنی بیٹی کو بچانا چاہتا تھا لیکن مجھے ابھی تک اس بات کی سمجھ نہیں آسکی تھی کہ اگر سینوریتا میری طرح کالے علم کی ابتدائی سیڑھی پر تھی تو اسے تہہ خانے میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

میں بھی تو آزاد فضاء میں تھا۔ اگرچہ یہ آزادی صرف گھر کی حد تک محدود تھی لیکن کم از کم اتنا احساس تو تھا ناں کہ میں آسمان کو دیکھ سکتا ہوں۔ یہی بات میں نے پیر سانول سے کی وہ

شاید پہلے سے میرے سوال کے انتظار میں تھا۔ فوراً بولا۔

”دیکھو! سینوریتا اور تم میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ بھی ایک عامل کی بیٹی ہے تم بھی ایک عامل کے بیٹے ہو لیکن تم پر طلسمہ حاوی ہے جبکہ سینوریتا اس وقت ہر قسم کی شیطانی طاقتوں کی زد میں ہے اور پھر ویسے بھی وہ کالے علم کے حصول میں تم سے تھوڑا آگے ہے۔ ممکن ہے اگلی کسی سٹیج پر تمہیں بھی ایسے ہی کسی عمل سے گزرنا پڑے۔“

پیرسانول نے بات مکمل کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

حالات اچانک پلٹا کھا گئے تھے۔ اب مجھے پیرسانول کے ساتھ ساتھ سینوریتا کو بھی نظر میں رکھنا تھا۔ دونوں باپ بیٹی کے کیا عزائم تھے فی الحال میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سینوریتا چونکہ ابھی میرے سامنے نہیں آئی تھی اس لئے کچھ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس حد تک طبیعت کے معاملے میں اپنے باپ پر ہوگی۔

پیرسانول مجھے کالا علم سکھانے کے لئے بنیادی تربیت کا آغاز کر چکا تھا۔ کالے علم کی پہلی سیڑھی پر میرا تعارف ہم زاد سے ہوا۔ پیرسانول نے بتایا کہ اشرف المخلوقات کے ہمزاد کی حقیقت کے بارے میں الگ الگ خیال ہے بعض کا خیال ہے کہ ہمزاد ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی مرتا ہے۔ کئی عالموں کا کہنا ہے کہ انسان کا ہمزاد مرنے کے بعد بھوت پریت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسکی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اسی ہمزاد کی وجہ سے انسان گناہ کرتا ہے۔ لیکن اس ہمزاد میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ انسان اگر مر بھی جائے تو یہ ہمزاد زندہ رہتا ہے۔ روح اور جسم کی علیحدگی بھی اسے انسان سے جدا نہیں کرتی۔ عام چلوں کی زبان میں اسے ”بھور“ کہا جاتا ہے۔ ہمزاد کی چار قسمیں

ہیں۔ علوی، سفلی، جنتر منتر اور تنتر۔ ہمزاد علوی بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ سفلی کم طاقتور ہوتا ہے، نقش یعنی جنتر کے ذریعے آنے والا ہمزاد بھی مکمل طاقت اور اختیار کا حامل ہوتا ہے جبکہ عکسی اور غیبی طاقت والے ہم زاد نسجاً کم صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ عکسی اور غیبی ہم زادوں کی بھی آگے دو اقسام ہیں۔ ایک کامل دوسری ناقص..... کامل مکمل ہم زاد ہوتا ہے

جبکہ ناقص صرف اپنے غیبی اور عکسی مشاغل سے سیاروں کا حل بتاتے ہیں وہ درودور کی چیزیں نہیں لا سکتے۔ پیر سانول مجھے ہم زاد کے بارے میں روزانہ کچھ نہ کچھ بتاتا جا رہا تھا۔ میں ابھی تک اس انتظار میں تھا کہ کب وہ مجھے مکروہات کھانے کے لئے کہتا ہے اور کب میں انکار کرتا ہوں لیکن ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہو گیا جو میرے لئے نہایت فیصلہ کن ثابت ہوا۔

ہو ایوں کہ ایک روز پیر سانول نے مجھے حکم دیا کہ میں تیار رہوں آج رات وہ میری ملاقات سینوریتا سے کرائے گا، اس لئے کہ اب ہمیں اکٹھے کا لا علم سیکھنا ہے میں متحس ہو گیا، سینوریتا کا نام بتاتا تھا کہ وہ یقیناً خوبصورت ہو گی۔ مجھے اسکی خوبصورتی سے زیادہ اس بات کی بے چینی تھی کہ آخر پیر سانول اسے کیا جادو سکھا رہا ہو گا کیا اسکی بیٹی بھی اسکی طرح مکروہ چیزیں کھاتی ہو گی۔ کسی لڑکی سے جو کا لا علم سیکھ رہی ہو میری یہ پہلی ملاقات تھی میں بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس رات بھی ہمیشہ کی طرح شدید بارش شروع ہو گئی۔ پیر سانول نے مجھے آتش دان کے قریب کھڑا کیا دو تین بار کچھ پڑھ کر میری طرف پھونکا پھر میرے چہرے پر اپنا بھاری ہاتھ پھیرا مجھے یوں لگا میں انجانی بکلیوں کی زد میں ہوں۔ وہ تین منٹ تک میرا ذہن بالکل ماؤف رہا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس آئی تو پیر سانول مجھے اپنے پیچھے لے کر چل پڑا۔

ایک دفعہ مجھے احساس ہو اگوا میں اسکی مرضی سے چل رہا ہوں یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم روک لئے میرا خیال غلط ثابت ہوا میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آ رہا تھا انسان کا ذہن بعض اوقات اس کے اختیار کی حد سے تجاوز کر جائے تو خیال آنے لگتا ہے جیسے وہ کسی اور کا مطیع ہو گیا ہے لیکن ایسا نہیں ہو تا جبر و اختیار کے تمام تر لوازمات ہماری ملکیت میں ہی ہوتے ہیں تاہم ہماری متاثر ہونے کی صلاحیت انہیں کبھی کم یا کبھی زیادہ کر دیتی ہے میں بھی اس وقت پیر سانول سے بہت متاثر ہو رہا تھا۔ متاثر ہونے سے یہ مراد مت لیجئے گا کہ میں مرعوب ہو رہا تھا متاثر آپ کسی بھی چیز سے ہو سکتے ہیں۔

پیر سانول اور میں ٹھٹھرتی رات اور موسلا دھار بارش میں صحن میں پہنچے، بالکل اسی طرح پیر

سانول نے صحن کے درمیان لے جا کر بلند آواز منتر پڑھنا شروع کیا..... بادلوں کی گڑگڑاہٹ سارے ماحول کو خوفناک بنا رہی تھی میں نے کن اکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا اور ڈر گیا مونا تازہ بلا اپنی خونخوار نظریں مجھ پر جمائے ہوئے تھا میں غیر ارادی طور پر پیر سانول کے مزید قریب ہو گیا اچانک زمین لرزی اور صحن کا آدھا فرش دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اندر بالکل اندھیرا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ بھی تو دکھائی نہ دیا۔

”میرا ہاتھ پکڑ لو“ پیر سانول کی گرجدار آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے اسکے حکم کی تعمیل کی۔

پتا نہیں اس کے ہاتھ میں کیا جادو تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میں زمین سے اوپر اٹھ گیا ہوں، میں نے گھبرا کر نیچے کی طرف دیکھنا چاہا لیکن پیر سانول سانپ کی طرح پھنکارا۔ ”آنکھیں بند کر لو..... فوراً.....“

میں نے ڈر کے آنکھیں بند کر لیں۔

تقریباً آدھا منٹ سی کیفیت میں رہنے کے بعد آنکھیں کھولنے کا حکم ملا تو میں ایک بالکل نئی جگہ پر تھا یہ ایک گندہ سا کمرہ تھا، فرش پر دری بچھی ہوئی تھی، ایک موڑھے پر چند انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں جبکہ ایک انتہائی کریہہ شکل لڑکی اپنے لمبے لمبے بال کھولے دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔

میں نے غور سے اسکی طرف دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سینوریتا جیسے خوبصورت نام کی حامل لڑکی اس قدر مکروہ شکل کی مالک ہوگی۔ اس کا انداز اور اس کی ہنیت دیکھ کر مجھے متلی سی محسوس ہونے لگی۔

پیر سانول کو دیکھتے ہی اسکی آنکھوں میں چمک سی بھری۔

وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔

میں نے پیر سانول کی طرف دیکھا اسکے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے لڑکی کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈالیں اور بولا

”آئے تھے.....؟؟؟“

”نہیں.....“ لڑکی کے غلیظ دانت نظر آئے۔

”کوئی اشارہ؟؟؟“

”نہیں“ وہ دوبارہ بولی۔

”سانپ آگئے؟“

”ہاں“ لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

میرے لئے یہ ساری گفتگو لایینی تھی۔ پتا نہیں وہ اپنی بیٹی سے کس کا پوچھ رہا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس تمام عمل میں لڑکی نے ایک لمحے کے لئے بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے پتا ہی نہیں کہ یہاں میں بھی موجود ہوں۔ ویسے میری بھی کوئی خواہش نہیں تھی کہ وہ میری طرف دیکھتی اس کی شیطانیت بھری شکل نے مجھے اس ماحول سے اور بھی زیادہ متنفر کر دیا تھا۔ پیر سانول نے اپنی جیب سے ایک ہڈی نکالی۔ دائرے کی شکل میں گھمائی..... ابھی اس کا تیسرا ہی چکر تھا کہ کوئی پوری قوت سے چیخا۔ یہ چیخ اتنی غیر متوقع اور بھیانک تھی کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

یہ چیخ اسلئے بھی مجھے خوف زدہ کر گئی کہ اس کی آواز مجھے اپنے دماغ کی تہہ میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پیر سانول اور لڑکی چوکنے کھڑے ہو گئے۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد آواز دوبارہ آئی تو پیر سانول نے مجھے وہیں کھڑا رہنے کا اشارہ کیا اور خود تیزی سے سامنے لگے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

میرے سامنے کھڑی مکروہ چہرے والی سینوریتا نے اپنی گھورتی ہوئی نظریں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے دکھائی دیئے۔ مجھے پتہ تھا کہ اب وہ مجھ سے میرا حدود اور بعدہ پوچھے گی لیکن وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی اور پھر اسی عالم میں واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

تہہ خانے کی فضاء میں عجیب سی بورچی ہوئی تھی جو اس ساری فضا کو مزید سوگوار بنا رہی تھی۔ پیر سانول جس دروازے سے اندر گیا تھا وہ اس طرح سے بند ہو گیا تھا گویا اسے پہلے کبھی کھولا ہی نہیں گیا۔ میرا تجسس بڑھ گیا کہ آخر اس دروازے کے دوسری طرف کیا ہے۔ میں نے بے اختیار ہو کر لڑکی سے پوچھا۔

”پیر سانول ادھر کیا کرنے گیا ہے؟“ شاید مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔

چپ کر..... وہ چیل کی طرح مجھ پر چھٹی۔ میں نے بڑبڑا کر اس کی پہنچ سے دور ہونا چاہا لیکن اس کے لمبے لمبے ناخن میرے گال میں اترتے چلے گئے اور مجھے یوں لگا جیسے کسی نے گرم گرم سلاخیں میرے چہرے پر پھیر دی ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یوں مجھ پر خونخوار طریقے سے حملہ آور ہو جائیگی۔ میں نے اسے زوردار دھکادیا اور وہ پرے جا گری۔

زمین پر گرتے ہی اس کی خونخواری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اب کی بار اس کی آنکھوں میں مکمل انتقام تھا میں چیخا۔

ہوش میں آؤ..... میں نے تم سے صرف پیر سانول کا پوچھا تھا۔

اس نے میرا سوال سنے بغیر آہستہ آہستہ میری طرف قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ انتقام لینے کے موڈ میں ہے۔ سردست میرے پاس اپنے بچاؤ کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر میں نے کون سا ایسا سوال پوچھ لیا ہے۔ جس نے اس مکر وہ لڑکی کو سچا کر دیا ہے۔ میں نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ میرے قریب ہی ایک اینٹ پڑی تھی۔ میں نے آؤ دیکھانے تاؤ تیزی سے اینٹ اٹھائی۔

میرے ہاتھ میں اینٹ دیکھ کر بھی وہ خوف زدہ نہیں ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ پر کوئی ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر اس نے حملے میں پہل کی تو میں اینٹ اس کے سر پر دے ماروں گا۔ ویسے خدا جانتا ہے کہ مجھے پتا تھا میں اس پر اینٹ نہیں چلا سکوں گا۔ عورت پر حملے کا مجھے ویسے بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن شاید اب مجھے زندگی میں عورتوں سے ہی نبرد آزما ہونا تھا۔ طلسمہ کو بھی تو ابھی میری مد مقابل ہونا تھا۔

لڑکی مسلسل میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں دیوار آگئی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ وہ منحوس اپنے غلیظ دانت دکھاتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ میں نے دل ہی دل میں پیر سانول کو صلواتیں سنا دیں۔ جس نے اپنی اچھی بھلی پڑھی لکھی لڑکی کو بھی کالے علم پر لگا کر تباہ کر دیا تھا۔ اس لمحے اچانک میرے ذہن میں ایک جھپکا سا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ پیر سانول نے تو کہا تھا کہ اس کی بیٹی کالے علم کی ابتدائی سڑھیوں

پر ہے لیکن وہ تو پوری طرح اس علم میں گم دکھائی دے رہی تھی۔ پتا نہیں یہ پیر سانول کی مکاری تھی یا عیاری۔ بہر حال مجھے تو یہ خطرہ پیدا ہونے لگا تھا کہ میں نے اگر اینٹ اس لڑکی کو دے ماری تو کہیں پیر سانول مجھے ہی نہ مار دے۔ عجیب مصیبت تھی ایک معمولی سا سوال پوچھنے کی پاداش میں یہ خوفناک چڑیل نما لڑکی میرے درپے ہو گئی تھی۔ میں نے کچھ دیر سوچا پھر ایک اور طریقہ آزمانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بالکل اندھیرے میں ایک تیر تھا۔ اگر نشانے پر لگ جاتا تو مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ میں نے تیزی سے یاد کرنا شروع کر دیا کہ پیر سانول نے اس کا نام کیا بتایا تھا۔ خوف اور گھبراہٹ کی جس کیفیت میں اس وقت میں گرفتار تھا اس میں تو اپنا آپ بھی بھول جاتا ہے۔ یہ تو پھر ایک مشکل نام تھا۔ میرے ذہن سے اس کا نام نکل گیا۔ ادھر وہ تھی کہ برابر میری طرف بڑھتی ہوئی آرہی تھی۔ اینٹ میرے دائیں ہاتھ میں تھی، ذہن پوری رفتار سے اس کا نام سوچنے میں مصروف تھا جبکہ آنکھیں اس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ حتی الامکان کوشش کروں گا کہ اینٹ کے استعمال کی نوبت نہ آئے۔ لیکن میرے اس فیصلے کا تمام تر انحصار اس لڑکی کی حرکت پر تھا۔ اگر وہ مجھ پر حملہ آور ہو جاتی تو پھر میرے پاس اپنے بچاؤ کے لئے اینٹ کے استعمال کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں اس کا نام آگیا۔ سینوریتا..... ہاں ہاں..... بالکل یہی نام تھا۔ میں نے لہجے کو ہر ممکن پر سکون بناتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”سینوریتا..... وہیں رک جاؤ۔“

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ ایک دم رک گئی۔ تیر صحیح نشانے پر بیٹھا تھا۔ میں نے دوبارہ کہا۔ ”سینوریتا..... میں تمہارے باپ کا خاص آدمی ہوں..... نورانا نام ہے میرا۔“

میری بات سنتے ہی اس نے یکدم ہنسا شروع کر دیا اور پھر ہنستی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں عجیب طرح کی کراہت تھی۔ نفرت سے میں نے دانت بھینچ لئے۔ پتا نہیں میرے اس جملے میں اسے مذاق کا کون سا پہلو نظر آگیا تھا۔ میں نے اپنے جملے پر دوبارہ غور کیا لیکن مجھے اس میں

کوئی بھی ہنسنے والی بات نظر نہ آئی لیکن وہ بدستور قہقہے لگاتی چلی جا رہی تھی۔

اچانک سامنے والا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور پیر سانول باہر نکلا۔ ہم دونوں پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھر آئے۔ اس کی حیرت بجا تھی۔ کیونکہ جس وقت وہ اندر گیا تھا اس وقت لڑکی اور میں کمرے کے وسط میں لا تعلق کھڑے تھے جبکہ اب ایک عجیب منظر اس کا منتظر تھا کہ کمرے کے کونے میں دائیں ہاتھ میں اینٹ اٹھائے میں چوکنا کھڑا تھا جبکہ میرے سامنے وہ لڑکی قہقہے لگا رہی تھی۔

جیسے ہی پیر سانول باہر نکلا۔ لڑکی نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور پھر یکدم چپ سادھ لی۔ پیر سانول نے چھستی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آگیا۔ میرے چہرے کی خراشوں نے اسے مزید بے چین کر دیا۔

تمہارے منہ کو کیا ہوا ہے؟

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سب اس کی مہربانیاں ہیں۔
پیر سانول چلایا۔ ”کیوں..... آخر کیوں؟“

لڑکی ایک دم سہم گئی۔ پیر سانول نے میری آنکھوں میں گھورا۔ ”تم نے اس سے کیا پوچھا تھا“

”یہی کہ تم کہاں گئے ہو“

ہوں..... پیر سانول نے ہنکارا بھرا اور واپس لڑکی کی طرف مڑا۔

”یہ میرا خاص آدمی ہے۔ آئندہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھنا“

میں ہونٹوں کی طرح کھڑا تھا۔ ایسے موقعوں پر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ لیکن میری مثال دوسری تھی۔ میں جو نہیں سوچتا تھا وہی ہو رہا تھا۔ کالے جادو کی طلسماتی دنیا مجھ پر نئے نئے دروا کر رہی تھی۔ پتا نہیں ابھی اور کیا کیا کچھ ہونا تھا۔ میں تو صرف انتظار ہی کر سکتا تھا۔

”نورے میرے ساتھ آؤ۔“ پیر سانول کی آواز نے مجھے خیالات کی دنیا سے نکالا۔ میں نے

چونک کر دیکھا۔ پیر سانول میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اینٹ فرش پر پھینکی اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ لڑکی کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

دروازے کے اندر پہلا قدم رکھتے ہی میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

اندر پندرہ بیس خونخوار کتے میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔ میری جان نکل گئی میں وہیں سے واپس بھاگنے لگا تھا کہ پیر سانول نے میرا بازو سختی سے پکڑ لیا اور غرایا۔
بے وقوف مت بنو۔ میرے ہوتے ہوئے یہ کتے تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اگرچہ مجھے پیر سانول کی شیطانی قوت پر پورا اعتماد تھا لیکن پھر بھی زنجیر کے بغیر کتوں کی آنکھوں سے جھلکنے والی کمینگی نے میرا حلق خشک کر دیا تھا۔ ان میں سے دو کتے بھی اگر مجھ پر پل پڑتے تو میں نے دو منٹ کے اندر اندران کے خونخوار دانتوں تلے دم توڑ جانا تھا۔ لیکن چونکہ اوکھلی میں سردے دیا تھا۔ اس لئے موصولوں سے ڈرنے کی بات معیوب لگتی تھی۔

میں انتہائی احتیاط کے ساتھ پیر سانول کی ہمراہی میں چلتا گیا۔ کتوں کی ٹیم ختم ہوئی تو میری نظر سامنے پڑی اور میں صمم بکیم ہو گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک صوفہ پڑا تھا۔ صوفے کی بائیں جانب دیوار کے پاس آتش دان جل رہا تھا اور آتش دان کے پاس کرسی پر ایک نہایت خوبصورت لڑکی چائے کا کپ ہاتھ میں لئے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ پیر سانول کی آواز نے میرے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیئے۔

یہ سینوریتا ہے۔!!!

اف خدایا..... میں تو اس منحوس شکل کو سینوریتا سمجھتا رہا..... اب مجھے سمجھ آ گئی کہ جب میں نے اسے سینوریتا کہا تھا تو وہ مسلسل قہقہے کیوں لگانے لگ گئی تھی۔ سینوریتا واقعی اپنے نام کی طرح سندر تھی۔ اس کی خوبصورتی اور معصومیت دیکھ کر مجھے پتا نہیں کیوں چاچی کی بیٹی شازہ ماد آگئی، ان کہی محبتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ان میں کبھی اظہار نہیں ہوتا لیکن نگاہوں

کاخن ہر معاملہ سمجھا دیتا ہے۔ پروین شاکر نے کہا تھا

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ میری بات خوشبو کی طرح اڑ کر ترے دل میں اتر جائے شازیہ کے لئے میں نے اپنے دل میں ہمیشہ ایک بے نام ساجد بہ محسوس کیا تھا۔ سینوریتا کو دیکھ کر شاید اسی لئے شازیہ کی یاد آگئی تھی۔ میں نے اسکی طرف دیکھا اور سلام کے انداز میں سر کو خم دیا۔

اس نے جوابی طور پر آہستہ سے سر کو ہلایا۔

”اور یہ کتے“..... پیر سانول نے کہا..... ”سینوریتا کی حفاظت کے لئے ہیں۔ یہ اصلی کتے ہیں جادوئی نہیں۔ یہ جب بھی کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتے ہیں تو فوراً اس پر بھونکتے ہوئے لپکتے ہیں۔ کتوں کی نظریں اس معاملے میں بڑی تیز ہوتی ہیں۔ ویسے بھی کتا وہ واحد جانور ہے جس پر جادو کا اثر نہیں ہو سکتا۔ جب کتے بلاوجہ بھونکتے ہوں تو یقیناً ان کی نگاہوں کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسا غیر مرئی منظر ضرور ہوتا ہے جسے وہ بخوبی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ تمہیں علم ہونا چاہئے کہ کتا وہ واحد جانور ہے جو کلر بلائنڈ ہوتا ہے۔ سینوریتا کو کالا علم میں اس کی حفاظت کے لئے سکھارہا ہوں لہذا ان کتوں کی موجودگی بہت ضروری ہے“ اس نے مجھے کتوں کی تعیناتی و فوائد پر اہم نکات سے بہرہ ور کرتے ہوئے کہا۔

لیکن تم تو کہتے تھے کہ تم سینوریتا کو جادوئی قوتوں سے پہچانا چاہتا ہو، میں نے فوراً کہا۔ اس سے پہلے کہ پیر سانول کوئی جواب دیتا سینوریتا بولی اس کا جواب میں تمہیں دوں گی۔ جواب یہ ہے کہ میں خود یہ علم سیکھنا چاہتی ہوں۔ بابا مجھے یہ علم سکھانے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن یہ اس وقت کالے علم کے جس مقام پر ہیں۔ بے شمار جنات اور ہوائی چیزیں ان کے تعاقب میں ہیں۔ میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں لیکن تجسس کا مادہ مجھے وراثت میں ملا ہے۔ میں ان ماورائی طاقتوں سے نمٹنا چاہتی ہوں۔ اگر میں ان سے نہیں نمٹوں گی تو یہ مجھے مار کر میرے باپ سے انتقام کی آگ ٹھنڈی کریں گی۔

میں سینوریتا کے لہجے کا اعتماد دیکھ کر گنگ رہ گیا۔ عجیب لڑکی تھی۔ لڑکیاں تو اندھیرے سے، کتوں سے، تنہائی سے ڈرتی ہیں..... مگر وہ ان میں رہنا چاہتی تھی۔

کیا جنات تمہیں تنگ کرتے ہیں..... میں نے سوال کیا اور اگلے ہی لمحے مجھے اپنے جملے کی نامعقولیت کا احساس ہو گیا۔ میں نے جلدی سے کہا..... مم..... میرا مطلب ہے کہ تمہیں خوف زدہ کرتے ہیں؟.....

”ہاں“ اس نے سر ہلایا!

کیسے؟؟؟ میرے منہ سے نکلا۔

میرا گلا دبا کر..... میرے چلوں میں گڑبڑ کر کے، میرے بستر میں آگ لگا کر..... اس نے اطمینان سے کہا۔

تمہیں ان چیزوں سے ڈر نہیں لگتا۔ میں نے حیرانی سے کہا۔
ڈر کیسا؟

کیا تم نے کسی جن کو دیکھا ہے۔ میں نے الٹا سوال کیا۔
بہت دفعہ۔

جن کتنا بڑا ہوتا ہے۔

بہت چھوٹا..... تمہارے بازو کے برابر۔

حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے تو آج تک یہی سنا تھا کہ جنات بیس بیس فٹ لمبے ہوتے ہیں۔ میری حیرت دیکھ کر پیر سانول نے مداخلت کی۔

سینوریتا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ غلط ہے کہ جنات اونچے لمبے ہوتے ہیں۔ ہر جن کا قد تین فٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اپنا روپ بدلنے پر قادر ہوتے ہیں۔ اسی کی بدولت وہ زیادہ تر لحیم ثخیم روپ میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

کیا جنات مسلمان بھی ہوتے ہیں میں نے بھرپور تجسس سے پوچھا۔ جواب سینوریتا نے دیا۔

ہاں..... جنات کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ میں نے ایک نیا سوال پوچھا۔

اگر جنات مسلمان ہوتے ہیں تو کیا مسلمان انسان کے ساتھ مسلمان جن کی شادی جائز ہے۔
میرا یہ سوال اس قدر غیر متوقع تھا کہ ایک لمحے کے لئے سب سن ہو گئے۔ میں اور بھی زیادہ
بے چین ہو گیا۔ اس نئی نوعیت کے سوال نے خود مجھے متحسّس کر دیا تھا۔ اس بار بھی سینوریتا
کے ہونٹ کھلے۔

تم نے ایک نہایت اہم اور جاندار سوال کیا ہے۔ تم نے شاید اپنے مذہب اسلام کو غور سے
نہیں پڑھا۔ ورنہ یہ سوال تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس بارے میں واضح
حدیث موجود ہے اور وہ یہ کہ ایسا نکاح مکروہ شمار ہو گا۔
میں شرمندہ ہو گیا۔

شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تم کالے علم کے پجاری ہو۔ اسلامی عقائد سے
روگردانی پر فخر کیا کرو۔۔۔۔۔۔ یہ عمل شیطان کے دربار میں تمہاری قدر و منزلت اور بھی بڑھا
دے گا۔ سینوریتا نے مجھے تسلی دی اور میرا دل چاہا کہ زمین گڑ جائے اور میں اس میں
سما جاؤں۔ ہم مسلمان اس لئے تباہ ہو جا رہے ہیں کہ قرآن غلافوں اور نماز مصلوں تک محدود
کر کے رکھ دی ہے۔ کہتے ہیں کہ نماز برائی سے روکتی ہے لیکن یہ کیسی نماز ہے جو پانچوں وقت
پڑھنے کے باوجود ہم پر اثر نہیں کرتی۔ شاید یہ نماز ہے ہی نہیں۔ یہ تو کوئی ورزش ہوتی ہے
جو ہم صبح و شام کرتے رہتے ہیں۔ سچی نماز پڑھنے والے واقعی اب بھی برائی سے رک جاتے
ہیں۔ میں سینوریتا کی باتیں سن کر ایک عجیب سے احساس کسری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ سچی بات تو
یہ ہے کہ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کالا علم سیکھنے کے باوجود اسلامی تعلیمات سے مکمل طور پر
آگاہ تھی۔ اور میں پوری طرح خود کو مسلمان کہلوانے کے باوجود اس قابل نہیں تھا کہ اس
سے خالص اسلامی موضوعات پر گفتگو کر سکتا میں نے پوچھا

”کیا تم اسلام کے بارے میں مکمل معلومات رکھتی ہو“

جواب پیرسائل نے دیا ”ہاں۔۔۔۔۔۔ یہ ہمارے علم کی مجبوری ہے۔ ہم نے قرآن کی آیتوں اور
اسلامی عقائد کو توڑ موڑ کر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہوتا ہے لہذا اسلامی تعلیمات کو

بغور نظر میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تم حیران ہو گے کہ میں نے اور سینوریتا نے قرآن حفظ کر رکھا ہے۔“

”کیا.....؟؟!! میں واقعی اچھل پڑا۔ وہ خبیث انسان میری توقع سے بھی زیادہ چالاک ثابت ہو رہا تھا۔“

”طلسمہ تمہارے اندر اب تک کتنی مرتبہ آچکی ہے“ سینوریتا نے پوچھا۔

میں نے چونک کر اسکی طرف دیکھا..... ”تقریباً چار دفعہ“

”بس.....!! سینوریتا کے لہجے میں حیرت تھی۔ اسکی حیرت سے مجھے بھی حیرت ہوئی، کیا چار دفعہ انسان کی بہت کاتبدیل ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میری آنکھوں میں حیرت دیکھ کر غالباً اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا لہذا بڑے اطمینان کے ساتھ بولی ”میں اس لئے حیران ہوئی ہوں کہ میرا خیال تھا طلسمہ کافی عرصے سے تم پر حاوی رہی ہوگی“

اب تک ایسا نہیں ہوا، آگے کیا ہو گا۔ یہ میں نہیں جانتا“

میں نے گہرا سانس لیا۔

”کیا تم اس سے چھٹکارا چاہتے ہو؟“ اس نے سوال کیا۔ میں نے طنزیہ انداز میں پیر سانول کی طرف دیکھا ”نہیں جناب..... میں چاہتا ہوں کہ طلسمہ مجھے کبوتر بنی، کنکھو را، بچھو اور گھوڑا بناتی رہے اور میں ادھر ادھر ذلیل ہوتا رہوں“ میری بات سن کر بے اختیار سینوریتا کی ہنسی نکل گئی اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میں بھی کسی کو خوش کر سکتا ہوں۔

تم سینوریتا کا سوال نہیں سمجھے..... ”پیر سانول نے پوری سنجیدگی سے کہا.....“ اس کا مطلب ہے کہ تم طلسمہ کو جان سے مارنا چاہتے ہو یا صرف پیچھا چھڑانا چاہتے ہو“

واقعی یہ سوال اہم تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے غور کیا کہ طلسمہ کو مارنے سے مجھے کیا مل جائے گا، اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ طلسمہ تو قاتلہ ہے، میرے خاندان کی، میرے ماں باپ کی..... میری خوشیوں کی، یہ خیال آتے ہی میری رگیں تن گئیں ایک دم میرا چہرہ انتقامی جذبے کے تحت سرخ ہو گیا۔ میں نے دانت پیس کر

کہا۔

”میں طلسمہ کی موت چاہتا ہوں عبرتاک موت.....“

میرا جملہ سنتے ہی سینوریتا کے چہرے پر الجھن نمودار ہو گئی۔ اس نے پریشان نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا، پیر سانول نے بھی ہونٹ سیکڑے اور کچھ دیر خاموشی سے زمین کو گھورتا رہا۔

میری سمجھ میں دونوں باپ بیٹی کی منطق نہیں آ رہی تھی۔ باوجود کوشش کے ابھی تک میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ آخر وہ مجھ سے چاہتے کیا تھے۔ کبھی مجھے یوں لگتا کہ وہ میرے ذریعے طلسمہ پر حاوی ہونا چاہتے ہیں، کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے مجھے سینوریتا کو کالے علم کی منزل تک پہنچانے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کبھی یوں لگتا جیسا پیر سانول سینوریتا کی جگہ مجھے اپنی طاقت منتقل کرنے کا سوچ رہا ہے۔ جوں جوں میں سوچتا، میرا ذہن لخت لخت ہوتا جاتا۔ اس وقت منظر کچھ یوں تھا کہ ہمارے عقب میں کتوں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ جن کی ہلکی ہلکی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ البتہ ہم تینوں خاموش تھے۔

”دیکھو نورے..... قاتل کو قتل کر دینا انتہائی معمولی نوعیت کی سزا ہوتی ہے۔ موت سزا نہیں جزا بن جاتی ہے۔ تمہارا انتقام اپنی جگہ لیکن ذرا سوچو کہ کیا طلسمہ کے خاتمے سے تمہارے ماں باپ کی زندگی واپس آجائیگی۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ جس طرح تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو ترپتے دیکھا ہے طلسمہ کو بھی دیکھو۔ طلسمہ اپنے بال نوچے، چھین مارے، تم سے عافیاں مانگے، تمہارے پاؤں پڑے..... اور تم اسے ٹھو کروں میں رکھو؟؟“

”کیا یہ ممکن ہے؟“ میں غریبا

”کیوں نہیں.....؟ لیکن صرف اس صورت میں اگر تم کالے علم کے حصول میں کوئی کوتاہی نہ برتو..... آج سے طلسمہ کی تباہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لو“ پیر سانول نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ میرے اندر شعلے سے بھر گئے۔ انسان جب غصے کی شدت پر پہنچتا ہے تو اکثر اوقات لفظ اس کا ساتھ نہیں دیتے میں بھی اس کیفیت میں تھا محبت اور نفرت کی انتہائیں قوت گویائی سلب کر لیتی ہیں۔ میں بھی گونگا ہو گیا تھا۔ ابھی تک تو میں مختلف ہاتھوں میں گیند ہی بنا ہوا تھا۔ پہلے سائیں نے مجھے استعمال کرنا چاہا۔ پھر پیر سانول نے اور اب

سینوریتا کے بھی یہی ارادے لگ رہے تھے۔ میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔
 ”میں تو تمہیں پہلے ہی اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا ہوں..... اب جیسا مناسب سمجھتے ہو
 کرو.....“

”فکر مت کرو“ سینوریتا اٹھ کھڑی ہوئی..... ”طلسمہ کی بربادی میں تم مجھے اپنے ساتھ
 پاؤ گے“

میں نے اس کے لہجے میں عجیب سی اپنائیت محسوس کی۔ پیر سانول خاموش کھڑا تھا۔ سینوریتا
 کے جملے نے مجھے بے انتہا حوصلے سے نوازا دیا تھا۔

”تم دونوں آئندہ کالائے عمل طے کر لو، میں چلتا ہوں“ پیر سانول واپس پلٹا۔
 ”ہمیں کون سا لائے عمل طے کرنا ہے“ میں نے آواز دی۔

پیر سانول نے مڑے بغیر رک کر کہا..... ”تم دونوں کو طلسمہ کی بربادی کیلئے تبت جانا ہوگا“
 اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا میں گوگو کی کیفیت میں کھڑا تھا۔
 سینوریتا نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود بھی بیٹھ گئی۔ میں نے کچھ دیر سوچا۔ پھر
 ایک کرسی سنبھال لی کتے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

سینوریتا نے فلاسک سے چائے کا ایک کپ بھر اور میری طرف بڑھایا۔ اس کا یہ اندازہ مجھے
 کسی اور ہی زمانے میں لے گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کبھی شازیہ کی محبت میرے دل سے نکل
 سکے گی۔ سینوریتا نے مجھے سوچوں کی دلدل سے نکالا۔

”چائے پیو ناں.....“

”آں..... آں.....“ میں نے چونک کر کہا اور چائے کا گھونٹ بھرا

”چائے اچھی ہے ناں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں..... بہت زیادہ.....“ میں نے تعریف کے الفاظ منہ سے نکالے ہی تھے کہ بجلی کے

کوندے کی طرح مجھے خیال آیا کہ میں آگ پر بنی ہوئی چائے کا ایک گھونٹ لے چکا

ہوں۔ میرے ہاتھوں سے کپ گر گیا اور میں چھلانگ مار کر کھڑا ہو گیا۔

یہ صورت حال میرے لئے انتہائی اچانک اور غیر متوقع تھی۔ سینوریتا یکدم پریشان ہو گئی۔ وہ کبھی شاید چائے میں کچھ ملا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ چائے تو جادو کی ہوگی۔ میں نے فوراً سینوریتا سے تصدیق چاہی۔ اس نے جو جواب دیا وہ سن کر میری رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ کہنے لگی ”یہ اصلی چائے ہے۔“

طلسمہ کی آمد کا راستہ کھل چکا تھا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے میرے اندر آنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ میں نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا، کمرے میں کتوں اور سینوریتا کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

”سینوریتا کچھ ہی دیر میں میرے اندر طلسمہ آنے والی ہے وہ میرا روپ بدل دے گی، پریشان مت ہونا اور“

لیکن تمہیں کیسے پتا ہے کہ وہ تمہارے اندر آنے والی ہے سینوریتا کے چہرے پر حیرانی تھی۔ اس کی حیرانی سے مجھے اندازہ ہوا کہ پیر سانول اگرچہ اسے میرے اور طلسمہ کے بارے میں بتا چکا ہے لیکن شاید یہ نہیں بتایا کہ طلسمہ کس صورت میں میرے اندر وارد ہوتی ہے۔ مجھے پتا تھا کہ میں اسے تفصیل بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کسی بھی لمحے میرا روپ بدل جائے گا اور پتا نہیں سینوریتا اس کا کیا اثر لے۔

”گھبراؤ مت۔ سینوریتا کی آواز آئی۔ میں کالا علم سیکھ رہی ہوں ایسی چیزیں مجھے خوفزدہ نہیں کرتیں۔“

میں اسے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ میرا جسم یکدم سن ہو گیا اور ہتھیلیاں پسینے میں شرابور ہو گئیں۔

”تم ٹھیک تو ہو؟؟؟“ سینوریتا کی آواز میں پریشانی تھی۔

میں اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا مجھے تو طلسمہ کی چاپ سنائی دے رہی تھی، میں پوری طرح آنے والے وقت کے لئے تیار تھا، طلسمہ کی آمد سے پہلے ہونے والی پراسرار خاموشی نے میرے وجود میں بھی سناٹا طاری کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی آمد کے آثار گہرے چلے

ہوتے گئے اور پھر وہ آگئی۔ کان پھاڑ قہقہے کی آواز نے میری روح تک کو لرزادیا۔
 ”ہا ہا ہا..... خبیث۔ آگیا ناں ہاتھ۔ انتہائی ذلیل موت ماروں گی تجھے۔ بس اب نہت کم
 وقت رہ گیا ہے تیرا۔“
 اس کی آواز سن کر میں دہشت زدہ ہو گیا۔

سینوریتانے میری حالت محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ بجلی کا ایک
 شعلہ سا مجھے اپنی طرف لپکتا ہوا دکھائی دیا لیکن میرے قریب آتے ہی وہ شہاب ثاقب کی
 طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔

یہ عمل ہوتے ہی طلسمہ کے قہقہے دوچند ہو گئے۔ سینوریتانے میز پر پڑی ایک انسانی کھوپڑی پر
 ہاتھ پھیر کر کچھ پڑھا اور پھر دوبارہ میری طرف پھونک ماری۔ اب کی بار مجھے یوں لگا جیسے میں
 چاروں طرف سے شیشے کے جار میں قید ہو گیا ہوں لیکن یہ حربہ بھی عارضی ثابت ہوا
 طلسمہ کے ایک قہقہے نے جار کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ سینوریتا بے وقوفی کر رہی تھی، وہ اپنے محدود
 کالے علم کی بدولت طلسمہ جیسی خبیث چڑیل سے ٹکر لے رہی تھی، شاید ابھی اسے طلسمہ کی
 صحیح طاقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ میں چلایا!!

”سینوریتا۔ کچھ مت کرو۔ طلسمہ ہر حال میں میرے اندر آئے گی۔“

”میں بابا کو بلاتی ہوں۔“ سینوریتانے تیزی سے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے
 آنکھیں بند کر کے پیر سانول کو آواز دے دی۔ اگلے ہی لمحے ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور
 پیر سانول تہمتاتے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا، وہ بہت پر جوش نظر آ رہا تھا۔ میرے
 چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ رک گیا اور بغور میرا جائزہ لینے لگا۔

طلسمہ نے ایک جست لگائی اور مجھ پر حاوی ہو گئی، اب جسم میرا اور زبان طلسمہ کی تھی۔ وہ
 میری زبان سے چلائی۔ ”پیر سانول۔ یہ لڑکا تجھے بھی لے ڈوبے گا میرے کام میں مداخلت نہ
 کر۔“

”میں تمہارے کام میں حائل نہیں ہو رہا لیکن تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں تم سامنے آ کر

مجھے سے بات کرو۔“

”میں تمہارے سامنے ہوں۔“

”اس طرح نہیں، اپنی اصلی شکل میں۔“

”ہاہاہاہا..... دھوکے سے مجھ پر وار کرنا چاہتے ہو خبیث۔ یاد رکھو میرا نام طلسمہ ہے، تم سب کی جان لے کر ہی ٹلوں گی۔ ابھی دیکھو میں اس لڑکے کے ساتھ کیا کرتی ہوں۔“

پیر سانول اور سینوریتا خاموش ہو گئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر تو میں یونہی کھڑا رہا پھر اچانک مجھے ایک چکر سا آیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں سنبھال ہی رہا تھا کہ میرا پورا جسم فضا میں پٹخیاں کھانے لگا۔ جسم کی تمام شریانوں میں خون آگ کی طرح تپ رہا تھا اور رگیں جلن کے باعث سوئیوں کی طرح چھ رہی تھیں۔ تین چار قلابازیوں کے بعد میں زمین پر گر کر تو مجھے اپنے آپ میں دواہم تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ پہلی تو یہ کہ مجھے طلسمہ نظر آنے لگی تھی اور دوسری یہ کہ اگر مرد موجود کتوں کی آوازیں میں بخوبی سمجھنے لگا تھا۔ تب مجھ پر کھلا کہ اگلے چندرہ منٹ کے لئے میں ایک خونخوار کتا بن چکا ہوں۔

کتا بننے ہی مجھے پہلی مبارک میرے ساتھیوں نے دی، سارے مل کر بھونکے۔ آؤ آؤ تم اس لڑکی کے کیا لگتے ہو۔“

میں تو حیران کھڑا تھا سر گھما کر سینوریتا کی طرف دیکھا تو اسے بھی بے چین پایا۔

میرے ساتھ والے کتے نے غرا کر کہا۔ ”کیا تم بول نہیں سکتے۔“

میں نے جواب دینا چاہا اور انہی کی زبان میرے حلق سے ادا ہونے لگی۔ یہ لڑکی میرے پیر سانول کی بیٹی ہے۔“

عام نظروں میں کوئی مجھے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی کتا بھونک رہا ہے لیکن حقیقت ہے کہ میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔

”تمہاری شکل کیسے بدل گئی؟؟؟؟“ دور سے کوئی کتا بولا۔

میں نے کوئی جواب دینے کی بجائے سامنے کی طرف گردن اٹھائی اور ڈر گیا لمبے لمبے خون

آشام ہاتھوں اور دانتوں والی طلسمہ فضا میں معلق میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس قدر بھیانک ہو رہا تھا کہ میرے جسم میں سنسنی پھیل رہی تھی۔

مجھے پیر سانول کی بات یاد آئی اس نے کہا تھا کہ کتے جنات کو دیکھ لیتے ہیں میں بھی بخوبی طلسمہ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے اس وقت ہوئی مخلوق کی سب سے بڑی اور طاقتور چیزیل طلسمہ اور کالے علم کا بہت بڑا عامل پیر سانول دونوں موجود تھے۔ پیر سانول بھی شاید طلسمہ کو دیکھ رہا تھا تاہم اس نے اس بات کو محسوس نہیں ہونے دیا۔

سب پندرہ منٹ ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں اس دوران کتوں سے گفت و شنید میں مگن ہو گیا۔

”تم لوگ مجھے غصے سے کیوں گھور رہے تھے؟“

کتا بھونکا۔ اس لئے کہ ہمارے لئے تم اجنبی تھے اور ہم اجنبیوں پر بھروسہ نہیں کیا کرتے۔“

”کیا یہاں کبھی جنات آتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔“

اس نے آہستہ سے کہا ”ہاں..... آتے ہیں، اس لڑکی کو اٹھانے کے لئے، مارنے کیلئے“

”تو پھر تم سب کیا کرتے ہو۔“

”ہم بھونکتے ہیں، ہمارے بھونکنے سے وہ فوراً غائب ہو جاتے ہیں، کبھی نہیں بھی ہوتے۔“

ابھی میں کوئی اور سوال پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ طلسمہ کی سرگوشی میرے کانوں میں پڑی۔

”موت تیرے انتظار میں ہے۔“

پیر سانول شاید منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس نے طلسمہ کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی سے اپنے ہاتھ سیدھے کئے اور طلسمہ کی طرف کرتے ہوئے کچھ پھونکا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ طلسمہ کا پورا وجود شعلوں کی رسی میں لپٹ گیا۔ وہ ایک دم تڑپ کر اٹھی شعلوں کی لپیٹ سے ٹکنا چاہا لیکن شاید پیر سانول کا وار زیادہ مہلک تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر انتہائی قہر کے ساتھ پیر سانول کو گھورا ”انتہائی مکار ہوتے ہو تم انسان لوگ۔ لیکن انتہائی بے وقوف بھی۔ بدی کی طاقتوں کو اپنے گرد لپیٹ کر یہ مت سمجھنا کہ

میرے ہاتھوں سے بچ جاؤ گے، تمہاری زندگی بھی بہت کم رہ گئی ہے اور تمہاری بیٹی کی بھی۔
یہ جال ہٹا دو ورنہ کچا کھا جاؤں گی“

پیر سانول نے پورے جلال سے کہا: ”یہ جال نہیں ہٹے گا۔ میری کچھ باتوں کے جواب دو ورنہ
یہیں دفن کر دوں گا“

میں حیران ہو گیا میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص طلسمہ پر بھی حاوی ہو سکتا ہے، اور
اس زبان میں بات کر سکتا ہے۔ طلسمہ نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر اپنا ایک بال توڑ کر شعلوں کی
طرف پھینکا، بال میں سے بجلیاں نکلیں لیکن بے سود۔

سینوریتا کے چہرے پر طہانیت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ باپ کی جیت نے اسے
مسرور کر دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں بھی پر امید ہو گیا تھا کہ اب طلسمہ سے میرا پیچھا
چھوٹ جائے گا۔

اچانک طلسمہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ پیر سانول کی آنکھوں میں
الجھن کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

”پیر سانول خبیث مجھے اپنے منتروں میں نہ تول۔ تو مجھے قابو نہیں کر سکتا صرف اس خبیث کا
باپ تھا جس نے مجھے قابو کر دکھایا ورنہ میں صرف کلیجے نکالتی ہوں۔ ہٹا یہ شعلوں کی چادر۔“
”نہیں۔“ پیر سانول گر جا۔

”ہا ہا ہا ہا..... بے وقوف انسان ایسی بات نہیں ہے کہ میں یہ چادر نہیں ہٹا سکتی۔ تم نے طلسمہ کی
طاقت کا غلط اندازہ لگایا ہے۔“

پیر سانول نے احتیاطی تدابیر کے طور پر فوری ایک اور منتر پڑھ کر پھونکا اور جیب سے ہڈی نکا
لکر دو دفعہ گھمائی۔ شعلوں کی رسی میں اضافہ ہو گیا اور طلسمہ مکمل طور پر ان میں جکڑی گئی۔
یہ رسیاں اس کا جسم بھی جلائے لگی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک ہولناک چیخ ماری اور
شعلوں کی رسیاں کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹتی چلی گئیں۔

پیر سانول بوکھلا گیا۔ اس نے تیزی سے کچھ پڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ طلسمہ پر پھونکتا اور غائب

ہو گئی۔

میں اور میرے ساتھی حیرت اور خوف کے طے جلے جذبات کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران مجھے احساس ہوا کہ میں ابھی تک اپنی اصلی شکل میں نہیں آیا۔ میں نے کمرے کی گھڑی کی طرف نظر دوڑائی اور میرا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ مجھے کتابنے میں منٹ سے بھی زائد ہو چکے تھے۔ یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ پندرہ منٹ سے زائد میں کسی دوسرے روپ میں رہا ہوں لیکن اس بار تو وقت حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ میں زور زور سے بھونکنے لگا۔

پیر سانول نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر میرے قریب آیا اور نیچے بیٹھتے ہوئے بولا۔
”کیا تمہیں طلسمہ نظر آرہی ہے؟“

میں نے نہیں میں گردن کو ہلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا شاید کتوں کی گردن نہیں مٹ نہیں ہل سکتی۔

اس نے دوبارہ مجھ سے سوال کیا اور کہنے لگا۔

”اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو میری طرف ہی دیکھتے رہو اور اگر نہیں میں ہے تو سینوریتا کی طرف دیکھو۔“

میں نے گردن سینوریتا کی طرف موڑ دی۔

پیر سانول ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں عجیب مصیبت میں پھنس گیا تھا کیسے اسے بتاتا کہ میرے کتابنے کی مدت پندرہ منٹ تھی لیکن اب معاملہ تیس منٹ تک پہنچنے کو ہے۔ وہ طلسمہ کے ساتھ مقابلے میں مجھے بالکل بھول گیا تھا۔ میں مفت میں رگڑا گیا تھا۔ اب یقیناً طلسمہ پیر سانول سے انتقام کا بدلہ مجھے تنگ کر کے لے گی۔ پیر سانول پر تو اس کا بس چل نہیں سکتا تھا لے دے کے ایک میں ہی رہ گیا تھا جس پر وہ اپنے انتقام کی خواہش پوری کر سکتی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ کتے کا یہ روپ اتنی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

یہ سوچ ابھی میرے ذہن میں ہی تھی کہ ایک آندھی سی میرے اندر داخل ہوئی اور یوں لگا جیسے کسی نے میرے جسم میں آرے چلا دیئے ہوں، میں تڑپ کر نیچے گرا، میرے اندر ہيجان برپا ہو گیا۔ میں فرش پر لوٹنیاں لینے لگا۔

پیر سانول اور سینوریتا یکدم گھبرا گئے۔ پیر سانول نے جلدی سے منہ میں کچھ پڑھا ابھی وہ مجھ پر پھونکنا ہی چاہتا تھا کہ میں اپنی اصلی حالت میں واپس آ گیا۔

میری اصلی شکل دیکھ کر پیر سانول نے اپنی پھونک وہیں روک دی۔ سینوریتا کی آنکھوں میں بھی اطمینان اتر آیا تھا۔ پیر سانول نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ساتھ لیتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا۔

باہر مکروہ لڑکی کینہ توڑنگا ہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ پیر سانول پھنکارا۔
 ”آنکھیں بند کرلو۔“

میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے ہم ہوا میں تیر رہے ہیں۔ اگلے ہی لمحے ہمارے قدم ٹھوس زمین کو چھو رہے تھے۔ میں آنکھیں کھولنا چاہتا تھا لیکن پیر سانول کی اجازت کے بغیر آنکھیں کھولنا حماقت ہوتی۔
 بالآخر اس کی آواز آئی۔ ”آنکھیں کھول لو۔“

میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو پیر سانول کے کمرے میں پایا۔ اس نے فوری طور پر مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سامنے پڑی ہوئی بوتل میں سے کچھ مخلول گلاس میں نکال کے لے آیا اسے آگ کی روشنی میں دیکھا پھر قریب پڑی ہوئی چھڑی پر کچھ پھونک کر اسے گلاس میں گھمایا اور گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

”کیا کروں؟؟؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔“

”بی جاؤ۔ فوراً“

میرے فرشتے کوچ کر گئے میں تو کبھی بھی یہ مخلول نہ پیتا مجھے کیا پتا کہ یہ کیا تھا۔ اگر کوئی حرام چیز ہوتی تو پھر؟؟؟ جس کا 98 فیصد چانس تھا۔

”پتے کیوں نہیں۔“

”مجھے پیاس نہیں“ میں نے بہانہ بنایا۔

یہ میں نے تمہیں پیاس بجھانے کے لئے نہیں دیا،“ پیر سانول گر جا۔

”بابا.....“ کمرے میں سینوریتا کی آواز گونجی۔ یہ آواز سنتے ہی پیر سانول ہمہ تن گوش ہو گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرے لئے اس نے اچھا موقع اور کوئی نہیں وہ سکتا تھا میں نے جلدی سے گلاس کا محلول دری اٹھا کر نیچے بہادیا اور خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ دو تین منٹ بعد پیر سانول نے آنکھیں کھولیں تو گلاس میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس نے تیزی سے میز پر نگاہ ڈالی خالی گلاس دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طمانیت کے آثار ابھر آئے۔ اس نے تحسین بھری نظروں سے میری طرف دیکھا پھر بولا۔

”تم کامیاب رہو گے“

”اس میں کیا تھا“ میں نے تجسس ظاہر کیا۔

میرا سوال سن کر پیر سانول کے چہرے پر حسب معمول مکروہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس نے کچھ دیر میری طرف دکھا پھر کہا ”یہ انسانی خون تھا۔“

میں کانپ گیا۔ وہ بد بخت مجھے مکمل طور پر شیطان بنانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ بروقت سینوریتا کی مداخلت سے مجھے گلاس ضائع کرنے کا موقع مل گیا تھا ورنہ پیر سانول پر کھل جانا تھا کہ میں محض کالا جادو سیکھنے کا ڈرامہ کر رہا ہوں۔

پیر سانول نے مجھے مزید ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور آرام سے سونے کی تاکید کرتے ہوئے خود باہر چلا گیا۔

میں بستر پر آگیا اور رضائی اوڑھ لی۔ اب تک کے پیش آنے والے واقعات سے کہیں بھی یہ تاثر نہیں مل رہا تھا کہ آئندہ میرے لئے حالات میں کوئی بہتری آئے گی۔ وہ ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹی۔

اس رات میں نے کئی اہم فیصلے کئے ایک تو یہ کہ میں تبت کی مدھوپھاڑی پر ضرور جاؤں گا اور

انہی دنوں میں جاؤں گا۔ اس سلسلے میں مجھے کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا تھا جو تبت جانے کا طریقہ کار بھی سمجھا سکے اور مجھے وہاں پہنچا بھی سکے۔ لامحالہ اس مقصد کیلئے میرا گھر سے نکلتا بہت ضروری تھا۔ اب یہ ایک مسئلہ تھا کہ پیر سانول کو کیسے اعتماد میں لے کر گھر سے نکلا جائے۔ مجھے یقین تھا کہ پیر سانول مجھے اس لئے بھی جانے کی اجازت نہیں دے گا کیونکہ اب میں اس کی بیٹی کے لئے زندگی کی امید تھا مجھ پر حاوی طلسمہ کو حاصل کرنے کے لئے اس کا میرے ساتھ ساتھ رہنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ایسے میں سلطان بابا مجھے بہت یاد آئے۔ بدی کے اس سارے تماشے میں ان کی یاد تازہ ہوا کا جھوٹا بن کر میرے ذہن پر نازل ہوئی جس نے پورا وجود مہکا کے رکھ دیا۔ وہ میرے ساتھ ہوتے تو یہی ایسی دعائیں بتاتے کہ پیر سانول تو کیا طلسمہ اور طلسمہ سے بھی بڑی چڑیلیں بھی دوبارہ نظر نہ آتیں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ خالی دعا بھی بے چاری کیا کر سکتی ہے۔ پٹرول کے بغیر گاڑی کہاں چلتی ہے میں کالے علم کی جس روش پر انجانے میں چل رہا تھا وہ مجھے کسی بھی سمت میں بھٹکا سکتی تھی۔

پیر سانول بلاشبہ ایک شیطان بن چکا تھا اور شیطان کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتے۔ سلطان بابا یاد آئے تو مختار چاچا کی کوٹھی بھی یاد آگئی اور شازیہ بھی۔ میں اب عمر کی جس منزل پر پہنچا تھا وہاں مجھے محبتوں کے عروج و زوال کا تو کچھ پتا نہیں تھا لیکن اتنا احساس ضرور تھا کہ کوئی ایک جذبہ ہوتا ہے جو انسان کو کسی کے لئے بے کل کئے رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے محبت دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ محبت ہمارے اندر سے پھوٹتی ہے جس طرح خوشبو کلی کے اندر سے پھوٹتی ہے۔ شازیہ سے شاید واقعی مجھے محبت ہو گئی تھی۔ یہ جذبہ پہلی دفعہ میرے دل میں جاگا تھا۔ پتا نہیں اس لمحے کیوں مجھے خواہش ہوئی کہ میں شازیہ سے ملوں اس کو دیکھوں، اب تو وہ کافی بڑی ہو گئی ہوگی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ اس گھر کی نفرتیں بھی بڑی ہو چکی ہوں گی ممکن ہے میرے جیسے غریب اور کمزور انسان کے لئے ان کے گھر کے دروازے بھی بڑے ہو چکے ہوں۔ میں اس ماحول کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن سلطان بابا اور شازیہ کی محبت ہی اتنی گہری تھی کہ میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک ان ہی کو یادوں میں کھویا رہا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب نیند آگئی ہے۔ آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔ ناشتے میں پھل اور جو س پی کر میں نے تازہ دم ہونے کی خاطر ذرا ہاتھ پیر ہلائے۔ پیر سانول تقریباً گیارہ بجے میرے کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا پروگرام ہے۔“

مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آگئی، وہ اس طرح مجھ سے پوچھ رہا تھا جیسے میں اس کے گھر مہمان آیا ہوں اور کہیں سیر پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

”میرا کیا پروگرام ہو سکتا ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے کچھ سوچا ”ایسا ہے کہ کسی بھی وقت سینوریتا اور تمہیں دوسرے ملک جانا ہے۔“

”کیا مطلب“

”مطلب یہ کہ میں تمہارے ویزے اور پاسپورٹ کا بندوبست کر رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اپنا سفر کالے علم کے زور پر طے کرو، وہاں پتا نہیں کس قسم کے حالات سے واسطہ پڑے اگر کسی نے جادو کا توڑ کر دیا تو بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا اس لئے سارا کام جینوئن طریقے سے ہونا چاہئے۔“

”کیا ہم تبت جائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

ظاہری بات ہے۔ جانا تو تبت ہی پڑے گا لیکن اس کیلئے میں نے کچھ اور پلاننگ کی ہے، طلسمہ ہماری راہ میں روڑے ضرور اٹکائے گی۔ اس لئے بہت ضروری ہے کہ تمام اہم حفاظتی تدابیر سے لیس ہو کر تبت پہنچا جائے۔“

”کیا تم بھی ساتھ چلو گے؟“ میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں۔ میں قدم قدم پر تمہارے ساتھ ہوں گا مجھے تمہارا بہت خیال ہے“ اس نے اپنے تئیں مجھ پر احسان جتانے کی کوشش کی لیکن میں سب سمجھتا کہ وہ خبیث روح اصل میں میرے لئے نہیں اپنی بیٹی کے لئے یہ ساری تگ و دو کر رہا ہے۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں پوچھنا ہیں۔“ پیرسانول کی آواز آئی۔

”پوچھو“ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”یہ بتاؤ کہ آگ پر پکی چیز کے عموماً کتنے منٹ بعد طلسمہ تمہارے اندر آتی ہے“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”تقریباً دو منٹ بعد۔“

”کیا یہ ٹائم فکس ہے؟“

”نہیں“

”کیوں“

”معلوم نہیں“

”یہ اثر عموماً کتنی دیر رہتا ہے“

”پندرہ منٹ“

”کیا یہ فکس ٹائم ہے“

”پہلے تو نہیں تھا لیکن آج بہت ہی زیادہ دیر لگی ہے۔“

”کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ میں نے طلسمہ کو شعلوں کی زنجیر میں جکڑ دیا تھا۔ پیر سانول کی بات میں وزن تھا۔ واقعی طلسمہ جب تک اس کی قید میں رہی تھی میں انسان نہیں بن سکا تھا۔ گویا میرے انسانی روپ میں واپس آنے کے لئے طلسمہ کا آزاد ہونا ضروری تھا۔ کچھ باتیں اب غور سے سنو۔ پیر سانول کی آواز میں پراسراریت آگئی اور میں آگے کو جھک آیا۔ اس کی آواز بلند ہوئی۔

”کالے علم کا یہ اصول ہے کہ جب بھی جنات سے نبرد آزما ہونا ہو تو تریاق منتر زیادہ سے زیادہ یاد کئے جاتے ہیں کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ عین وقت پر کس کا منتر کام کر جائے۔ ویسے بھی تریاق منتر تعداد میں کم ہیں اور یاد کرنے آسان ہیں۔ تریاق منتروں کی کئی اقسام ہیں۔ یہ تمام چیزیں سینوریتا تمہیں سمجھاتی رہے گی۔ ہمیں یہ کرنا ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر ”داری خار“ کرنا ہے۔

”داری خار“ یہ کیا ہوتا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

داری خار ایک تریاق منتر کے ابتدائی عوامل کا نام ہے جس طرح مسلمان لوگ نماز سے پہلے وضو کرتے ہیں اسی طرح تریاق یا کوئی بھی منتر شروع کرنے سے پہلے جس کی صورت لا علم ہو۔ ”داری خار“ کیا جاتا ہے۔ یہ ”داری خار“ انسانی خون سے ہوتا ہے۔ اس خون سے چہرہ دھویا جاتا ہے تاکہ شیطان دیوتا کی طاقتیں ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہیں اور قدم قدم پر ہماری حفاظت کریں۔

میری جان نکل گئی۔ کالا علم سیکھنے کا کہہ کر میں پھنستا ہی جا رہا تھا۔ پہلے تو خون کا گلاس میں نے ضائع کر دیا تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اب کی بار یہ ”داری خار“ والا مسئلہ ضرور ہو کر رہے گا۔ آخر میں کب تک پیر کے احکامات نظر انداز کرتا رہوں گا۔ اور پھر یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر پیر سانول کو پتا چل گیا کہ میں ہر قدم پر اس کے ساتھ دھوکا کر رہا ہوں تو وہ میری بوٹی بوٹی کر کے چیلوں کو ڈال دے گا۔ میں نے اسے اعتماد دلایا۔

کیوں نہیں۔ میں ”داری خار“ ضرور کروں گا۔
پیر سانول نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

”ہاں..... یہ کام ضرور کرنا.....“

کہیں اس بار بھی پیالہ درری کے نیچے نہ ضائع کر دینا“ میں ہکا بکا رہ گیا۔

ثابت ہوا کہ پیر سانول مجھ سے بے خبر نہیں تھا، بڑی خبیث روح تھا وہ بھی، مجھے پتہ نہیں چلنے دیا کہ اسے میری چالاکیوں کے بارے میں علم ہے۔ ہم میں سے اکثر یہی سمجھتے ہیں کہ باقی سب اس کے کر تو توں سے بے خبر ہیں لیکن بہر حال کوئی نہ کوئی تو ایسا ہوتا ہے جو ہم پر نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے جو چوری پکڑی جائے اسے فوری طور پر مان لینا چاہئے لہذا میں نے بھی دیر نہیں لگائی اور کھسیانہ سا ہو کر ہنس پڑا۔

پیر سانول گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اگر تم کالے جادو سے اتنے ہی خائف ہو تو بے شک یہاں سے چلے جاؤ“

میں اس کی بات سن کر چونک گیا اس نے اس جملے سے غالباً مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اسے میری ذات سے کسی فائدے کی امید نہیں اور نہ ہی وہ مجھے اپنے کسی مقصد کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تم جانے دو گے؟“

وہ مسکرایا..... ”کیوں نہیں..... جب چاہو..... ایک بات یاد رکھنا، تم میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، نہ مجھ سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ میں نے تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ صرف

اس لئے کیا تھا کہ تمہارا باپ میرا مرید تھا اور تم اس کے بیٹے ہو۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، میری مدد کے بغیر تم طلسمہ تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکو گے۔“

”اور اگر میں طلسمہ کو مارنا چاہوں؟؟؟“

پیر سانول نے قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔ ”اچھا تو اب سمجھا۔۔۔۔۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اپنی بیٹی اور طلسمہ کے لئے تمہیں ساتھ رکھے ہوئے ہوں، نہیں نورے۔۔۔۔۔ تم میرے لئے کچھ بھی نہیں ہو، طلسمہ کو زندہ رکھنے سے میری یاسینوریتا کی مراد یہ نہیں تھی کہ ہم اس سے فائدے حاصل کر سکیں طلسمہ کو میں تمہاری مدد کے بغیر بھی قابو کر سکتا ہوں اس کا ایک چھوٹا سا مظاہرہ تم دیکھ ہی چکے ہو، بہر حال میں بحث میں نہیں پڑتا اگر تم جانا چاہو تو بصد شوق جاسکتے ہو، تمہاری حفاظت کے لئے میں نے کچھ جادوئی اقدامات کئے تھے لیکن اب وہ بھی ہٹائے دیتا ہوں اب تم باہر جانا چاہو گے تو کوئی چیز تمہارا راستہ نہیں روکے گی“

پیر سانول نے سپاٹ لہجے میں کہا اور میرا جواب سننے بغیر باہر نکل گیا۔

میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اس لہجے سے کیا مراد لوں، یہ تو طے تھا کہ وہ بکواس کر رہا ہے میں نے اسے چپک کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مجھے اتنی جلدی بھی نہیں تھی میں یہ سارا کام تین چار روز میں کرنا چاہتا تھا میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسی ہفتے تبت کے لئے روانہ ہوں گا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا طلسمہ کی شرانگیزیوں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے پیر سانول کے پاس رہتے ہوئے چار ماہ سے اوپر ہونے کو آگئے تھے میں ہر لحاظ سے خود کو محفوظ تصور کر رہا تھا لیکن اب معاملہ دوسرا تھا، سینوریتا سے ملنے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ طلسمہ میری ہی نہیں پیر سانول کی بھی مجبوری ہے۔ ایک رات میں نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کیا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ پیر سانول نے میرے ساتھ ڈرامہ کیا ہے یا واقعی صحیح کہہ رہا تھا۔ کمرے سے باہر گھپ اندھیرا تھا چاند کی ہلکی ہلکی سی روشنی صحن میں آ۔۔۔۔۔ رہی تھی دروازے کی دیوار پر وہی کالا بلا اپنی چمکدار آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ پہلے تو مجھے خوف محسوس ہوا پھر میں نے بڑے اعتماد سے دروازے کی طرف قدم بڑھائے، میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ بلا اچھل کر میرے

سامنے آگیا۔

”ایک قدم بھی اور آگے بڑھایا تو کلیجہ چبا جاؤں گا“

اس کی آواز میں اتنی دہشت تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں اُلٹے قدموں اندر کی طرف بھاگا۔ پیر سانول گھنٹیا ثابت ہوا تھا اس نے اندھیرے میں تیر چلانے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی جذباتی باتوں سے متاثر ہو جاؤں گا اسے علم ہی نہیں تھا کہ میں یوں اسے چپک بھی کر سکتا ہوں باہر جانے والی اس رکاوٹ نے میرے اندر پیر سانول کے لئے مزید نفرت بھردی اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرا موقف ٹھیک تھا۔ میں نے چادر تانی اور سو گیا۔ موسم خاصا بدل گیا تھا اب اتنی سردی نہیں رہی تھی۔

اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو پیر سانول لمبا سا چوٹا پنپنے ٹانگیں اوپر کئے سر کے بل آنکھیں موندے کھڑا تھا۔ میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا کافی دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد اس نے ایک زقند لگائی اور سیدھا ہو گیا مجھے جاگتا دیکھ کر میرے قریب آگیا اور کرسی پر بیٹھ گیا میں بستر پر ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ کیا فیصلہ کیا ہے؟“ اس نے میری طرف دیکھا۔

میرا دل چاہا کہ اس کا منہ نوج لوں، رات والے واقعے کا مجھے بہت غصہ تھا۔ میں نے دانت پیسے۔

”تم تو کہتے تھے کہ مجھے باہر جانے کی مکمل آزادی ہے“

”ہاں تو پھر؟“ وہ چونکا

”باہر جانے سے تمہاری مراد انابلأ صحن تھی“

”کیا مطلب“

”مطلب یہ کہ تمہارا چہیتا بلا صحن سے آگے جانے پر برامنا تاہے“

”اوہ.....“ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”ہنہ.....“ میں طنزیہ انداز میں کہا ”اب کوئی نئی کہانی گھڑ لو..... ایسے تمہاری اطلاع کے لئے“

عرض ہے کہ تمہیں مجھ سے کوئی فائدہ ہے یا نہیں اس کا فوری فیصلہ کر لو کیونکہ میں دو چار روز میں تبت جانا چاہتا ہوں“

وہ میری بات سنے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں آرام سے وہیں بیٹھا رہا۔ زمین کی گرگڑاہٹ سے اندازہ ہوا کہ وہ تہہ خانے میں گیا ہے تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے چہرے پر عجیب جوش و خروش تھا۔

”نورے ہم کل تبت کے لئے روانہ ہو رہے ہیں“

میں نے منہ بنایا۔ ”ہم سے کیا مراد ہے؟“

وہ شاید میری بات سمجھ گیا تھا میرے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ دل میں کوئی بات نہ لاؤ۔ کل جس بلے نے تمہیں گھر سے باہر جانے سے روکا تھا وہ میرا نہیں طلسمہ کا بھیجا ہوا تھا یہ صرف ایک ڈراوا تھا ورنہ اگر تم گھر سے باہر چلے بھی جاتے تو وہ بلا تمہیں کچھ نہ کہتا“

”یہ تو اور بھی عجیب بات ہے تم تو کہتے تھے کہ تم طلسمہ پر حاوی ہو سکتے ہو اور اب خود ہی کہہ رہے ہو کہ طلسمہ کا بلا تمہارے گھر آگیا تھا۔ کیا تم اتنے ہی گئے گزرے عامل ہو کہ طلسمہ کا جادو تمہارے گھر پر بھی چل جاتا ہے؟“

میری بات نے پیر سانول کو آگ لگادی صاف لگ رہا تھا کہ میرے فقرے نے اسے پتا کے رکھ دیا ہے تاہم اس نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا اور کہنے لگا۔

”تم جادو کی رمز کو نہیں سمجھتے اس لئے تم سے بحث فضول ہے بہر حال آئندہ خیال رکھنا میں اس قسم کے لہجے میں گفتگو سننا پسند نہیں کرتا، تمہیں میری بات پر شک ہے تو جاؤ میرے سامنے اسی وقت باہر جاؤ، تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ کل طلسمہ کا بھیجا ہوا بلا صرف اس لئے گھر کے اندر تک آگیا کہ میں نے تمہاری آزادی کی خاطر گھر پر کیا ہوا ہر قسم کا جادو ختم کر دیا تھا اگر جادو برقرار رہتا تو اس بلے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہاں قدم بھی رکھ جاتا۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ میرے ہوتے ہوئے طلسمہ تم پر کوئی اوچھاوار نہیں کر سکے گی۔“

میں نے غور کیا تو مجھے اس کی باتوں میں وزن محسوس ہوا، عجیب مصیبت تھی ایک بندہ بیک

وقت قابل اعتبار بھی لگ رہا تھا اور مکار بھی - زندگی میں کئی دفعہ ایسی صورتحال پیش آ جاتی ہے جب سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کسی بے اعتبار پر اعتبار کرنا پڑا ہے اور اسے باور کرانا پڑتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے، سلطان بابا بتاتے تھے کہ اسے منافقت کہتے ہیں - میں نے منافقت کے زینے پر پہلا قدم رکھا اور آہستہ سے کہا -

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں معذرت خواہ ہوں کہ اس لہجے میں تم سے مخاطب ہوا“

پیر سانول میرے فوری رد عمل سے بہت خوش ہوا“

”مجھے تم پر بہت غصہ تھا کہ تم نے مجھے کالا علم سیکھنے کے جھوٹے وعدے کئے تھے لیکن فی الحال تمہارا اس معذرت نے مجھے وہ سب بھلا دیا ہے میں ابھی سینوریتا سے مل کر آ رہا ہوں مجھے فکر پڑ گئی تھی کہ طلسمہ گھر میں گھس آئی تھی تو کہیں سینوریتا کو بھی اپنے کسی طلسم میں قید کرنے کی کوشش نہ کی ہو -

”پھر.....؟؟؟“ میں نے جلدی سے پوچھا -

”بچت ہو گئی..... پیر سانول نے لمبا سانس لیا.....“

طلسمہ کو بھی شائد ہمارے ارادوں کی خبر ہو گئی ہے اس لئے اس کی بھرپور کوشش ہے کہ ہم اس تک پہنچنے نہ پائیں..... سینوریتا کالے علم کی ابتدائی سیڑھیوں پر ہے جنات کی مکاریوں سے پوری طرح واقف نہ ہوئی اس لئے کئی بار ان کی اذیتوں کا شکار ہو جاتی ہے - بہر حال تم ذہنی طور پر تیار رہنا ہم کل جی پانچ بجے یہاں سے روانہ ہو گئے -

”ہم کیسے جائیں گے؟“ میں نے سوال کیا

”میرا ایک مرید جیپ لے کر آئے گا خاصی مضبوط جیپ ہے ہم اس جیپ کے ذریعے بائی پاس سے ہوتے ہوئے کوٹ نور شاہ سے نکلیں گے - ہمیں شاہراہ ریشم سے ہوتے ہوئے چین پہنچنا ہے وہاں ایک دن قیام کے بعد ہم تبت پہنچیں گے تبت ایک چھوٹا سا ملک ہے، اگر ہم چاہیں تو انڈیا کی طرف سے بھی جاسکتے ہیں لیکن وہاں سے مزید مشکلات پیش آسکتی ہیں -

”یہاں سے شاہراہ ریشم کا سفر کتنے دنوں کا ہے؟“

”لگ بھگ تین دن لگ جائیں گے..... میں نے ضروری سامان جپ میں رکھوا دیا ہے تم احتیاط کرنا راستے میں کسی کو نہ پتہ چلے کہ ہم کس کام سے جا رہے ہیں ملک سے باہر جانے کا تو کسی صورت پتہ نہیں چلنا چاہئے اور ہاں..... آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے سختی سے گریز کرنا ہمیں کھلے آسمان تلے سفر کرنا ہے اور طلسمہ کے لئے وار کرنے کا یہ بڑا بھرپور موقع ہوگا۔“

”میں توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا ایک عجیب سی سنسنی میرے جسم میں دوڑنا شروع ہو گئی تھی۔ میں کافی عرصہ سے ایڈونچر کی اس فضا میں تھا لیکن اب میرے ساتھ اس ایڈونچر میں ایک خبیث شکل پیر اور اس کی خوش شکل بیٹی بھی ہمراہ ہونا تھی۔ جس مرید کا پیر سانول نے ذکر کیا تھا اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا کہ وہ عادات و اطوار کا کیسا ہے میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔“

میری یہ رات آنکھوں میں کئی میں ٹکڑیوں میں بٹے جاگتی آنکھوں کے خواب دیکھتا رہا ہر بار مجھے یوں لگتا کہ ہم تبت پہنچ گئے ہیں مدھو پہاڑی میرے سامنے ہے اور وہاں طلسمہ پوری آن بان سے بیٹھی ہے وہ ہماری طرف دیکھ کر ہنستی ہے اور بڑے فخر کے ساتھ قہقہہ لگا کر کہتی ہے کہ تم لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اچانک ایک طرف سے میرے والدین برآمد ہوتے ہیں انہیں دیکھتے ہی طلسمہ کے چہرے پر خوف نمودار ہو جاتا ہے میرا باپ میری طرف بڑھتا ہے اور گرج دار آواز میں کہتا ہے کہ نورے اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو اور نیست و نابود کر دو اس چیز میں کو یہ شیطان کی پیروی کا ہے اسے خدا کے کلام سے مارو۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سے قوت محسوس کرتا ہوں بڑے اعتماد سے آگے بڑھتا ہوں میرے جسم سے روشنی سی نکل رہی ہے مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر طلسمہ بھاگنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کے پاؤں زمین میں جکڑے جاتے ہیں اور وہ وہیں پر چنگاڑنا شروع ہو جاتی ہے میں اس کے قریب جا کر جو نہی اسے مارنے کے لئے قریب پڑی تلوار اٹھاتا ہوں یکدم ایک طرف سے سینوریتا نمودار ہوتی ہے اور مجھے بڑے پیار سے ایسا کرنے سے منع کرتی ہے میں اس کی ایک

نہیں سنتا اور تلوار لہراتا ہوا طلسمہ کی طرف بڑھتا ہوں طلسمہ میرے آگے ہاتھ جوڑتی ہے مگر میں نہیں رکتا۔ اسی اثناء میں سینوریتا آگے بڑھ کر میرے پاؤں پر گر جاتی ہے اور مجھے واسطے دیتی ہے کہ طلسمہ کو مت مارو ورنہ جنت مجھے ماردیں گے مجھے سینوریتا کی آنکھوں میں بے بسی کے ساتھ ساتھ پیار بھی نظر آتا ہے پتہ نہیں کیوں میں اس کی بات کا یقین کر لیتا ہوں اور تلوار پھینک کر اسے اٹھا لیتا ہوں۔ تلوار پھینکتے ہی ایک طرف سے پیر سانول نمودار ہوتا ہے اور قہقہے لگاتا ہوا میری تلوار اٹھا لیتا ہے اور پھر طلسمہ سینوریتا اور پیر سانول مل کر قہقہے لگانے لگتے ہیں۔ میرے باپ کی شبیہ دوبارہ نمودار ہوتی ہے اس کے چہرے پر افسوس ہے اور وہ مجھے بار بار کہتی ہے کہ اب تم نہیں بچ سکو گے، یہ تم نے کیا کیا..... یہ تم نے کیا کیا..... یہ تم نے کیا کیا۔

ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو میں حیران رہ گیا، سینوریتا میرے سر ہانے کھڑی تھی۔ صبح کی سفیدی میں اس کا چہرہ اور بھی خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پیر سانول آتش دان کے قریب کھڑا کوئی منتر پڑھ رہا تھا جبکہ سینوریتا کرسی کے قریب کھڑی تھی مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ تھوڑا سا مسکرائی۔ پھر بولی تم تو مجھے دیکھ کر اس طرح سے گھبرا گئے ہو جیسے میں سینوریتا نہیں طلسمہ ہوں۔“

میں شرمندہ ہو گیا۔

”نہیں ایسی بات نہیں..... اصل میں ساری رات عجیب عجیب طرح کے خواب دیکھتا رہا ہوں“

”کس کے خواب؟؟؟“ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے پیر سانول کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کئے کھڑا تھا مجھے پتہ تھا کہ اس کی آنکھیں بے شک بند ہیں لیکن کان پوری طرح سے کھلے ہیں اور مجھے زیادہ خطرہ کانوں کی طرف سے ہی تھا لہذا جواب دینے سے گریز کیا اور بات بدل لی۔

”لگتا ہے تم لوگ تیار ہو“

”ہاں، بابا ساری رات اپنی تیاریوں میں لگے رہے مجھے کچھ مختصر منتر اور بھوجن کرانا تھا اس لئے سونے کا تو وقت ہی نہیں مل سکا“

پیر سانول کا منتر شاید کچھ لیٹ تھا اس لئے میں نے جلدی سے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، حسبِ روایت دو سیب کھائے، کچے دودھ کا ایک گلاس پیا اور کرسی پر آ بیٹھا۔ اتنی دیر میں پیر سانول بھی اپنی عبادات ختم کر چکا تھا۔ مجھے تیار دیکھ کر اس نے خاصے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

”جی نورے صاحب! چلیں“

میں نے سر ہلایا۔ گھڑی میرے سامنے تھی۔

صبح ٹھیک 9 بجکر دس منٹ پر ہماری تین کی ٹیم ایک نئے مشن کے لئے روانہ ہوئی۔

میری زندگی کا شاید یہ فیصلہ کن موڑ تھا، پتہ نہیں اس مشن سے ہمیں واپس آنا بھی نصیب ہوتا تھا یا نہیں بہر حال ایک بات طے تھی کہ اب مجھے زندگی کا اتنا شوق بھی نہیں رہا تھا۔ اب آکر احساس ہوا تھا کہ زندگی کتنی معمولی چیز ہوتی ہے، سچی بات تو یہ تھی کہ کالے علم کی کارستانیوں نے مجھے مذہب سے دور کرنے کی بجائے اور بھی زیادہ قریب کر دیا تھا یہ بھی انسان کی ایک عجیب ہی کیفیت ہوتی ہے بعض اوقات آپ کو لگتا ہے کہ آپ نیکیاں کر کے اتنے آگے نکل آئے ہیں کہ پوری طرح بدی کی طرف راغب ہو چکے ہیں اور بعض اوقات بدی میں مگن ہونے کے باوجود انسان کے اندر کی نیک طبع اپنی جدوجہد جاری رکھتی ہے جس میں وہ اکثر جیت بھی جاتی ہے، میں نے زندگی کے تجربے سے سیکھا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک شیطان اور ایک فرشتہ موجود ہوتا ہے، یہ شیطان یا فرشتہ عمر کے ایک حصے میں جا کر ضرور اس پر عیاں ہوتا ہے، کچھ لوگ بچپن میں بڑے نمازی ہوتے ہیں جوانی میں بھی مسجد باقاعدگی سے جاتے ہیں لیکن بڑھاپے میں آتے ہی ان کا سارا جذبہ ایمانی ختم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ بچپن اور جوانی بہت رنگینوں میں بسر کرتے ہیں لیکن زندگی کا ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب وہ ان ساری چیزوں سے پہلو تہی کر لیتے ہیں۔ میں اگرچہ ان میں سے کسی بھی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن اس موڑ پر مجھے ایک اور احساس یہ ہوا تھا کہ ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو برائیوں کی دلدل میں پڑنے کے بعد اپنے اصل کی طرف زیادہ لوٹتی ہے۔

پیر سانول کا مرید دیکھ کر مجھے بہت مایوس ہوئی، وہ انتہائی دبلے پتلے جسم اور کالی رنگت کا ایک بھدسا شخص تھا غالباً بد صورتی کا لفظ اسے دیکھ کر ہی معرض وجود میں آیا تھا۔ بہر حال مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کون ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے وہ جس گاڑی میں آیا تھا وہ جیپ ہی تھی لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ پورا سفر نہیں کر سکے گی میں چونکہ گاڑیوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتا تھا لہذا زبان بند ہی رکھی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا، گاڑی باہر کھڑی نظر آرہی تھی میں صحن سے دروازے کے قریب پہنچا تو مجھے کوئی بلا نظر نہیں آیا۔ میں بڑے آرام سے باہر آگیا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد باہر کا ماحول دیکھا تو بے اختیار میری سانسوں میں آکسیجن کی ایک وسیع مقدار گردش کرنے لگی۔ میں نے بڑے چاؤ سے اپنے ارد گرد کے پھیلے ہوئے منظر کو دیکھا، قریبی کھیتوں کے سبزے نے مجھے عجیب مزادیا۔ سامنے قبرستان کا ہیولہ ساد کھائی دے رہا تھا میں نے ادھر سے رخ پھیر لیا۔

”اب بناؤ تمہیں باہر آنے سے کسی نے روکا ہے“ پیر سانول نے کہا
میں نے اس کی طرف دیکھا اور بڑے احترام سے کہا ”تم صحیح کہہ رہے ہو تمہاری موجودگی میں بھلا کون مجھے باہر آنے سے روک سکتا ہے“
”تم اکیلے بھی باہر آ سکتے ہو“
”جی مجھے معلوم ہے“

”بے شک اندر جا کر دوبارہ آؤ.....“ پیر سانول نے کہا
”بے حد شکریہ تمہاری پیش کش کا“ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

میرا انداز دیکھ کر سینوریتا ہنس پڑی۔

”بڑا ڈرتے ہو بھی تم جنات سے“

”ہر شخص کا باپ تمہارے باپ کی طرح عامل نہیں ہوتا“

”لیکن تمہارا باپ تو عامل تھا ناں“ اس نے بڑی گہری چوٹ کی اور میں تمل گیا۔

”تھا نہیں، بن رہا تھا.....“

”ایک ہی بات ہے.....“ اس نے کندھے اچکائے۔

”گاڑی میں بیٹھو“ پیر سانول کی آواز آئی ہم دونوں نے چونکہ کر اس کی طرف دیکھا اور گاڑی کی طرف بڑھے۔

میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ پیر سانول اور سینوریتا پچھلی نشست پر براجمان ہو گئے ڈرائیور عرف مرید نے گاڑی سٹارٹ کی اور کچھ سیڑیوں کی طرف رخ موڑ دیا گھر میں رہ رہ کر میرا جسم کافی فربہ ہو گیا تھا گاڑی کے جھٹکوں سے اچھلنا مجھے اچھا لگا۔ سامنے تاحد نظر سڑک ہی سڑک تھی میں عجیب سی سرشاری محسوس کر رہا تھا کالے علم کی ڈراؤنی راتوں نے مجھ سے دن کا سارا نشہ چھین لیا تھا، دن کو دیکھنا بھی تو ایک نشہ ہوتا ہے خدا نے سورج نہ بنایا ہوتا تو شاید ہم سب ظلمتوں کے اندھیرے میں ہی ڈوبے رہتے۔ میں سامنے سڑک کو تکتا رہا اور جیب دھیرے دھیرے پیر سانول کے گھر سے دور ہوتی چلی گئی۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر میں ٹرائی میں چھپ کر آیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ قسمت کے چکر بھی کتنے عجیب ہیں، آج سے کچھ عرصہ پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اسی سڑک پر دوبارہ جیب میں بیٹھ کر پیر سانول اور سینوریتا کے ساتھ گزروں گا۔ سینوریتا کا خیال آتے ہی میں نے تھوڑا سا دائیں کو ہوتے ہوئے شیشے میں سے جھانکا۔ وہ بھی شاید ادھر ہی دیکھ رہی تھی، میں نے گہرا کر نظریں پھیر لیں۔

ڈرائیور کا نام ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا نہ ہی پیر سانول نے بتایا تھا میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

نورگیر نام لالو ہے ”میں حیران ہو گیا۔

پیر سانول ہنس پڑا، شیطان کی طاقت بہت بڑی ہے نورے لالو خود اتنا زبردست کالا علم جانتا ہے، تمہارے نام کا پتا چلانا اس کے لئے کون سا مسئلہ ہے؟.....“

”اوہ.....“ میں نے ہونٹ سیکڑے، میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ پیر سانول کا ڈرائیور کیسے کوئی عام بندہ ہو سکتا ہے۔

”کیا ہم مسلسل تین دن سفر کریں گے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں..... آرام بھی کریں گے“

”کہاں“

”جہاں رات پڑ گئی“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، کیا گاڑی میں ٹھہریں گے؟“

”اس کی تم فکر نہ کرو.....“ سینوریتا بولی..... ”بابا کے موکل رہائش کے سلسلے میں تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آنے دینگے“

”گویا ہماری رہائش کا انتظام بھی جنات کریں گے“ میں کانپ گیا۔

یہ عجیب لوگ تھے ان کے بس میں ہوتا تو سانس بھی جنات کی مدد سے لیتے۔ ہماری گاڑی مناسب رفتار سے سفر کرتی رہی۔ تین گھنٹے تک سفر کرتے رہنے کے باوجود ابھی تک ہم نے کہیں قیام نہیں کیا تھا۔ سڑک آگے سے غالباً تبدیل ہو گئی تھی کیونکہ اگر ہم اس سڑک پر چل رہے ہوتے تو لامحالہ ہم نے شہر پہنچ جانا تھا لیکن ابھی تک شہر کا نہ آنا ظاہر کر رہا تھا کہ گاڑی درمیان میں کوئی اور موڑ مڑ چکی ہے۔

”تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟“ سینوریتا کی آواز آئی۔

”نہیں.....“ میں نے ٹکسا جواب دیا۔

”میں نے تم سے نہیں لالو سے پوچھا ہے“ سینوریتا بولی اور میں نے خود کو چغد محسوس کیا۔ لالو

بولاً۔

”نہیں..... آپ لوگ اگر کچھ کھانا چاہتے ہیں تو حاضر کئے دیتا ہوں“

”مجھے جادوئی کھانا نہیں چاہئے..... شہر کتنا دور ہے“

”تقریباً 20 کلو میٹر کا فاصلہ ہے“

ہاں تو شہر سے ہی کوئی اچھی سی چیز لے لینا“

”تمہیں جادوئی کھانا کیوں نہیں پسند“ میں نے ناگ اڑائی

”اس سے پیٹ نہیں بھرتا“

”ہاں یہ تو ہے..... میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی، اس لمحے میں نے پچھلی سیٹوں پر نظر ڈالی۔ میرے ہوش اڑ گئے.....“

پیر سانول وہاں نہیں تھا۔ صرف سینوریتا بیٹھی تھی۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر سینوریتا نے مجھے تسلی دی۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں..... بابا کسی ضروری کام سے گئے ہیں ابھی آجاتے ہیں“

عجیب بات کی تھی اس نے بھی، یہ تو ایسے تھا جیسے کوئی آدمی گھر میں بیٹھا ہو اور ذرا سی دیر کیلئے اٹھ کر باہر چلا جائے۔ میں پیر سانول کی قوت کا قائل ہو گیا۔ واقعی وہ کالے جادو میں بہت آگے تک جا چکا تھا۔

”کام کیا تھا“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو انہیں ہی پتا ہو گا“ سینوریتا صاف جھوٹ بول گئی، میں نے بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

لالو اس دوران بڑے سکون سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مٹی نے سینوریتا کی طرف مڑ کر دیکھا اور چونک گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”تم ٹھیک تو ہو“

لالو نے ایک دم جیپ روک دی۔ اور گھوم کر پیچھے دیکھا، سینوریتا بے ہوشی کے عالم میں تھی

وہ تیزی سے نیچے اتر اور جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ شیشی میں غالباً خون تھا اس نے دو تین چھینٹے سینوریتا کے چہرے پر مارے، سینوریتا نے ایک جھر جھری سی لی لیکن اپنی حالت سے باہر نہیں نکلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں باہر کو اہل پڑیں اور ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔ میری چیخ نکل گئی۔ میں باہر نکلا ہی چاہتا تھا کہ اس نے ایک جھٹکے سے میرا بازو پکڑ لیا۔

”جتنے بوٹی بوٹی کر کے کھاؤں گی تیرا سینہ ادھیڑوں کی..... ہا ہا ہا..... میں پوری قوت سے خود کو چھڑا رہا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے میرے مقابلے میں دس پہلوان ہیں میری گٹھی گٹھی سی چھینیں بلند ہونے لگیں۔ لالو مسلسل کچھ پڑھ کر سینوریتا پر پھونکے جا رہا تھا، اچانک اس نے جیب سے ایک تعویذ نکالا اور سینوریتا کی طرف بڑھا، سینوریتا نے بیٹھے بیٹھے کھڑکی میں سے اٹے ہاتھ کا تھپڑ اسے جزدیا، وہ میری آنکھوں کے سامنے اڑتا ہوا دور سڑک پر جاگرا۔ اتنی دیر میں مجھے موقع مل گیا اور میں گرفت ڈھیلی دیکھ کر ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر نیچے اتر اور بھاگ نکلا۔ یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ سینوریتا خود تو وہیں بیٹھی تھی لیکن اس کے ہاتھ لمبے ہوتے جا رہے تھے اور میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ گاڑی سے نکل کر سڑک کے پار تک چلے گئے تھے اور میرے بہت قریب پہنچ چکے تھے میں لمبا چکر کاٹ کر بھاگتا ہوا گاڑی کی پشت پر آگیا، ہاتھ میرے تعاقب میں تھے میں نے اس عالم میں گاڑی کے دو تین چکر کاٹے اگر کوئی اس وقت یہ منظر دیکھ لیتا تو دوسرا سانس نہ لے سکتا لالو سڑک سے دور پڑا تھا گاڑی کے اندر سینوریتا خون آشام بلا کی طرح قہقہے لگا رہی تھی اور گاڑی کے گرد اس کے ہاتھ دھاگے کی طرح لپٹے ہوئے تھے۔ یہ سڑک شاید اتنی گنجان نہیں تھی کیونکہ کافی دیر سے کوئی اور گاڑی یا بندہ نظر نہیں آیا تھا مجھے تو یہ علاقہ ہی بڑا خوفناک لگ رہا تھا، بھاگتے بھاگتے میں نے پیچھے دیکھا اور میری چیخ نکل گئی، ہاتھ کسی پتنگے کی طرح میرے اوپر اوپر آ رہے تھے۔ میرا دھیان اس طرف ہوا ہی تھا کہ مجھے زمین سے زوردار ٹھوکر لگی اور میں اچھل کر نیچے جاگرا۔ میرے نیچے گرتے ہی ہاتھ سے قہقہوں کی آواز آئی اور انہوں نے مجھے گردن سے دبوچ لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم سے روح نکلی جا رہی ہے۔ ہاتھ اسی طرح

مجھے گردن سے پکڑے واپس ہوئے جس طرح سے آئے تھے۔ وہ مجھے لئے گھوم رہے تھے گاڑی کے گرد، درختوں کے گرد..... میری آنکھیں باہر نکل آئی تھیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بس پورا جسم پلٹنیاں کھائے جا رہا تھا جگہ جگہ سے رستے ہوئے زخم اور پے در پے ٹھوکروں نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کر لی تھیں اسی لمحے ایک معجزہ ہو گیا۔ یکدم ہاتھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور میں جیپ کے اوپر گر پڑا، گرتے وقت پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ پیر سانول آگیا ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہل بھی سکتا میرا سانس آخری مرحلے پر تھا

میں ہانپتے ہوئے زور زور سے سانس لینے لگا۔ جیپ کی چھت پر ہونے کی وجہ سے میں نیچے کا منظر دیکھنے سے قاصر تھا صرف کھلا آسمان مجھے نظر آرہا تھا کافی دیر تک میں گم صم پڑا رہا پھر جیسے ہی کچھ ہوش آیا میں نے گرتے پڑتے خود کو سنبھالا اور چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ ٹانگوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اتنی سی چھلانگ میں بھی میرا بوجھ سنبھال سکتیں۔ لہذا میں الٹ کر دور جا گرا۔ میرے حلق سے کراہیں بلند ہو گئیں۔ پورا جسم چھل گیا تھا میں نے چارونا چار خود کو کسی نہ کسی طرح کھڑا کیا اور واپس مڑا ادھر عجیب ہی منظر تھا۔

سینوریتا گاڑی کے اندر بے ہوش پڑی تھی جبکہ لالو کی گردن تن سے جدا ہو کر ڈرائیونگ سیٹ پر پڑی تھی۔ میرے ہاتھ پیر کا پنے لگے لالو کی کٹی ہوئی گردن میری طرف دیکھ رہی تھی اس کے چہرے پر عجیب سا خوف تھا۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ میں بھاگنا چاہتا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا کہ میرا وقت آگیا ہے۔ ہر طرف سناٹا تھا پتا نہیں کون سی جگہ تھی جہاں دن کے وقت بھی کوئی نہیں تھا بس اجازت کھیت تھے اور وہ کچی سڑک۔

میں نے ہمت کر کے کلمہ پڑھا اور پاؤں اٹھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پھر سو رقیاسین کی پہلی لائن یاد کر کے پڑھی اور ہلنے کی کوشش کی لیکن خوف سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اماں کہا کرتی تھیں کہ آیہ الکرسی سے جنات بھاگ جاتے ہیں۔ میں نے فوری طور پر آیہ الکرسی یاد کی جو مجھے بھول گئی میں نے بے اختیار ”آیہ الکرسی..... آیہ الکرسی کہنا

شروع کر دیا۔۔۔۔۔ میرا پورا جسم کانپ رہا تھا اور میں چلائے جا رہا تھا۔ چلاتے چلاتے مجھے ہوش نہیں رہا اور میں بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا ہاں جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی درخت کی چھاؤں میں تھا پیر سانول میرے گال تھپتھپا رہا تھا اور سینوریتا ہاتھ میں پانی کی بوتل لئے کھڑی تھی ہوش میں آتے ہی ایک لمحے میں سارا منظر میرے ذہن میں گھوما اور میں نے پھر چلانا شروع کر دیا۔ پیر سانول نے مجھے حوصلہ دیا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ تم محفوظ ہو“

”وہ۔۔۔۔۔ سینوریتا۔۔۔۔۔ میں نے اشارہ کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ جو شکل تم نے دیکھی وہ سینوریتا نہیں تھی بلکہ اس کے اندر جنات کی شرارت تھی“

”میں ہٹھ کر اٹھ گیا۔۔۔۔۔ جنات سے اس قدر پالا پڑا تھا کہ اب تھوڑی دیر بعد ہی حالت سنبھل جاتی تھی پیر سانول نے میرے زخموں پر نظر ڈالی اور کچھ سوچتے ہوئے اپنی دائیں جیب سے ایک عجیب سی ہڈی نکالی۔

”لیٹ جاؤ“ اس نے مجھے تاکید کی اور میں زمین پر سیدھا لیٹ گیا۔ پیر سانول نے ہڈی میرے پورے جسم پر پھیرنی شروع کر دی۔ جہاں جہاں ہڈی پھیری جا رہی تھی میرے زخموں میں ٹھنڈ سی پڑتی جا رہی تھی، پیر سانول منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا بھی جاتا تھا۔ کچھ دیر تک یہ عمل دہرانے کے بعد اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میں بھلا چڑگا ہو گیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سینوریتا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

”جب تم کتے بنے تھے تو میں تو نہیں ڈری تھی“ اس نے جملہ کسا

”میں نے تمہیں کاٹا بھی نہیں تھا، تم نے تو میری گردن دو بوجلی تھی۔

وہ کھلھلا کر ہنس پڑی اور میرے زخم مزید ٹھیک ہو گئے۔

”دیکھو نورے۔۔۔۔۔ جنات کو ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا ہے طلسمہ اپنی پوری برادری کے

ساتھ ہمیں روکنے لگی کوشش میں ہے پوری طرح تیار ہو کر سفر کرنا“
 ”اور تم کہاں گئے تھے؟؟“ مجھے یاد آگیا۔

پیر سانول نے دانت پیسے“ میں سمجھ گیا ہوں جنات کی چال..... وہ مجھے کسی اور طرف الجھا کر تم دونوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں میں آج کل کلونت شاکا چلہ کر رہا ہوں ابھی کچھ دیر پہلے جنات نے اس چلے کی جگہ کو آگ لگا دی۔ میں فوری طور پر جیپ میں سے وہاں پہنچا وہاں انہوں نے مجھے مختلف حربوں سے روکے رکھا اور ادھر اپنا کام دکھا گئے۔ مجھے لالو کا افسوس رہے گا وہ بے چارہ کالے علم کے درمیان میں ہی مارا گیا۔ اپنے مریدوں کو ہزار دفعہ سمجھاتا ہوں کہ بلاوجہ جنات سے مت الجھو لیکن ہمیشہ نافرمانی کرتے ہیں اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ خیر گولی مارو اس قصے کو لالو اتنا اہم بھی نہیں تھا۔“

میں اس خبیث کی بے حسی پر کڑھ کر رہ گیا۔ اپنے مرید کی موت کا اسے اتنا ہی افسوس تھا جتنا کسی کو اپنی مرغی کے مر جانے پر ہوتا ہے۔

”اب جیپ کون چلائے گا؟“ میں نے پوچھا

”میں خود چلاؤں گا“ پیر سانول بولا

”اور اگر تمہیں کچھ ہو گیا یا تم پہلے کی طرح غائب ہو گئے تو؟؟؟“

”تو پھر بابا سے بہت اچھی جیپ میں خود ڈرائیور کر لیتی ہوں“ سینور بتا بولی۔

میں اس کی طرف دیکھنے سے بھی پرہیز کر رہا تھا مجھے اس کی شکل میں وہی خوفناک چڑیل نظر آتی تھی جو میری گردن دبوچنے کے درپے تھے۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے اس لئے بھی حیرانی نہیں ہوئی کہ مجھے اس کا یقین تھا تاہم اب سوال تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر سے لالو کی گردن کون اٹھائے گا۔ میں نے سوال کرنے کی بجائے یہ عمل دیکھنے کو زیادہ ترجیح دی ہم تینوں جیپ کی طرف بڑھ گئے۔ لالو کی کٹی ہوئی گردن وہیں پڑی تھی۔ البتہ اس کا جسم دور جھاڑیوں میں لٹکا نظر آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینور بتا نے بڑے آرام سے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پچھلی سیٹ پر رکھ کر خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ میری پیشانی پینے میں تر ہو گئی۔ عجیب

لڑکی تھی یہ بھی انسانی کھوپڑی کو یوں پاس رکھ لیا تھا جیسے وہ کوئی کھلونا ہو۔
 ”اے یہیں کہیں دفنادیتے ہیں“ میں نے تجویز پیش کی۔ میری بات سن کر دونوں باپ بیٹی
 ہنس پڑے۔

”یہ کوئی مسلمان تھا جو اسے باقاعدہ دفنایا جائے“ پیر سانول بولا۔
 مسلمان نہ بھی ہو پھر بھی محفوظ طریقہ تو یہی ہے ناں“

”کوئی ضرورت نہیں.....“ سینوریتا نے کندھے اچکائے ”مجھے اپنے ایک چلے کے لئے انسانی
 دماغ چاہئے تھا اب شہر نہیں جانا پڑے گا“..... اس نے یہ بات کچھ اس انداز سے کی کہ میرے
 دماغ میں کیڑے سے ریگنے لگے میں ہتھکتا اس سے خوف محسوس کرنے لگا تھا۔ پتا نہیں کب
 اس کا موڈ بن جائے اور میرا کلبہ کھانے کی فرمائش کر بیٹھے۔ ”تم تو کہتی تھیں کہ تم کالا علم اچھا
 خاصا جانتی ہو پھر جنات تمہارے اوپر کیسے حاوی ہو گئے؟؟؟“

سینوریتا کو غالباً میرا یہ جملہ اچھا نہیں لگا اسی لئے قدرے ترشی کے ساتھ بولی۔
 ”میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ جنات اب بھی مجھے تنگ کرتے ہیں“

”اس کا مطلب ہے تم سے بچ کر رہنا چاہئے“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا..... سینوریتا بات
 کی تہہ تک پہنچ گئی اور مسکرانے لگی۔

اسی لمحے پیر سانول نے جیب سارٹ کی اور ہم ایک بھیانک حادثے کو یکسر بھلاتے ہوئے
 آگے روانہ ہو گئے۔

لالو کی گردن کو سینوریتا نے کچھ پڑھ کر غائب کر دیا تھا۔
 شہر کی حدود شروع ہوتے ہوتے بھی کافی دیر لگ گئی۔

راستے میں پیر سانول نے سینوریتا کے لئے نان اور پکوڑے خریدے۔ لڑکیاں لاکھ پڑھ لکھ
 جائیں امیر ہو جائیں، فیشن کرنے لگیں..... پکوڑوں سموسوں سے ان کی دلچسپی کبھی ختم نہیں
 ہوتی۔ میرے منہ میں بے اختیار پانی بھر آیا۔ وہ بڑے مزے سے چلنی کے ساتھ لگا لگا کر
 پکوڑے کھا رہی تھی اور میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں ابھی جھنڈا مار کر

اس کے ہاتھ بے نان پکوڑے چھین لوں گا۔ ذائقہ بھی قدرت کی ایک انمول نعمت ہے۔ مجھ سے زیادہ اس نعمت کی قدر کون جانتا ہوگا۔

”کھاؤ گے؟؟؟“ اس نے چھیڑنے کے انداز میں پوچھا۔

”اور اگر کھانے کے بعد طلسمہ نے مجھے بھی پکوڑا بنا دیا تو؟؟؟“

وہ ہنس پڑی ”پھر کیا ہے..... سامنے ریڑھی والے کی کڑاہی میں ڈال دیئے“

میں نے ایک آہ بھری..... کڑاہی میں تو میں پہلے ہی تلا جا رہا ہوں کبھی ادھر کبھی ادھر..... میں نے چپ سادھ لی۔

جیپ پھر سے اگلے سفر پر روانہ ہو رہی تھی۔ پیرسبانول بڑی خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اس کی ڈرائیونگ بتا رہی تھی کہ وہ بہت اچھا ڈرائیور ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص جنات کو قابو میں کئے ہوئے ہے۔

جنات کے خیال سے میرا دھیان اسی طرف ہو گیا۔ میں نے پیر سانول کو مخاطب کیا۔
 ”تم نے مجھے ہمزاد کے بارے میں تو تفصیلاً بتایا تھا لیکن جنات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ
 مخلوق آخر ہے کیا؟“

پیر سانول نے سامنے سے نظریں ہٹائے بغیر کہا ”لگتا ہے تم نے قرآن کا سرسری بھی مطالعہ
 نہیں کیا۔ میں تمہیں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ سنو! قرآن میں ایک جگہ نہیں
 بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حقیقت سے کیا گیا ہے کہ وہ الگ مخلوقات ہیں جن
 کا مادہ تخلیق بھی الگ ہے۔ انسان جنات کو نہیں دیکھ سکتا لیکن جنات انسانوں کو دیکھ سکتے
 ہیں۔ جنات نہ صرف انسانوں کی باتیں سنتے ہیں بلکہ انہیں سمجھتے بھی ہیں۔ انسان کی طرح
 جنات بھی ایک باختیار مخلوق ہیں ان میں اخلاق لحاظ سے اچھے، بُرے اور اعتقادی لحاظ سے
 مسلم اور حق سے منحرف دونوں طرح کے جنات پائے جاتے ہیں۔ جنات اللہ کے وجود اور
 اس کے رب ہونے کے منکر نہیں ہیں لیکن نبوت اور کتب الہی کا سلسلہ جنات کے ہاں جاری
 نہیں ہوا۔ جس طرح پہلا انسان مٹی سے بنایا گیا اسی طرح پہلا جن خالص آگ کے شعلے

سے پیدا کیا گیا گویا اس پہلے جن کی حیثیت جنات کے معاملے میں وہی ہے جو آدم علیہ السلام کی حیثیت انسانوں میں ہے۔ جنات چونکہ خالص آتشیں اجزاء سے مرکب ہیں اس لئے وہ خاکی اجزاء سے بنے ہوئے انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ہم نے جنات اور انسانوں کو عبادات کے لئے پیدا کیا“ دوسری جگہ قرآن کی سورہ رحمن میں ارشاد ہوتا ہے ”حق تعالیٰ نے انسان کو پھرنی کی طرح جمی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور جن کو آگ کی لپیٹ سے پیدا کیا“ قرآن کے مطابق جنات حضرت آدم علیہ السلام سے بھی بہت عرصہ پہلے پیدا کئے گئے تھے سورہ حجر میں آتا ہے ”ہم نے انسان کو سیاہ اور سرے ہوئے مٹی کے گارے سے پیدا کیا“ ارشادات خواجہ معین الدین چشتی اجمیری میں درج ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اس سر زمین پر وارد ہونے سے قبل اپنے اصلی وجود میں سکونت پذیر تھے اس وقت ان کو یہ طاقت حاصل نہیں تھی کہ جب چاہیں پرندہ بن جائیں، جانور، سانپ یا ہوا بن جائیں۔ یہ طاقت اللہ نے انہیں تب عطا کی جب ان کو اس کردار ضعی پر بھیجا۔ جنات کو حکم دیا گیا کہ اب وہ پہاڑوں غاروں اور جنگلات کو اپنا مسکن بنائیں۔ اس کے عوضانہ میں ان کو یہ طاقت عطا کی گئی کہ جو انسانی یا حیوانی شکل چاہیں اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ان کی اوسط عمر بھی 150 سال کی بجائے 1500 سال کر دی گئی۔ تمہارے انبیاء علیہ السلام میں سے حضرت سلیمان کو جنات پر کامل اختیار دیا گیا تھا بلکہ حضرت سلیمان کے سامنے ملکہ مہربا اپنے تخت کے ہمراہ آنکھ کے جھپکنے کے عرصے میں ہی جنات نے سامنے لار کھی تھی، اس واقعہ کا ذکر تمہارے قرآن میں بھی ملتا ہے۔ تمہاری احادیث میں بھی متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمہارے رسول ﷺ نے جنات میں بھی تبلیغ کی اور متعدد جنات نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔“

میں پیر سانول کی معلومات پر انگشت بدنداں تھا اس کے بات کرنے کا مدلل انداز دیکھ کر میں بہت متاثر ہو رہا تھا۔ وہ ہر چیز حوالے کے ساتھ پیش کر رہا تھا۔ اگلی بات سنا کر اس نے مجھے اور بھی حیران کر دیا۔ کہنے لگا!

میں نے اس دن بھی تمہیں جادو کے بارے میں بتایا تھا آج موقع ملا ہے تو چند چیزیں مزید ذہن نشین کر لو اگرچہ تم ابھی تک کالا جادو سیکھنے کے لئے سنجیدہ نہیں ہوئے لیکن یہ چیزیں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں جانتا ہوں تم جادو ضرور سیکھو گے۔۔۔ طریق کار کے لحاظ سے جادو کی دو بڑی قسمیں بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک ”ایمیتھو میجک Imitative Magic اور دوسری کو کنٹیکس میجک Contagious Magic کہا جاتا ہے اول الذکر اپنی تخریبی قوت میں کسی ویلے یا درمیانی واسطے کا محتاج نہیں ہوتا جب کہ دوسری قسم میں کسی پر جادو کا اثر پیدا کرنے کے لئے کس ذاتی واسطے یا درمیانی کڑی کا سہارا لینا پڑتا ہے یہ درمیانی کڑی کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے جس کو مسور انسان کافی عرصہ سے استعمال کرتا رہا ہو یا وہ جو اس کے جسم سے تعلق رکھتی ہو مثلاً اترن، بال، ناخن وغیرہ۔ چنانچہ دنیا کے جن خطوں میں جادو ٹونے کا رواج زیادہ ہے وہاں کے لوگ اپنی فوٹو کھنچوانا پسند نہیں کرتے مبادا کوئی دشمن ان کی شبیہ کو استعمال کر کے جادو نہ کر دے ٹونا کہتے ہیں امیٹھو میجک کو اس کے عمل میں منحوس ساعتوں اور بدشگون گھڑیوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے قدیم پر اسرار رسوم ادا کی جاتی ہیں اور ساتھ ساتھ تین منٹروں کا جاپ بھی جاری رہتا ہے ٹونا محدود مگر واضح تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لہذا یا تو اسے زمین میں دبا دیتے ہیں یا جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی بہتے ہوئے پانی میں بھی پھینک دیتے ہیں اسی لئے اس قسم سے تعلق رکھنے والے تعویذ گنڈے بہت کم محفوظ حالت میں ملتے ہیں۔ تاہم اس کے کچھ نادر نمونے آکسفورڈ کے عجائب گھر میں موجود ہیں ان میں ایک نہایت کریہہ صورت گزبھر لمبا خاکی کی پتلا ہے جس کا تمام جسم سویوں اور میٹھوں سے چھدا ہوا ہے۔ 1889ء میں یہ سکاٹ لینڈ کے میجر گرانٹ کی دہلیز پر پڑا ہوا ملا تھا۔ میجر گرانٹ نے اس کے وار سے بچنے کے لئے ”لی یارک“ نامی جادوگر کے حوالے کیا جادوگر نے اس پتلے کو بے اثر کر کے تڑوا دیا بعد میں گرانٹ نے اس پتلے کے ٹکڑے جمع کر کے عجائب گھر کے حوالے کر دیئے۔ آکسفورڈ کے عجائب گھر ”آبشمو لین“ میں بھی ایسا ہی مٹی کا ایک پتلا محفوظ ہے یہ بت محفوظ بندشوں میں جکڑا ہوا ہے جس پر کسی

نامعلوم زبان میں منتر لکھے ہوئے ہیں اسی طرح ایک پتلا محبت کے ٹونے سے متعلق ہے یہ بادامی رنگ کے کاغذ پر چسپاں ہے یہ دیکھنے میں ذرا بھی دہشت ناک نہیں اس کے گرد مر جھائے ہوئے پھولوں کا حاشیہ بنا ہوا ہے۔ یہ نظریہ بھی عام ہے کہ جتنی سوئیاں پتلے میں گاڑی جائیں گی دشمن اتنا ہی شدید عذاب میں مبتلا ہوگا۔ جب خواہش ہوتی ہے کہ دشمن ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مرے تو یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ کوئی سوئی اس کے دل کو نہ چھونے پائے۔ لیکن اس کے برعکس جب دشمن کو فوراً ہلاک کرنا مقصود ہو تو سوئیاں عین پتلے کے قلب میں اتار دی جاتی ہیں۔ ریگنسا کاٹ اپنی کتاب *Discovery of Witch Craft* میں لکھتا ہے کہ اس عمل کے دوران برہنہ بیٹھ کر سفلی منتر پڑھے جاتے ہیں جادو کے ذریعے تعویذ گنڈے اور عملیات کی دو اقسام ہوتی ہیں پہلی ”ابراکیدابرا“ *Abra Cadabra* اور دوسری ”سیٹر“ *Sator* کہلاتی ہے اس کے چند نمونے آکسفورڈ کی ”بوڈلیاں لا بیری“ *Bodleian Library* میں محفوظ ہیں۔ یہ سولہویں صدی کی یادگار ہیں۔ یہ طویل اور مختصر مخطوطوں پر مشتمل جادو کی تختیاں ہیں۔ طویل ترین جادو کی تختی دو مخطوطوں پر مشتمل ہے جس کی تیاری میں سرخ سیاہی استعمال ہوئی ہے جب کہ بڑی اور طویل جادو کی تختیاں سیاہ اور سرخ رنگ کے موٹے اور زیبائشی حروف میں لکھی ہوئی ہیں سرخ رنگ سفلی تعویذوں کی نشاندہی کرتا ہے جو خون سے لکھے جاتے ہیں مذکورہ بالا دونوں جادو کی تختیاں لاطینی منتروں، مناجاتوں، مقدس کتب کے کلمات اور سحر آفرین ہندسی علامتوں جیسے دائروں سے بھری ہوئی ہیں اس طرح کا ایک نقش انگلستان میں 1335 کی جنگ کے ایام میں جلایا گیا تاکہ جنگ کی تباہ کاریوں سے بچا جاسکے دوسرا نقش 1466 میں کیمبرج کے مقام پر نذر آتش کیا گیا۔ پٹریور *Pittwer* کے عجائب گھر میں ایک نمونہ پایا جاتا ہے یہ ایک شیشے کا جگ ہے جس کی گردن پر ایک باریش انسان کی شبیہ کندہ ہے، یہ جگ 1904ء میں ولیٹ منٹر کی ایک خشک ندی سے برآمد ہوا، جب اس کا ڈھکن کھولا گیا تو اس میں سے ایک بھورے رنگ کے کپڑے کا چھتڑا نکلا اسے کسی نے دل کی شکل میں کاٹا تھا

جس میں چھوٹی چھوٹی سی پنیں جیسی ہوئی تھیں اس کے علاوہ انسانی بالوں کا گچھا اور کٹے ہوئے ناخن بھی تھے غالباً کسی مرد نے عشق کے لئے کسی عورت پر جلاو کیا تھا اسی عجیب گھر میں مویشیوں کو سندرست کرنے والا ایک ٹونا بھی موجود ہے جس کے ساتھ ایک کانڈ پر درج ہے ”ایک بیل کا دل نکال لو، اس میں نونئی سوئیاں اور نونئی میخیں گاڑ دو، پھر آدمی رات کو اندھیرے میں سات دفعہ منتر پڑھو جو کتاب میں لکھے ہوئے ہیں پھر اسے جلا کر رکھ لڑاؤ۔“ یہ ٹونا یارک شائر کے جانورنگن کا کارنامہ تھا جس کے کمال فن کی 1830ء میں بڑی دھوم مچی تھی اس کے کالے علم پر لوگوں کو اندھا اعتقاد تھا وہ ایک عجیب کام کیا کرتا تھا جلاو کا ہر منتر پہلے خود پر آزماتا تھا کسی کو آگ لگانا ہوتی تو پہلے خود کو جھلساتا کسی کو لڑت دیتا ہوتی تو پہلے خود اس سرطے سے گزرتا کالے جلاو کا یہ طریقہ کار ہوتا تو انتہائی سرلیج الاثر ہے لیکن آج تک کوئی اسے مکمل طور پر کر نہیں سکا اس طرح جنات کو واضح طور پر موقع مل جاتا ہے کہ وہ کسی بھی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قتل کر سکیں۔

”جنات کی زبان کیا ہوتی ہے؟“ میں نے تجسس سے بھرپور سوال کیا۔

”یہ ہر زبان بول سکتے ہیں ہمارے ہاں کے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں پر جنات نہیں آسکتے۔ حالانکہ جنات اور بھوت پریت سے متعلق جتنا کام انگریزوں نے کیا ہے دنیا میں افریقیوں کے بعد شاید ہی کسی نے کیا ہو جب کوئی جن کسی انسان کے اندر آتا ہے تو پھر وہ دنیا کی کوئی بھی زبان بول سکتا ہے تمہارے قرآن میں ارشاد ہے کہ ”جنات میں فرمانبردار بھی ہیں اور بے انصاف بھی۔“

میں نے جلدی سے پوچھا ”کیا جنات کو بھی سزا ملے گی؟“

پیر سانول نے ایک گہرا سانس لیا ایک لمحے کے لئے سڑک پر سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھ ل۔ پھر بولا۔

”تمہارے مذہب کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو قرآن کے مطابق ہے کہ ”جنات میں سے جو بھی نافرمان ہوں گے ان کو عذاب ہوگا۔“

میرے ذہن میں ایک نیا خیال پیدا ہوا میں نے اسے سوال کی شکل میں پوچھا۔
 ”یہ بتاؤ کہ کیا سائنس ان کو تسلیم کرتی ہے؟“

”جن ایک ایسی مخلوق ہے جو زمین پر انسانوں کے آباد ہونے سے بہت پہلے بستی تھی اور اسی شکل میں اب تک آباد چلی آ رہی ہے۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب کرہ ارض سورج کی طرح گرم تھا اور یہاں آب و ہوا اتنی سازگار نہ تھی کہ انسان آباد ہو سکیں جنات کا وجود آگ سے بنایا گیا ہے اور اس دور میں کرہ ارض اس غیر مرئی مخلوق کا مسکن تھا چونکہ یہ مخلوق آگ یعنی توانائی یا حرارت سے بنی ہوئی تھی اس لئے بے پناہ قوتوں کی مالک تھی اور اب بھی ہے سائنس کی رو سے انسان ابھی تک اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا کہ ان قوتوں کا سراغ لگا سکے۔ یہ کوئی جنونی ہی کر سکتا ہے میرے جیسا.....“

پیر سانول نے آخری جملہ بڑا آہستہ سے کہہ کر تھوڑی دیر تک چپ رہا پھر گویا ہوا۔
 ”ہزاروں سال قبل کا انسان کیا یہ بات سوچ سکتا تھا کہ ریڈیائی لہروں کے ذریعے آواز اور تصویر ہزاروں میل کی دوری تک منتقل کی جاسکتی ہے۔ آج کا ٹیلی ویژن اس کی واضح مثال ہے۔ اب اگر سائنس اس چیز کا جائزہ لے رہی ہے کہ ٹھوس شکل کی چیزوں کو توانائی میں بدل کر ہزاروں میل دور دوبارہ ٹھوس شکل میں چند لمحوں کے اندر منتقل کیا جاسکے تو یہ بھی آنے والے دور میں ممکن ہو گا۔ اس ساری بات کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جنات ایک حقیقت ہیں یہ اور بات ہے کہ موجودہ ذہنی سطح پر لوگوں کی اکثریت اس کی سائنسی توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہے عہد حاضر کے بعض مفسرین اور مفکرین نے ”جن و انس“ سے مراد دیہی اور شہری آبادیاں لی ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ بعض مفسرین نے بعض ایسی قرآنی آیات بھی بیان کی ہیں کہ جن میں جنات کو آتشیں مخلوق قرار دیا گیا ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ..... اگر جنات مسلمان بھی ہوتے ہیں تو کیا ان کی قبریں بھی ہوتی ہیں؟“
 میں نے کافی دیر سے پلٹے والا سوال اٹھا۔

”نہیں..... آتش مخلوق کی قبر نہیں ہوتی۔“

”تو پھر یہ مرتے کیسے ہیں اور مرنے کے بعد کہاں جاتے ہیں؟“

جنات کی جان بھی عزرائیل کے ہاتھوں قبض ہوتی ہے اور جب ان کا وقت آخر آتا ہے تو اس مقصد کے لئے ان کو آگ کا کوڑا..... پوری قوت سے مارا جاتا ہے۔ اطرح وہ آگ میں بھسم ہو جاتے ہیں۔ ان کی ذاتیں رہن سہن اور ضروریات بالکل ہماری طرح ہیں لیکن یہ مخلوق غیر معمولی طاقت کے باوجود خود نہیں کماتی۔ یہ انسانوں کی کمائی میں سے حصہ لینا اپنا فرض سمجھتے ہیں یہ فقال اچھے ہوتے ہیں مگر کوئی چیز خود سے نہیں بنا سکتے۔ فصل کے موقع پر یہ ہر خرمن سے بقدر ضرورت اناج اٹھا کر لے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر کسان کھیتوں میں پہلے خرمن کے گرد کڑا دیتے ہیں پھر اس کا وزن کرتے ہیں اور جو ایسا نہیں کرتے ان کا اناج تخمینے سے بہت کم نکلتا ہے جنات طالب علم بن کر سکولوں اور کالجوں میں تعلیم تو حاصل کرتے ہیں مگر ملازمتیں یا کاروبار نہیں کرتے۔“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ درست ہے؟“

پیر سانول ہنسا..... ”جھوٹ وہاں بولا جاتا ہے جہاں خوف یا مفاد ہو اور میرا خیال ہے نہ میں تم سے خوفزدہ ہوں اور نہ ہی تم سے کوئی مفاد ہے۔“

بات تو اس کی ٹھیک تھی میں نے تھوڑی سی گردن پیچھے گھمائی۔ سنویر تیا آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی جیب کا ماحول خاموش خاموش سا ہو گیا تھا۔

میں نے جیب میں لگی گھڑی کی طرف نگاہ ڈالی ہم اس وقت ہائی وے پر سفر کر رہے تھے سڑک پر زیادہ بہتات ٹرکوں کی تھی ہمیں میدانی علاقہ پر کر کے پہاڑی علاقے میں داخل ہونا تھا سورج کی تپش آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ جب سورج مکمل طور پر غروب ہو جائے گا تو ہم کہاں ٹھہریں گے تبت کے اس سفر میں مجھے واپسی کی کوئی امید نہیں تھی ہمارا یہ سفر موت کا سفر تھا۔ آریپار ہونے کا یہ منصوبہ ہی ہماری زندگیوں کی ضمانت تھا سامنے سڑک پر نظریں جمائے میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ پتا نہیں میں اس ملک میں اس فضا

میں اس ہوا میں دوبارہ آ بھی سکوں گا یا نہیں۔

”جاننے ہو یہ کون سی جگہ ہے؟“ پیر سانول نے سکوت توڑا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے دور ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا جو آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا میں نے غور سے اسے دیکھنا شروع کر دیا جیسے ہی بورڈ مزید قریب ہوا اس پر لکھا نام پڑھتے ہی میری آنکھیں پتھر ہو گئیں۔ بڑے بڑے حروف میں تیر کے نشان کے ساتھ لکھا تھا۔“

”چک مومن۔ گب 18“

پاکستانی
داتا گرام

مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں ایک لمحے کے لئے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا یہ میرا گاؤں تھا بالکل وہی گاؤں جہاں میرا بچپن گزرا تھا جہاں میں نے کھیتوں سے گئے چرائے تھے جہاں میں نے چھیل چھیلی راتوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ ”لکن میٹی“ کھیلی تھی۔ جہاں میں یتیم ہوا تھا۔

پیر سانول بھی غالباً میری کیفیت سے آگاہ تھا۔ اس لئے اس نے جیپ کو مزید آہستہ کر دیا جیپ ہمارے گاؤں کی اس نے جیپ کو مزید آہستہ کر دیا جیپ ہمارے گاؤں کی بیرونی سڑک سے گزر رہی تھی میرا دل بھر آیا میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آنکھوں کی نمی کوئی اور بھی دیکھے لیکن آنسو شاید کبھی بھی اپنا آپ نہیں چھپا سکتے انہیں ہزار چھپ کر بہایا جائے یہ اپنا آپ ظاہر کر ہی جاتے ہیں۔

نورے تمہیں بھوک نہیں لگی کچھلی سیٹ سے سینوریتا کی آواز آتی میں اسے کیا جواب دیتا میرا تو پورا چہرہ آنسوؤں میں تر تھا۔ اس نے یہ سوال ایسے وقت میں پوچھ لیا تھا جب میں اپنی آواز کسی بھی طور قابو رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس موقع پر پیر سانول نے بات سنبھالی۔

اس کو بھوک اس لئے نہیں لگی ہوگی کہ اس نے صبح کافی سارے پھل اور جو س پیا تھا۔

لیکن اب تو شام ہو رہی ہے سینوریتا نے یاد دلایا۔

وہ تو ہے لیکن ظاہری بات ہے جب اسے بھوک لگے گی اسی وقت کھائے گا ناں۔ خیر تم سامنے دیکھو کتنے خوبصورت سرسبز کھیت ہیں۔

سینوریتا سامنے دیکھنے لگی اور میں پیچھے کی زندگی میں جھانکنے لگا یہ وہ جگہ تھی جہاں سے میں نے پہلی بار اپنے پاؤں پر چلنا سیکھا تھا چہروں کی پہچان سیکھی تھی لیکن شاید دلوں اور رویوں کی پہچان نہیں سیکھ پایا تھا میں جادوئی اثر تلے ارد گرد دیکھتا جا رہا تھا میرے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی وہ کچی سڑک بھی آگئی جو سیدھی ہمارے گھر کی طرف جاتی تھی یہ کچی سڑک اتنے سالوں بعد بھی کچی تھی البتہ اس کی سائیڈوں پر پختہ اینٹوں کی ایک لائن سی جڑدی گئی تھی جو غالباً بارش کے دنوں میں پانی کی پھسلن سے بچانے کے لئے تھی۔

ادھر چلیں؟ پیرسانول نے میری طرف دیکھا میں نے جواب دینے کی بجائے گھٹنوں میں سر دے دیا۔ اس نے چیپ روک دی۔

بابا ادھر کیا ہے؟ سینوریتا نے حیرانی سے پوچھا۔

ادھر نورے کا گھر ہے۔

نورے کا گھر؟؟ وہ مزید حیران ہو گئی۔

ہاں۔ کافی سال پہلے نور ابھی ادھر ہوتا تھا اور میں بھی اس وقت نورے سے میری جان پہچان اٹنی نہیں تھی یہ بچہ ہوتا تھا اکا باپ مجھ سے کالاً علم سیکھا کرتا تھا تم ان دنوں شہر والے گھر میں ہی تھیں میں نے اپنا آستانہ اسی گاؤں میں بنا رکھا تھا نورے کا باپ طلبہ کے ہاتھوں مارا گیا اور اسی غم میں اس کی ماں بھی چل بسی۔ نورے کو اس کا چچا اپنے پاس شہر لے آیا جہاں اس کے ناروا سلوک سے تنگ آکر یہ بھاگ نکلا۔ پیرسانول نے میری داستان کا خلاصہ بیان کیا۔

ادھ۔ سینوریتا نے ہونٹ سکیڑے۔

میرے آنسوؤں کو جواز مل گیا تھا میں باقاعدہ ہچکیاں لینے لگا ان ہچکیوں کے درمیان ہی میں

نے پیر سانول کو چپ گاؤں کی طرف موڑنے کے لئے کہا۔
 شاید اسے بھی پتا تھا کہ میں یقیناً ایسا کہوں گا لہذا اس نے چپ سٹارٹ کی اور اسے کچی سڑک پر
 ڈال دیا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں میں اپنے گھر تک پہنچنے سے پہلے کوئی ایسا منظر نہیں دیکھنا چاہتا
 تھا جو میری سوچ کی دیواروں کو منہدم کر دیتا جو مجھے احساس دلاتا کہ میں گاؤں سے کتنا کٹ
 چکا ہوں دھول اڑاتی چپ تقریباً بیس منٹ کے ہچکولوں کے بعد رک گئی غالباً ہمارا گھر آگیا
 تھا میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چہرہ اوپر اٹھایا اور حیران رہ گیا یہ تو قبرستان تھا میں نے پیر
 سانول کی طرف دیکھا۔

گھبرانے کی ضرورت نہیں میں قبرستان کی طرف تمہیں اس لئے لایا ہوں تاکہ تمہیں ایک
 چیز دکھا سکوں۔

مجھے کوئی چیز نہیں دیکھنی تم گھر کی طرف چلو میں نے چلا کر کہا میری آواز آنسوؤں سے لبریز
 تھی۔

پیر سانول کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے برہمی کے آثار ابھرے لیکن اسی لمحے سینوریتا بولی
 بابا واپسی پر یہاں آجائیں گے۔

پیر سانول نے جواب دینے کی بجائے چپ کو گیر میں ڈالا اور دانت پر دانت جمائے سٹیرنگ
 سیدھا کر کے ایک سیلٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

چپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی میں اب سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ راستہ اگرچہ خاصا بدل گیا
 تھا لیکن ایسا بھی نہیں کہ پہچان سے باہر ہو جاتا میں نے غور سے دیکھا یہ وہ گلی تھی جس میں
 حمید نائی کا گھر تھا مجھے یاد تھا کہ حمید نائی کے گھر پر کبوتروں کا ایک بہت بڑا چھجلاگا ہوا تھا جو اس
 کے گھر کی واضح نشانی تھا میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھروں کی چھتیں دیکھنے لگا۔

اس گلی میں صرف چار پانچ گھر ہو کرتے تھے لیکن اب تعداد خاصی بڑھ چکی تھی کبوتروں
 کے چھجے کی بجائے مجھے ہر گھر پر اٹینا لگا ہوا نظر آیا۔ ہر گھر میں بجلی کی تار جا رہی تھی دروازوں
 پر بجلی والی گھنٹی بھی ہر ایک نے لگوا رکھی تھی۔

ذرا آہستہ چلو میں نے پیر سانول سے کہا۔

جیپ مزید آہستہ ہو گئی۔

باوجود کوشش کے مجھے حمید نائی کا گھر نظر نہیں آسکا۔ آگے سے جیپ الٹے ہاتھ موڑ لینا سامنے سرسوں کا کھیت ہو گا وہاں سے پھر بائیں طرف موڑ لینا۔ میں نے پورے اعتماد سے کہا یہ گاؤں اور اس کے سارے راستے میرے دیکھ بھالے تھے پیر سانول نے ایسا ہی کیا۔ گلی ختم ہوتے ہی اس نے جیپ الٹے ہاتھ موڑ دی اور میں دھک سے رہ گیا سرسوں کے کھیت کی جگہ پختہ سڑک گزر رہی تھی جو آگے چل کر غالباً بڑی سڑک سے مل جاتی تھی۔ کھیت تو کوئی نہیں..... سینور یتا بولی۔

بہر حال تم بائیں جانب ہی چلو..... میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ پیر سانول نے سر ہلادیا اور اسی لمحے میری نظر ایک درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹے ہوئے بوڑھے پر پڑی میں چونک اٹھا وقت کی لہروں نے اپنا جال اس کے چہرے پر بن دیا تھا لیکن اس جال کے عقب میں اس کے نقوش اب بھی میرے لاشعور کو جھنجھوڑ رہے تھے۔

روکو، رکو، جیپ روکو میں نے جلدی سے کہا اور پیر سانول نے جھٹ سے بریک لگا دی۔ میں جیپ کی کھڑکی سے بوڑھے کو تنکے لگا۔ میرا دماغ پوری طرح سے اپنے گوشے کھٹکانے میں مصروف تھا میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیپ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا گاؤں کے دس بارہ بچے اس دوران جیپ کو گھیرے میں لے چکے تھے یہ ننگ دھڑنگ بچے جیپ کے شیشے میں سے اچھل اچھل کر سینور یتا کو دیکھ رہے تھے میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا بوڑھے کے قریب پہنچ گیا وہ چارپائی پر بے سدھ لیٹا ہوا تھا قریب ہی بد شکل چائے کا پیالہ دھرا تھا جس پر کھیاں بھنور رہی تھیں چارپائی کے ایک طرف لائٹھی پڑی تھی دوسری طرف لمبی نال والا حقہ دھرا تھا حقے کی ٹلی بوڑھے کے سینے پر بے پرواہی سے دھری تھی چارپائی کے نیچے بوسیدہ سی چپل دھری تھی۔ بوڑھے نے شاید میری آمد کو محسوس نہیں کیا تھا اس لئے میرے قریب آنے پر بھی اس کی آنکھیں بند ہی رہیں۔

میں کافی دیر تک اس کے پاس کھڑا رہا لیکن باوجود کوشش کے نہ جان سکا کہ وہ کون ہو سکتا ہے
انتی دیر میں غالباً بوڑھے کو حقے کی طلب ہوئی اس نے آنکھیں کھولے بغیر ہی سینے پر سے حقے
کی تلی اٹھا کر منہ میں ڈالی۔

میں کھنکرا۔ بوڑھے نے چونک کر آنکھیں کھولیں مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے تلی منہ سے
ہٹالی اور تکیہ سیدھا کر کے بیٹھ گیا۔
کون ہو پتر تم؟

باباجی میرا نام نور ہے نور محمد۔

اچھا اچھا بیٹھو ادھر بیٹھ جاؤ باباجی سمٹ گئے۔

میں چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

کہاں سے آئے ہو؟

باباجی کے سوال نے مجھے غصے میں ڈال دیا کچھ دیر سوچا پھر ایک جواب گھڑ لیا۔

باباجی میں شہر سے آیا ہوں۔

اچھا اچھا۔ تو تم سڑک بنانے والے ہو باباجی نے اندازہ لگایا..... غالباً گاؤں میں سڑک بنانے
والی کمپنی کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔

نہیں بزرگو۔ میں گورنمنٹ کا ملازم نہیں ہوں میں تو..... میری بات ابھی ادھوری ہی تھی
کہ اچانک میرے عقب سے بچوں کی چیخیں سنائی دیں بچوں کا چیخنا کوئی غیر معمولی بات نہیں
ہوتی لیکن ان چیخوں میں خوف کا جو عنصر شامل تھا اس نے مجھے چونکا دیا میں نے ایک جھٹکے سے
دوسری طرف دیکھا گاؤں کے بچے خوفزدہ چہروں کے ساتھ جیپ سے پرے ہٹتے جا رہے
تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا میں تیزی سے جیپ کی طرف بڑھا مجھے جیپ کی طرف آتا
دیکھ کر بچے اور بھی ڈر گئے اور دور جا کر سہی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے جیپ
کے پاس آکر میں نے پیر سانول کی طرف دیکھا وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آنکھیں موندے ٹیک
لگائے پڑا تھا جب کہ سینوریتا بچھلی نشست پر شرارتی انداز میں مسکرا رہی تھی میں دوسری

طرف سے گھوم کر اپنی سیٹ پر آیا اور دروازہ بند کرتے ہی پوچھا ”بچے چیخے کیوں تھے؟“
 سینوریتا کھلکھلائی..... ”مجھے دیکھ کر“۔

”تمہیں دیکھ کر کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ بار بار شیشے کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے اور مجھے الجھن سی محسوس ہو رہی تھی
 میں نے بڑی دفعہ انہیں اشارے سے منع کیا کہ وہ چلے جائیں لیکن وہ مکھیوں کی طرح آتے
 جا رہے تھے مجبوراً مجھے یہ سب کرنا پڑا“
 ”کیا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں..... بس ذرا سا روپ بدلا تھا اتنا ڈراؤنا تو نہیں تھا لیکن بہر حال اس کا فائدہ یہ
 ہوا کہ اب جیب کے قریب کوئی نہیں“ سینوریتا کی بات سنتے ہی مجھے غصہ آگیا وہ بلاوجہ ہمیں
 مشکوک بنا رہی تھی۔

”یہ تم نے بہت برا کیا تم نہیں جانتیں کہ گاؤں کے لوگ توہمات کے مارے ہوئے ہوتے
 ہیں۔ انہیں اگر شک بھی پڑ گیا تو تمہارا تعلق جادو ٹونے سے ہے تو یہ ایک پل بھی تمہیں
 برداشت نہیں کریں گے“

”نورا ٹھیک کہتا ہے“ پیر سانول کی آواز آئی۔

”اوہو۔ بابا میں نے تو اپنے بچاؤ کی خاطر ایسا کیا تھا“ سینوریتا نے دلیل دی۔

”گاؤں والے بھی اپنے بچاؤ کی خاطر ہی ایسا کریں گے“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ابھی ہم
 اپنی باتوں میں لگے ہوئے تھے وہی ہوا جس کا ڈر تھا دو تین دیہاتی مرد جیب کی طرف آتے
 دکھائی دیئے۔

میں بڑبڑایا اب دیکھاناں۔ بتاؤ ان کو کیسے مطمئن کیا جائے؟ جواب ملنے سے پہلے ہی وہ جیب
 کے پاس آگئے انہوں نے بڑے روکھے انداز میں سلام کیا اور پیر سانول سے پوچھا کہ ہم
 کون ہیں؟

میں سمجھ گیا تھا کہ اب مزید کوئی بہانہ بنانے کی بجائے صاف بات کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ لہذا

فوراً کہا۔

میں اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں اور کافی عرصے بعد گاؤں آیا ہوں مجھے اپنے گھر کی تلاش ہے۔

میری بات سن کر وہ چونکے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا ایک دیہاتی نے میرا نام اور گھر کا راستہ پوچھا میرے بتانے پر وہ عجیب سی الجھن میں پڑ گیا پھر کھڑکی کے اندر سر کر کے بولا۔

یہ بی بی تمہاری کیا لگتی ہے؟

میں نے بے اختیار سینوریتا کی طرف دیکھا اس سوال نے اس کے چہرے پر عجیب سے رنگ بکھیر دیئے تھے تاہم میں نے پیر سانول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شہر میں میری فیکٹری کے مالک ہیں اور یہ بی بی ان کی بیٹی ہے۔

دیہاتی کچھ دیر آپس میں کھس پھسرتے رہے بچے اس دوران جیب سے بہت پیچھے ڈرے ڈرے انداز میں کھڑے سینوریتا کی طرف اشارہ کر رہے تھے انہیں شاید دنیا بھر کے کھلونوں کے لالچ بھی دے دیئے جاتے تو وہ کبھی بھی سینوریتا کے قریب نہ جاتے۔

تم لوگ ہمارے مہمان ہو ٹھہرنا چاہو تو ہماری طرف ٹھہر سکتے ہو ایک نے کہا۔

بہت شکریہ۔ میں نے خوشدلی سے کہا یہ دیہاتی شاید میرے جانے کے بعد اس گاؤں میں آکر آباد ہوئے تھے اس لئے مجھ سے میرے باپ کے نام سے نا آشنا تھے اسی لئے میں نے باپ کو جاری رکھتے ہوئے کہا ہمیں آج ہی واپس جانا ہے وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر سلام لے کر چلے گئے۔

شام کا اندھیرا رات میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا میں نے تو ابھی بوڑھے سے باتیں کرنا تھیں میں جیب سے اتر اور میرا منہ لٹک گیا باباجی کی چارپائی تو موجود تھی لیکن باباجی ان کا حقہ اور جوتی موجود نہیں تھی۔ غالباً گھر چلے گئے تھے۔

میں واپس جیب میں آ بیٹھا۔

تم بوڑھے سے کیوں ملنا چاہ رہے ہو؟ پیر سانول نے پوچھا۔
مجھے یاد نہیں پڑ رہا کہ یہ بوڑھا گاؤں کا کون سا فرد ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اسے پہلے مل چکا ہوں۔

پیر سانول مسکرایا۔

میں بھی اس سے مل چکا ہوں۔

تم..... کب..... کہاں..... کیسے؟؟ میں چونکا

ان سارے سوالوں کا جواب یہ ہے کہ یہ بوڑھا بھی مجھ سے کالا علم سیکھتا رہا ہے اس نے دھماکا کیا۔

پیر سانول کی بات نے میرے اندر تھر تھلی مچادی وقت کی گرد سے اٹے ہوئے اس بوڑھے کے چہرے پر ایسی کوئی علامت مجھے نظر نہ آئی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ اس مکروہ عمل میں ملوث رہا ہے۔ اس کے چہرے پر تو عجیب سا اطمینان تھا میں بوڑھے سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ نام بتاؤں اس کا؟؟ پیر سانول کی آنکھوں میں مکارانہ مسکراہٹ اتر آئی میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہنے لگا یہ شکور انائی تھا۔

شکور انائی..... میں تڑپ اٹھا ایک دم مجھے سب کچھ یاد آگیا اسی نے تو مجھے بتایا تھا کہ میرا باپ کیسے مرا تھا۔ شکورے نائی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ میرا باپ اور وہ دونوں اکٹھے پیر سانول کے پاس کالا علم سیکھنے جاتے تھے لیکن شکور اچھے ہٹ گیا جب کہ میرا باپ اس منحوس علم کو زیادہ سے زیادہ سیکھنے پر لگا رہا مجھے یوں لگا جیسے میرا سانس گھٹ رہا ہے میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکلنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے نے کھلنے سے انکار کر دیا میں نے دو تین دفعہ زور لگایا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔

باہر جانا ٹھیک نہیں رات ہو رہی ہے ہمیں کہیں ٹھہرنا چاہئے یا نکل جانا چاہئے پیر سانول نے اطمینان سے کہا مجھے غصہ آگیا دروازہ کھولو۔ میں شکورے نائی سے ملنا چاہتا ہوں۔
کس لئے؟؟ پیر سانول نے کہا۔

تاکہ تاکہ میں چپ ہو گیا واقعی میں شکورے سے کس لئے ملنا چاہتا تھا اب تو ساری کہانی ختم ہو چکی تھی راکھ کریدنے سے کیا فائدہ تھا بیس سال پرانی راکھ میں سے کسی شعلے کی کیا امید رکھی جاسکتی تھی۔

اپنے گھر کا راستہ یاد ہے؟ پیر سانول نے پوچھا۔

ہاں سیدھا چلو۔ میں نے مختصر جواب دیا۔

جیپ کے ماحول میں خاموشی چھا چکی تھی گاؤں کے گھروں میں بلب روشن ہو چکے تھے پیر سانول نے بھی جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن کر لیں گاؤں کے لوگ اگرچہ ہم سے واقف نہیں تھے تاہم محسوس ہو رہا تھا کہ مختلف گھروں کے دروازوں کی درزوں سے بے شمار نسوانی آنکھیں ہمیں گھور رہی ہیں میں ایک نظر اپنے گھر کو دیکھنا چاہتا تھا اگرچہ طلسمہ کی پراسراریت کا خوف اب بھی میرے دل میں موجود تھا لیکن اب اس کی نوعیت مختلف تھی دو تین گلیوں میں گھومنے کے بعد ہم نسبتاً کھلی گلی میں آ گئے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا یہی ہمارے گھر والی گلی تھی اس کے آخر میں ٹکڑ والا گھر ہمارا تھا۔

جیپ جیسے ہی ہمارے گھر کے پاس رکی میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اب کی بار دروازہ با آسانی کھل گیا تھا میرے نیچے اترتے ہی سینوریتا اور پیر سانول بھی نیچے آئے۔ اپنے گھر کا دروازہ دیکھ کر میرے روئیں روئیں سے آنسو ابل پڑے اپنا گھر اپنے بچے اور اپنے والدین۔ یہ تین چیزیں ذرا سے وقفے بعد بھی دیکھنے کو ملیں تو آنکھیں ہی نہیں پورا جسم روتا ہے۔ میں بھی غم آلود ہو رہا تھا ہلکے ہلکے اندھیرے میں رو بوٹ کی طرح چلتا ہوا میں دروازے کے قریب پہنچا تو مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ دروازے پر کسی قسم کا کوئی تالا نہیں لگا ہوا تھا وہ اندر سے بند تھا اور باتوں کی آوازیں آرہی تھیں یہ کون تھے؟؟ ہمارے گھر پر تو تالا لگا دیا گیا تھا میں اس گھر کا مالک تھا۔ میری مرضی کے بغیر کون لوگ یہاں رہائش پذیر تھے میں نے غصے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باتوں کی آواز بند ہو گئی اور کسی کے قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف آتی سنائی دی۔ کون؟؟؟ ایک نسوانی آواز آئی۔

دروازہ کھولیں میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

آپ کون ہیں؟؟ آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ ناگواری بھی تھی۔

بی بی آپ کسی مرد کو بھیجیں میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔

ابو گھر میں نہیں آپ اپنا نام بتادیں آواز میں شائستگی آگئی۔

میرا نام نور محمد ہے آپ کے ابو کب تک آجائیں گے ان کا تو پتا نہیں ٹھہریں میں امی کو بلاتی ہوں وہ غالباً اندر کی طرف بھاگی تھوڑی ہی دیر میں کسی اور کے قدموں کی چاپ سنائی دی پیر سانول اور سینوریتا خاموشی سے کھڑے تھے۔ آنے والی عورت جو غالباً لڑکی کی ماں تھی۔ تیکھے لہجے میں بولی۔

کیا بات ہے بھائی صاحب؟ مجھے یوں لگا جیسے میں گاؤں میں یہ آواز سن چکا ہوں میں نے حتی المقدور لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا ”بی بی آپ لوگ کس کی اجازت سے اس گھر میں رہ رہے ہیں۔“

میری بات کے جواب میں اس نے غصے سے دروازہ کھولا سامنے آؤ ناں ذرا۔ کون ہو تم عورتوں کو دھمکیاں لگانے والے۔

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ قریبی گھروں کی دس بارہ عورتیں باہر نکل آئیں دروازہ کھلتے ہی عورت روشنی میں آئی اور..... اسے دیکھتے ہی میرے جسم میں انگارے دھنسنے لگے۔

چاچی..... چاچی..... چاچی..... میں اسے کیسے بھول سکتا تھا میری زندگی کی بربادی کی ذمہ دار وہی تو تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے آبائی گھر پر بھی میری خونخوار چاچی قابض ہو جائے گی لیکن اس وقت معاملہ کچھ اور تھا اب کچھ اور.....

میں نے دانت پیسے

اوہو..... تو چاچی صاحبہ یہاں براجمان ہیں۔

میرا لہجہ سن کر ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا گئی کک..... کون ہو تم؟

میں..... میں وہی ہوں جس کو تم نے چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانے پر تھپڑ مارا تھا میں وہی

ہوں جس کو تم نے غنڈوں کی مدد سے مارنے کی کوشش کی تھی میں وہی ہوں جس کو تم نے غلیظ جانور کی طرح سمجھ کر گھر میں پال رکھا تھا مجھے پہچان چاچی..... میں اتنا مشکل سوال بھی نہیں ہوں کہ تمہیں جواب میں کوئی مشکل پیش آجائے..... میں بھی روشنی میں آگیا۔

نن..... نورے..... تو.....! چاچی کے حلق میں الفاظ پھنسنے لگے.....

ہاں..... چاچی میں..... نور..... نور محمد۔

کیا کرنے آئے ہو یہاں چاچی نے اپنی آواز سنبھالنا چاہی۔

کچھ بھی نہیں آپ کی گاڑی صاف کرنے آیا ہوں آپ کا کتا نہلانے آیا ہوں آپ کے زیریلے جملے سننے آیا ہوں۔

تم..... تم چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ تم پولیس سے بھاگے ہوئے مجرم ہو۔ دفع ہو جاؤ ورنہ ابھی پولیس کو بلوا لوں گی۔

پولیس..... سبحان اللہ..... اب یہ لفظ مجھے خوفزدہ نہیں کرتے جاؤ تم پولیس کو بلواؤ تاکہ میں اپنے اقبالی بیان میں لکھوا سکوں کہ مجھے اس حالت میں لانے والے کون لوگ ہیں۔ چاچی.....

تم سانپ بھی ہو اور بچھو بھی ڈنگ مارنا تمہاری فطرت میں شامل ہے مجھے پیار کا ایک جملہ بھی تمہاری طرف سے نصیب ہوا ہو تا تو میں تم پر اپنی جان بھی وار دیتا تم نے اس وقت مجھے ذلت کی گہرائیوں میں دھکیلا جب میرے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ چکا تھا آج تمہارا یوم حساب ہے چاچی۔ میں غرایا۔

چاچی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں میرے عقب میں گاڑی اور پیر سانول کو دیکھ کر غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اب وہ نور نہیں رہا جسے وہ غنڈوں کی مدد سے پٹوا سکے۔

گلی میں خاصارش ہو گیا تھا اس رش کو چیرتے ہوئے ایک نوجوان آگے بڑھا اور میرے سامنے آکھڑا ہوا میں نے چونک کر اسے دیکھا برسوں پرانا چہرہ میرے ذہن میں گھوم گیا وہ نعیم تھا نفرت کی ایک لہر میرے اندر اٹھی جسے میں نے بڑی مشکل سے دبایا۔ یہ وہی نعیم تھا جس کی خاطر چاچی نے میری ہڈی پسی ایک کروادی تھی۔ ابھی میں اسے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس

نے ایک عجیب حرکت کی وہ یکدم سینوریتا کی طرف اشارہ کر کے زور زور سے ہنسنے لگا میں گڑبڑا گیا سینوریتا بے اختیار پیر سانول کی اوٹ میں ہو گئی۔
”ہوش میں رہو“ میں گرجا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بلند آواز قہقہے لگانے لگا میں نے غصے سے چاچی کی طرف دیکھا اور پھر چونک اٹھا چاچی کی آنکھوں میں آنسو تھے میں نے زندگی میں پہلی بار چاچی کی آنکھیں نم دیکھی تھیں آنسو بھی قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں بد نصیب ہے وہ آنکھ جس میں آنسو نہ ہوں آنسو تو انسان کو پاک کرتے ہیں اندر دھوتے ہیں آنکھوں کی صفائی کرتے ہیں چاچی بھی آج اشک شوکی کے مرحلے سے گزر رہی تھی میں اس کے آنسوؤں سے زیادہ نعیم کے قہقہوں پر حیران تھا میری یہ حیرانی چاچی کی آواز نے توڑی۔
یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔

کیا مطلب؟ میں نے مڑ کر نعیم کی طرف دیکھا۔

بھائی جان کار کے حادثے میں ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔ میرے عقب سے درد میں ڈوبی ایک باریک آواز ابھری میں چونک کر پیچھے مڑا اور جیسے زمین نے میرے پاؤں پکڑ لئے شازیہ کا آنسوؤں بھرا چہرہ میرے سامنے تھا۔

شازیہ..... شازیہ..... میرا دماغ مسلسل گھومنے لگا یہ وہی شازیہ تھی جس کے لئے میں نے زندگی میں پہلی بار محبت کے جذبات محسوس کئے تھے۔ ایک بے زبان محبت جو شاید ابھی تک بے زبان تھی میں گنگ کھڑا تھا شازیہ کا چہرہ میرے سامنے تھا جس وقت نے مزید نکھار دیا تھا میں کافی دیر تک اسی عالم میں کھڑا رہا، دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں کاش وقت وہیں ٹھہر جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا پیر سانول نے مجھے جھنجھوڑا اور میں ایک جھٹکے سے شازیہ کے ٹرانس سے باہر نکل آیا۔ چاچا مختار کدھر ہیں؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ابو شہر گئے ہیں کام پر..... شازیہ نے نظریں نیچی کر لیں۔
”کون سے کام پر؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

وہ..... شازیہ نے کن اکھیوں سے چاچی کی طرف دیکھا چاچی نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گئیں شازیہ نے جملہ دوبارہ شروع کیا۔
وہ..... ابو شہر کی ایک فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ کی جاب کر رہے ہیں۔
چاچا مختار اور نوکری.....؟؟؟ میں گڑ بڑا گیا۔

ہاں نورے..... جب پہننے کو لباس نہ رہے کھانے کو روٹی نہ ملے رہنے کو مکان نہ ہو تو پھر نوکریاں کرنا ہی پڑتی ہیں تمہیں شاید کچھ بھی علم نہیں کہ اتنے طویل عرصے میں ہم پر کیا بیت گئی۔ شاید یہ ان ہی گناہوں کی سزا ہے جو ہمارے گھر میں تمہارے ساتھ روار کھے گئے، نورے تم یقین نہیں کرو گے کہ ہم عالیستان گھر میں رہنے والے کاروں کو ٹھیوں والے نلکے نلکے کے محتاج ہو گئے ابو کا کاروباری پارٹنر کروڑوں کا فراڈ کر کے فرار ہو گیا کاروبار دیوالیہ ہو گیا بینک والوں نے ساری جائیداد قرق کر لی قرض خواہوں نے گھر پر ڈیرے جمائے۔ اس پریشانی میں ابو کو زبردست ہارٹ ایک ہوا جس کے بعد رہا سہا کاروبار بھی جاتا رہا ابھی ہم اس حادثے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ نعیم کی کار بچو حادثہ پیش آ گیا اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور نرگس.....

شازیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اگرچہ اس کے ادھر ورے فقرے کا مطلب بہت واضح تھا تاہم میں نے تصدیق ضروری خیال کی۔ کیا ہوا نرگس کو؟؟؟
چاچی بے اختیار رو پڑی ہائے ہائے مر گئی میری بچی میری پھولوں جیسی بچی کا سرتن سے جدا ہو گیا میری نرگس کو ظالم ٹرک والے نے کچل ڈالا میری بچی میری نرگس وہ شاید بے ہوش ہونے لگی تھیں میں نے بھاگ کر انہیں سنبھال لیا آخر وہ میری چاچی تھیں آنسو تو ویسے بھی میری کمزوری ہیں میری اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں نرگس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا وہ چھوٹی سی گڑیا جو میرے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتی تھی مرتے وقت پتا نہیں کس اذیت سے گزری ہوگی چاچی کو گر تادیکھ کر میں نے شازیہ کو جلدی سے پانی لانے کا اشارہ کیا اور چاچی کو بڑے آرام سے ساتھ پڑی کر سی پر بٹھا دیا۔ شازیہ ننگے پاؤں بھاگی گئی اور پانی کا گلاس لے آئی۔ میں نے پانی مٹھی میں ڈالا اور چاچی کے چہرے پر چھینٹے مارے دو چار چھینٹوں میں ہی

وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھیں۔ مجھے اپنے سامنے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ہونٹ کپکپانا شروع ہو گئے خدا گواہ ہے کہ میں نے اس وقت ان کے چہرے پر عجیب سی پاکیزگی دیکھی۔ یہ وہ چاچی نہیں تھیں جن کا چہرہ ہر وقت میک اپ میں لتھڑا رہتا تھا جو شہر کی امیر بیگمات کے ساتھ مل کر پارٹیاں انینڈ کرتی تھیں یہ تو کوئی اپنی اپنی سی چاچی تھیں ماں جیسی۔ میک اپ سے لبریز فیشن اسٹیل عورت مما تو ہو سکتی ہے مئی تو ہو سکتی ہے، ماں نہیں۔ ماں صرف اس ہی پر چلتا ہے جو سفید کپڑوں میں ملبوس تخت پوش پر بیٹھی کوئی وظیفہ پڑھ رہی ہو جو ذرا سی بات پر گھبرا جائے شہر کی زندگی نے انسان کو اعتماد کی وہ خطرناک طاقت بخش دی ہے کہ اب اس کی بدولت وہ انجانے میں نہ جانے کتنے دلوں کا خون کر جاتا ہے۔ بات بات پر گھبرانے والے لوگ اب کہاں !!!

چاچی غالباً اپنے آپ میں ہمت محسوس نہیں کر رہی تھیں۔

آپ آرام کریں۔ میں چلتا ہوں میں کھڑا ہو گیا۔

نورے..... وہ..... شازیہ کے لہجے میں بے چینی تھی۔ میں خود بھی عجیب سے احساس میں مبتلا تھا چاچی چپ تھیں۔

باہر میرے مہمان کھڑے ہیں میں نے شازیہ کو یاد دلایا۔

نورے..... وہ..... وہ تمہارے ساتھ لڑکی کون ہے؟ شازیہ کے لہجے میں شکایت تھی میں نے کچھ دیر سوچا پھر ایک مناسب جواب دیا جو میں پہلے بھی دے چکا تھا۔

شہر کی فیکٹری میں جہاں میں کام کرتا ہوں یہ اس کے مالک کی بیٹی ہے مالک اس کے ساتھ ہی کھڑا ہے۔

تم کہاں چلے گئے تھے شازیہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور میرا دل چاہا میں چیخ چیخ کر روؤں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں کہاں گیا تھا اور مجھ پر کیا جاتی تھی لڑکیاں کب ایسی باتوں کا یقین کرتی ہیں میرا وجود کھٹکنے لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں زیادہ دیر وہاں رہا تو پھر شاید کبھی باہر نہ جاسکوں گا۔

شازیہ میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز پر قابو پایا شازیہ یہ گھر تمہارا ہے۔ چاچی کا ہے جب تک چاہو رہو، میرا کیا ہے میں تو دھکے کھانا سیکھ گیا ہوں، آوارگی نے مجھے درد رکاشیدائی بنادیا ہے مجھے اجازت دو..... میں اٹھا۔

نہیں نورے پتر..... چاچی نے کھڑے ہونے کی کوشش کی میں نے جلدی سے انہیں سہارا دیا تم ادھر ہی رہو گے، اب کہیں نہیں جاؤ گے ہمارا تو پہلے ہی کوئی نہیں رہا، اب تم بھی جارہے ہو۔

چاچی نے پہلی دفعہ مجھے پتر کہا تھا حیرت ہے کہ یہ لفظ ان کے منہ سے اوپر انہیں لگا تھا۔
نہیں چاچی۔ مجھے نہایت ضروری کام سے جانا ہے زندگی رہی تو واپس ضرور آؤں گا میں تو وہ گھر دیکھنے آیا تھا جہاں میری ماں رہتی تھی میرا باپ اور میں رہتا تھا..... میں نے گھوم کر گھر پر نظر ڈالی، وہ صحن جہاں میرے باپ نے تڑپتے ہوئے جان دی تھی وہ برآمدہ جہاں سے میں جلتی ہوئی لکڑی لے کر آیا تھا سب جگہیں ویسی کی ویسی تھیں میں نے چشم تصور میں اپنی ماں کو دیکھا جو مجھے پر اٹھا کھلا رہی تھی ماؤں کے ہاتھ بھی عجیب ہوتے ہیں ان میں سادہ روٹی بھی آجائے تو پراٹھے کا مزہ دیتی ہے لیکن میں ان بد قسمتوں میں سے تھا جو ماں اور باپ دونوں کے سائے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو چکے ہوتے ہیں۔

نہیں پتر۔ اب تو بھی یہیں رہے گا ہمارے ساتھ۔ چاچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرائیں نے کہا ناں چاچی۔ مجھے ابھی زندگی کا آخری کام کرنا ہے بس چند دن اور اللہ نے چاہا تو ضرور واپس لوٹوں گا میں نے شازیہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ میرا ارادہ ڈانوا ڈول ہونے لگا میں تیزی سے واپس مڑا۔

نورے واپس آؤ گے ناں۔ شازیہ کی آواز نے میرے قدم روک لئے میں نے مڑے بغیر کہا انشاء اللہ اور باہر نکل آیا۔

پیر سانول اور سینوریتا گاڑی میں بیٹھے تھے مجھے دیکھتے ہی پیر سانول نے چیپ سٹارٹ کر لی میں نے دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا گھر کے دروازے سے شازیہ ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھ

رہی تھی میں نے اس کے آنسوؤں کی تاب نہ لاتے ہوئے چہرہ نیچے کر لیا جیپ آگے بڑھ گئی کچھ ہی دیر میں ہم پختہ سڑک پر تھے۔
خوبصورت تھی۔ سینورینا بولی۔
کون!!! میں نے بے اختیار پوچھا۔

وہی جو تمہیں رخصت کرنے آئی تھی سینورینا کے لہجے میں باریک سا طنز شامل تھا میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ پیر سانول ویسے ہی ہم دونوں کی گفتگو میں مغل نہیں ہوتا تھا اس لئے آرام سے جیپ چلاتا رہا۔

رات کا اندھیرا خاصا گہرا ہونا شروع ہو گیا تھا گاؤں سے کافی دور نکل آنے کے بعد پیر سانول نے اچانک ایک طرف جیپ روک دی۔ جیپ سے ایک رومال نکال کر اس پر کچھ پڑھنے لگا دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی اتنی بڑی ہو گئی کہ ہم با آسانی اس میں سو سکتے تھے سیٹیں خود بخود چارپائی کے سائز جتنی بڑی ہو گئی تھیں۔ پیر سانول نے باہر نکل کر گاڑی پر کچھ پھونکا اور واپس آ گیا میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اب گاڑی عام نظروں سے ماورا ہو چکی ہے اور اسے کوئی انسان نہیں دیکھ سکتا۔ پیر سانول کے جادو نے مجھے حیران نہیں کیا۔ مجھے پتا تھا ایسا ہی کچھ ہو گا۔

یہ رات بڑی اطمینان سے گئی۔ صبح سویرے ہم بیدار ہوئے اور دوبارہ سفر پر رواں دواں ہوئے راستے میں میرے لئے پھل اور سینورینا کے لئے چٹ پٹی چیزیں خریدی گئیں میں حیران تھا کہ پیر سانول اتنے عرصے میں بھوک پیاس سے بے نیاز ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا غالباً اس کی خوراک کا ذریعہ کچھ اور تھا میں نے اس بارے میں اس سے کبھی نہیں پوچھا۔

تین دن کی مسلسل ڈرائیونگ کے بعد ہم شاہراہ ریشم پر آنکے۔ پہاڑی سلسلے تاحد نظر پھیلے ہوئے تھے یہاں سے ہمیں چین جانا تھا اور وہاں سے تبت۔ ”تبت“ چین اور بھارت کے درمیان واقع ہے پہاڑوں میں لپٹی ہوئی یہ سرزمین اپنے اندر بے شمار اسرار شمائے ہوئے ہے ابھی ہمیں تبت پہنچ کر مدھو پہاڑی کا بھی پتا چلانا تھا ایک اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ

تمام راستے گاڑی خراب نہیں ہوئی تھی۔ چیکنگ کے تمام مراحل پیر سانول خود نمٹاتا جا رہا تھا۔ ہمارے اور گاڑی کے کاغذات کے بارے میں ابھی تک کسی بھی نا کے پر کوئی مشکوک سوال نہیں ہوا تھا جس رفتار سے ہم جا رہے تھے اس رفتار سے ہمیں شاہراہ ریشم سے چین پہنچنے کے لئے پانچ دن درکار تھے میں زندگی میں پہلی بار پہاڑ دیکھ رہا تھا میرے دل میں بے اختیار تحسین کے جذبات پیدا ہونے لگے ان سنگلاخ پہاڑوں کو کاٹ کر جس انداز سے سڑک بنائی گئی تھی وہ یقیناً ایک عجوبہ تھا۔ پیر سانول نے بتایا کہ یہ سڑک ہمارے ملک اور چین کے انجینئرز نے مل کر بنائی ہے۔

کیا تمہارے جنات ایسی سڑک بنا سکتے ہیں میں نے پوچھا اگرچہ یہ سوال مزاحیہ پیرائے میں کیا گیا تھا لیکن پیر سانول نے اسے سنجیدگی سے لیا۔
ہاں..... بنا سکتے ہیں لیکن وہ صرف وقتی ہوگی۔

کیا مطلب۔

مطلب یہ کہ وہ کسی بھی وقت نظروں سے اوجھل ہو جائے گی کسی بھی وقت کسی بھی موڑ پر اس کا اختتام ہو سکتا ہے۔ جنات بنیادی طور پر مست مخلوق ہیں یہ مخلوق دوسروں پر زیادہ انحصار کرتی ہے تم خود دیکھو یہ پھل گندم اور دیگر کھانے پینے کی چیزیں مثلاً حلوہ وغیرہ بھی انسانوں کا بنایا ہوا ہی چٹ کرتے ہیں میں نے ہنکارہ بھر اور چپ ہو گیا۔

گاؤں سے یہاں تک کے سفر میں ہمیں چار دن ہو چکے تھے لیکن سینوریتانے کوئی بات نہیں کی تھی مجھے بھی اس سے بات کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا اس لئے چپ رہا۔ سفر کے پانچویں روز ہمارے ساتھ ایک عجیب حادثہ پیش آگیا پہاڑ کا موڑ مڑتے ہی اوپر سے ایک چٹان گری اور راستہ بند ہو گیا اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا پیر سانول نے تیزی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا کچھ پڑھا پھر سامنے کی طرف پھونکا۔

چٹان تھوڑا سا ہلی لیکن پھر اپنی پہلے والی پوزیشن میں آگئی۔

گاڑی سے نکلو فوراً..... پیر سانول چیخا۔ میں اور سینوریتانے تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل

آئے۔

پیر سانول نے ایک ہاتھ سے مجھے اور دوسرے سے سینوریتا کو پکڑا اور آنکھیں بند کر لینے کے لئے کہا آنکھیں بند کرتے ہی ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم کسی کنویں میں گرتے جا رہے ہیں ٹھوس زمین کا احساس ہوتے ہی اس نے ہمیں آنکھیں کھولنے کے لئے کہا۔

آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ ہم چٹان کے دوسری طرف کھڑے تھے اور جیپ بھی دوسری طرف آچکی تھی۔ پیر سانول نے تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم دونوں دوبارہ سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اچانک میرے عقب سے سینوریتا کے ڈکرانے کی آواز آئی میں ایک جھٹکے سے مڑا اور خوفزدہ ہو گیا۔ سینوریتا کے چہرے پر عجیب سی قسم کے موٹے موٹے کیڑے رنگ رہے تھے پیر سانول نے جیپ روک کر ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر ڈیش بورڈ میں سے ایک انسانی کھوپڑی نکالی اور سینوریتا کے سر پر پھیرنے لگا کیڑے تیزی سے غائب ہونے لگے۔

سادرتی پڑھو۔ پیر سانول چیخا۔

سینوریتا کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلنے لگے۔

پڑھو۔ پڑھو میری بچی۔ شاباش خود پڑھو۔

سینوریتا آہستہ آہستہ منتر پڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں کیڑے غائب ہو گئے البتہ سینوریتا بھی تک نڈھال پڑی تھی۔

پیر سانول نے ساتھ پڑی چھاگل اس کے منہ سے لگادی پانی کے دو گھونٹ لیتے ہی وہ کافی حد تک سنبھل گئی۔

بابا..... طلسمہ کو ہمارے آنے کی خبر ہو گئی ہے سینوریتا کراہی۔

ہاں۔ پیر سانول نے مٹھیاں بھینچیں اب اس کا اور ہمارا سامنا زیادہ دور نہیں عنقریب طلسمہ تمہارے قدموں میں ہوگی میری بچی۔

ہم پھر سے سفر شروع کر چکے تھے میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے آگ پر بنی ہوئی کسی بھی چیز کی

طلب بڑی شدت سے ہونے لگی تھی میں نے اپنی اس کیفیت کا ذکر پیر سانول سے کیا تو وہ چونک اٹھا۔

خبردار۔ نہایت احتیاط کرنا۔ طلسمہ تمہارے اندر کھانے کی ہوس پیدا کر رہی ہے تاکہ تمہیں برباد کر سکے ہم روز بروز اس کے قریب ہوتے جا رہے ہیں ہم تینوں میں سے کسی کی بھی موت تینوں کی موت ہوگی اس لئے خود کو قابو میں رکھو۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ اب کی بار مجھے خواب بھی نہایت ڈراؤنے آنے لگے تھے یہ خواب حقیقت سے اتنے قریب لگتے کہ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا سانس رکنے لگتی اور یوں لگتا جیسے خواب میں نظر آنے والی خوفناک بلائیں میرے وجود کو کچا چبا جائیں گی۔

میری مانو تو یہ پڑھو۔ پیر سانول نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔

یہ کیا ہے؟

یہ منتر ہے۔

اس سے کیا ہوگا۔ اس سے تمہارا دل آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کی خواہش نہیں کرے گا۔

میں اسے پڑھنے سے قاصر ہوں۔

گلے میں لٹکا لو۔

میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر حامی بھری پیر سانول نے تعویذ میرے گلے میں لٹکا دیا اور گرہ لگا دی تعویذ پہنتے ہی جادوئی کام ہوا مجھے اچانک پھل اچھے لگنے لگے میں نے تعریفی نظروں سے پیر سانول کی طرف دیکھا اس کے تعویذ نے واقعی کام کر دکھایا تھا میں نے سیٹ پر پڑے ہوئے کیلے کھانے شروع کر دیئے یہ کیلے میری بھوک اس طرح مٹا رہے تھے جس طرح روٹی۔ مجھے غصہ بھی آیا کہ آج تک پیر سانول نے مجھے یہ تعویذ کیوں نہ دیا۔ میں خواہ مخواہ ہی روٹی کے لئے ترستار ہا۔

کوشش کرنا کہ یہ اترے مت۔ پیر سانول کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ لگا کر تعویذ کے دھاگے کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور اثبات میں سر ہلادیا طلسمہ سے محفوظ رہنے کا ایک اور اہم ذریعہ

ہاتھ آگیا تھا۔

ہمارے سفر 5 دنوں میں اختتام پذیر ہوا اس سفر میں ”طلسمہ“ کی بھرپور کوشش رہی کہ وہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکے۔ لیکن ہمیں شائد نیکی اور بدی کی دونوں طاقتیں حاصل تھیں میں نے دیکھا ہے کہ اکثر جب آپ کا واسطہ اپنے سے بھی بڑی برائی سے پڑتا ہے تو اپنا آپ یکدم نیک اور پرہیزگار لگنے لگے 5 دن کا طویل سفر طے کرنے کے بعد جب ہم چین کی سرحد پہنچے تو دن کے بارہ بجے ہوئے تھے چین سخت گرمی کی لپیٹ میں تھا۔ سرحد پر مسلح اہلکاروں نے ہمیں چیکنگ کے لئے روک لیا چینی پولیس کا لہجہ ایسا ہے کہ سختی سے بھی بات کریں تو اتنی باریک آواز نکلتی ہے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی ہے چینی پولیس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ لوگ پوری طرح سے مستعد ہوتے ہیں اسلحے کی ٹریننگ کے علاوہ یوگا، مارشل آرٹس اور دیگر اہم جسمانی ورزشیں ان کے معمول کا حصہ ہوتی ہیں۔ جیسے ہی ہماری جیب کی تین چار وردی والوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا پیر سانول نے ہمیں بیٹھے رہنے کا کہا اور خود باہر نکل آیا باہر نکل کر وہ چینی زبان میں پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتا رہا مجھے اس کے منہ سے چینی زبان سن کر حیرت بالکل نہیں ہوئی۔ وہ خبیث روح تھا اور خبیث روح کی باتوں پر حیرت چہ معنی!

پتا نہیں یہ اس کی باتوں کا اثر تھا کہ یہاں بھی اس نے اپنے عمل کا کمال دکھایا تھا مجھے اور سینوریتا کو جیب سے اترنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی جیب میں بیٹھے بیٹھے ہمارے کاغذات چیک ہوئے اور آگے جانے کی اجازت مل گئی ہم چین کے سرحدی گاؤں میں تھے یہ گاؤں اگرچہ ہمارے گاؤں کی طرح ہی تھا لیکن لہلہاتا ہوا سبزہ دیکھ کر یقین ہو رہا تھا کہ یہاں کی حکومت گاؤں کی ترقی میں پیش پیش ہے۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں چین سے تبت جاتے ہوئے دو چار روز ضرور لگ جائیں گے لیکن پیر سانول کے اعلان نے میرے کان کھڑے کر دیئے کہ ہم اگلے روز تبت میں ہوں گے۔ تبت کوئی اتنی بڑی ریاست نہیں لیکن پہاڑی علاقہ اور پراسرار ہونے کی وجہ سے یہاں کئی

کہانیاں جنم لے چکی ہیں۔

رات ہوئی تو پیر سانول نے اسی طرح گاڑی کو گھر کا روپ دے دیا۔ میں نے اس موقع پر سینوریتا کے چہرے میں ایک عجیب بات نوٹ کی ہر وقت بولتے رہنے والی یہ لڑکی جوں جوں تبت کے قریب ہوتی جا رہی تھی اس کی زبان کو تالا لگتا جا رہا تھا۔ شاہراہ ریشم کے سفر میں بھی اس نے کھانے پینے کی کوئی فرمائش نہیں کی مجھ پر کوئی جملہ نہیں کسا میں نے یہی خیال کیا کہ وہ شازیہ کی وجہ سے مجھ سے خفا ہے۔ رات کے وقت پھل کھاتے ہوئے میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا تو پیر سانول غائب تھا میں سمجھ گیا کہ وہ یقیناً اپنے چلے کے لئے جا چکا ہے سینوریتا باہر کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

”موسم اچھا ہے ناں“..... میں نے بات کی ابتداء کی اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ باہر دیکھنے لگی میں نے اسے کہا ”کیلے کھا لو.....“ اس نے نفی میں سر ہلادیا میں نے کندھے اچکائے اور کیلوں والا لفافہ ڈیش بورڈ کے اوپر رکھ دیا چپ کے ماحول میں پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے شیشہ تھوڑا سا گھما کر اسے سینوریتا کے چہرے پر فوکس کر دیا۔ اسے شاید میری اس حرکت کا پتا نہیں چلا تھا اس لئے بدستور باہر دیکھتی رہی میں بڑے آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا پھر شاید اسے بھی کسی گرم لمے کا احساس ہوا اس نے بے اختیار ادھر ادھر دیکھا شیشے پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی یہ لڑکیاں بھی عجیب چیز ہوتی ہیں کبھی ایسا لگتا ہے کہ انہیں سب کچھ پتا ہے اور کبھی یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔ سینوریتا کے چہرے پر بھی عجیب سی معصومیت تھی اس کی اس حرکت سے میرے دل میں بے اختیار جلتنگ سے بچنے لگے۔ اگر یہ کوئی جذبہ تھا تو واضح طور پر اس وقت اس کے حصار میں تھا عورت واقعی عورت کے روپ میں ہی اچھی لگتی ہے۔ پر اعتماد، بہادر اور اپنے اداروں میں اٹل عورتیں ایک خاص طبقے کو ہی زیب دیتی ہیں عورت سمجھتی ہے کہ شاید وہ برابری کی سطح پر مرد کا سامنا کر کے اپنا آپ منوا سکتی ہے وہ واقعی ایسا کر سکتی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے برابری چاہے یا محبت۔ درخت کی تمام تر

شادابی اور زندگی زمین کے دم سے ہوتی ہے وہ زمین سے کٹ جائے تو کہیں کا نہیں رہتا ویسے بھی ہیرا زمین پر پڑا ہو تو اسے اٹھانے کے لئے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ بغیر جھکے آپ ہیرا نہیں اٹھا سکتے سینوریتا کے اس ایک لمحاتی تاثر نے اسے اور بھی خوبصورت بنادیا تھا۔

”یہ شیشہ ایسے کیوں کیا ہے؟“ اس نے خفگی سے کہا۔

”یہ ایسے ہی تھا“..... میں نے مسکرا کر کہا اور سینوریتا دوسری طرف دیکھنے لگی مجھے پتا تھا خود وہ بھی مسکرا رہی ہے کچھ دیر خاموش رہی پھر سینوریتا کی آواز سنی۔

”نورے.....!!! تمہیں پتا ہے کل ہم نے زندگی اور موت کی جنگ لڑنی ہے۔“

”ہاں تو پھر.....؟؟؟“

”پھر یہ کہ.....“ وہ چپ ہو گئی میں ادھورے لفظوں کے مفہوم سمجھنے میں کافی ماہر ہو چکا تھا تاہم میں نے اپنی قابلیت ظاہر کرنے سے گریز کیا اور خود بھی چپ رہا میں اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتا تھا مجھے پتا تھا وہ بات مکمل ضرور کرے گی اور ایسا ہی ہوا۔

”نورے..... تم..... تم واپس چلے جاؤ“ اس کی طبیعت سے سخت اضطراب نمایاں تھا میں حیران ہو گیا۔

”یہ کیسا مشورہ دے رہی ہو..... اب آخری منزل پر پہنچ کر نیچے سے سیڑھی کھینچ رہی ہو۔“

”میں سیڑھی نہیں کھینچ رہی بلکہ تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں“

میری ہنسی نکل گئی۔

”فکر نہ کرو مجھے یقین ہے کہ اگر میں مر بھی گیا تو تم جادو سے مجھے دوبارہ زندہ کر لو گی۔“

سینوریتا نے ایک گہرا سانس لیا..... ”نورے..... میرا جادو سب پر چل سکتا ہے لیکن شاید تم پر نہیں.....“ ویسے ایک بات تو بتاؤ..... اگر میں مر گئی تو.....؟؟؟

”تو میں نہایت اعزاز کے ساتھ دفنادوں گا۔“ میں نے فوراً کہا۔ وہ کافی دیر تک باہر خلاء میں

جھانکتی رہی کالے جادو نے ابھی تک اس کی معصومیت پر اپنی سیاہی منتقل نہیں کی تھی۔ میں

نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دوبارہ بند کر لیا پیر سانول آگیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر

اس کے ظاہر ہوتے ہی میں نے غیر محسوسانہ طریقے سے شیشہ دوبارہ ٹھیک کر دیا۔
 ”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ پیر سانول نے احتیاطاً پوچھا۔ میرے الفاظ ابھی حلق ہی میں تھے کہ
 سینوریتا بول اٹھی۔

”بابا..... نورے نے ایک حرکت کی تھی“

اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اس نے شاید میرے شیشہ
 گھمانے کا برا منایا تھا پیر سانول نے چونک کر پوچھا..... ”کیا ہوا؟“
 میں سمجھ گیا کہ برے بھنے..... سینوریتا تڑ سے بولی.....

”بابا..... یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے روٹی کھانی ہے اصلی.....“

پیر سانول ایک جھٹکے سے میری طرف مڑا اور گرجا..... ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا“
 لیکن میرا دماغ تو بہت سکون میں آ گیا تھا۔ پیر سانول کا جملہ سننے کی بجائے میں نے
 سینوریتا کے جملے پر اطمینان کا سانس لیا۔

”خبردار! ہم نہایت خطرے میں ہیں تم یہ تعویذ مت اتارنا..... کل کا دن طلسمہ کی آزادی کا
 آخری دن ہوگا۔“

”اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یہ بہت ضروری بات ہے دیکھو پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں طلسمہ کو مارنا نہیں بلکہ قبضہ
 میں کرنا ہے تقریباً ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد ہم مدبو پہاڑی پہنچیں گے یہ پہاڑی تبت کی
 سب سے خطرناک پہاڑی شمار ہوتی ہے بیس ہزار فٹ اونچی ہے اور بالکل سپاٹ ہے کہا جاتا
 ہے کہ کسی نے اس کا دوسرا سرا یعنی چوٹی نہیں دیکھی۔ اس کی چوٹی کا حصہ نہایت تاریک اور
 سرد ہے اتنی گرمی میں بھی وہاں منفی ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت متوقع ہے یہ پہاڑی تین
 سطحوں پر مشتمل ہے پہلی سطح میں سانپ ہیں اس سے اوپر خطرناک کھائیاں اور بچھو، اور سب
 سے اوپر وہاں پر اسرار غار ہے جس میں طلسمہ کی لاش موجود ہے یا دوسرے معنوں میں طلسمہ
 خود موجود ہے یا در ہے کہ طلسمہ تک پہنچنے کے 90 فیصد طریقوں کا انحصار جادو ہی ہے

پہاڑی پر چڑھنے کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا لہذا میرا کالا علم ہم سب کو پہاڑی تک پہنچائے گا۔ جب تک ہم پہاڑی کی دونوں سطحوں کو عبور نہیں کرتے تیسری سطح پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اب غور سے سنو..... کل رات ٹھیک 12 بجے مدھو پہاڑی کے سامنے میں ایک چلا شروع کروں گا اس عمل کے لئے دو دائرے بنائے جائیں گے ایک میں تم رہو گے دوسرے میں سینوریتا یہ دائرے تمہاری حفاظت کے لئے ہوں گے تاکہ دوران عمل اگر کسی بھی قسم کی کوئی خطرناک صورت حال پیش آجائے تو طلسمہ تم پر وار نہ کر سکے۔

”تو کیا تم اپنے لئے کوئی دائرہ نہیں بناؤ گے میں نے پوچھا۔

”نہیں..... میری بات اور ہے جو دائرہ میں بنانا چاہتا ہوں وہ ہم پہاڑی کی تیسری سطح پر پہنچ کر بنائیں گے فی الحال تم اس کی بات چھوڑو اور جو میں کہتا ہوں وہ غور سے سنتے جاؤ اس عمل کے دوران سینوریتا کے بائیں ہاتھ کے خون کا ایک پیالہ اور تمہارے دائیں ہاتھ کے خون کا پیالہ دائرے میں موجود ہو گا۔

میں کانپ گیا..... ”خ..... خون..... میرا.....!!!“

”ہاں..... تمہارے خون کا اصلی پیالہ..... اگر نہیں دو گے تو طلسمہ کے شر سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکو گے.....“ پیر سانول کے لہجے میں دھمکی تھی لیکن میں اس کی دھمکی میں کہاں آنے والا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اپنے ہاتھ پر زخم لگا کر اسے پورا ایک خون کا پیالہ بھر دیتا، ویسے بھی میرے جسم میں خون رہا ہی کب تھا، وہ تو سارا طلسمہ اور جنات کے خوف سے خشک ہو چکا تھا۔ اچانک مجھے کوئی خیال آیا، میں نے جلدی سے سینوریتا کی طرف دیکھا اور کہا

”تم دو گی خون.....؟؟؟“

”بڑے آرام سے“..... اس نے ازلی لا پرواہی سے کہا اور میرا خون کھول اٹھا، وہ مجھ پر اپنی برتری جتنا چاہ رہی تھی۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ مزید بولی ”لگتا ہے تم نے پہلے کبھی کسی مریض کو خون نہیں دیا“

میں بھڑک اٹھا..... ”طلسمہ مریض نہیں ہے“

”بات خون نکالنے کی ہو رہی ہے“

”تو کیا یہ خون بھی اس طرح نکالا جائے گا جس طرح ڈاکٹرز نکالتے ہیں“

”ڈاکٹرز جسم سے خون نکالتے ہیں جو عموماً بازو کے ذریعے نکالا جاتا ہے جبکہ تم نے شائد سنا

نہیں، بابا تمہارے ہاتھ سے خون نکالنا چاہتے ہیں“

”مطلب؟؟“

”مطلب یہ کہ تمہاری ہتھیلی کی ایک رگ کاٹ کر خون نکال لیا جائے گا، یقین کرو پتا بھی

نہیں چلے گا“

”واہ..... پتا بھی نہیں چلے گا..... کسی کا ہاتھ کٹ جائے ادا سے پتا بھی نہ چلے، ایسا کبھی ہوا

ہے؟؟؟“

اپنے اپنے طریقے کی بات ہے..... بابا کو تم پوری طرح سے نہیں جانتے“

اسے مت روکو سینوریتا..... پیر سانول نے اسے ٹوکا..... ”یہ خود طلسمہ سے چھٹکارہ نہیں

چاہتا تو ہم کیا کر سکتے ہیں“

میں نے کچھ دیر سوچا، پھر جلدی سے کہا..... ”ٹھیک ہے، لیکن پہلے سینوریتا کا ہاتھ کٹے گا“

میری بات سن کر سینوریتا، چونک کر شکایت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے

میرے اس جملے سے اسے خاصی تکلیف پہنچی ہو۔ البتہ پیر سانول نے میری اس بات پر کوئی

اعتراض نہیں کیا۔

رات کافی بیت چکی تھی لہذا دھیرے دھیرے سب نے آنکھیں موند لیں۔ سوائے پیر سانول

کے۔

اگلے دن ہم صبح سویرے تبت کے لئے روانہ ہو گئے ہماری جیپ اتنے طویل سفر میں بھی ابھی تک نہ پکچر ہوئی تھی نہ اس میں کوئی اور خرابی ہوئی تھی۔ البتہ پٹرول سے ہم ہر دفعہ ٹینکی فل کروا رہے تھے۔ یقیناً گاڑی کی اتنی روانی اور مہربانی میں پیر سانول کا ہاتھ تھا۔ سرحدی ایریا سے گزرنے کی وجہ سے چین کے شہر تو ہمیں دیکھنے کو نہیں ملے لیکن خوش باش چہرے دیکھ کر اطمینان ہوا کہ یہاں ابھی تیسری دنیا کی تنگدستی نہیں آئی۔

سارا سفر انتہائی بے چینی اور خوف کے عالم میں طے ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ تبت کی سرحد پر چیکنگ کے بعد پہاڑی علاقے کی طرف روانہ ہونے کا لمحہ بڑا ہی وحشت ناک تصور لئے ہوئے تھا میں نے پیر سانول کے چہرے پر بھی خاصا تناؤ دیکھا تبت کی پہاڑیاں ہولناک عفریت کی طرح پھیلی ہوئی تھیں کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے ابھی یہ پہاڑیاں یکجا ہو کر ہم پر گر پڑیں گی۔ میں طلسمہ کے قریب آ گیا تھا ہم سب طلسمہ کے قریب تھے تبت کا شہر کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔

ہم ایک سنسان اور کچے راستے پر رواں دواں تھے پیر سانول نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اسے

ایک طرف روکا اور نہایت احتیاط سے اپنی بغلی جیب سے ایک مڑا ترانہ نقشہ نکالا اور سیٹ پر پھیلا دیا نقشے میں عجیب عجیب سی علامات بنی ہوئی تھیں پیر سانول نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر اپنی انگلی نقشے کے اوپر گھمانا شروع کر دی نقشے کا رنگ دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں اور سینوریتا بڑی محویت سے یہ سارا عمل دیکھ رہے تھے۔ اچانک نقشے میں آگ بھڑک اٹھی پیر سانول ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا نقشہ بری طرح آگ کی لپیٹ میں تھا حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اگرچہ نقشہ سیٹ پر پڑا ہوا تھا لیکن سیٹ کا کپڑا بالکل محفوظ تھا آگ صرف نقشے کو لگی ہوئی تھی۔ یہ سانول خاموشی سے نقشہ جلتے ہوئے دیکھتا رہا جو نہی نقشے کا آخری کونا جل کر راکھ ہوا، آگ خود بخود بجھ گئی پیر سانول نے ایک گہرا سانس لیا اور آہستہ سے بولا۔

”یہ طلسمہ کی شرارت تھی.....!!!“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک کان پھاڑ دینے والا تہتہ فضا میں گونجا اور میرا رواں رواں لرز اٹھا۔ جیب کی سکرین پر طلسمہ کا بھیاں چہرہ نمایاں تھا گوشت کے لوتھڑوں سے بھری اس کی خون آلود آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں میں اپنی جگہ پر سمٹ گیا، پیر سانول نے تیزی سے ہڈی نکال لی۔

”نہ نہ نہ نہ..... ڈرو ومت..... میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آئی“ طلسمہ نے بڑی ادا سے کہا۔

پیر سانول نے اس بات پر دھیان دیئے بغیر ہڈی پر کچھ پھونکا اور ہڈی سکرین کی طرف کر کے گھمانی شروع کر دی۔ طلسمہ غرا کر بولی..... ”پیر..... میں نے کہا ناں میں کوئی نقصان نہیں پہنچانے آئی، بند کر اپنے تماشے.....“

لیکن پیر سانول پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ بدستور ہڈی گھمانے میں مصروف رہا۔ بند کر خبیث انسان..... یہ میرا علاقہ ہے..... بھول جاؤ کہ اب تم میں سے کوئی واپس جاسکے گا..... ہاہاہا.....“ وہ چنگاڑنے چلانے لگی، پھر میری طرف مڑی۔

”تیرا خون پیوں گی اور نیا جنم لوں گی..... سب کو مار دوں گی..... سب کو ختم کر دوں گی۔“ وہ دھمکیاں دیتی ہوئی غائب ہو گئی۔

”ہوشیار..... ہم طلسمہ کے قریب پہنچ چکے ہیں“ پیر سانول نے خبردار کیا ابھی وہ یہ بات کر ہی رہا تھا کہ ایک زوردار چھنا کے کی آواز آئی اور جیپ کی وینڈر سکرین پر زے پر زے ہو گئی سب نے بے اختیار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”باہر آ جاؤ“ سانول ایک بار پھر چلایا۔

ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر میں اور سینور تینا باہر آ گئے۔

”ہمارے جسموں کے علاوہ ہر چیز غیر محفوظ ہو چکی ہے..... میرے ہاتھ پکڑ لو“ پیر سانول کے چیختے ہی ایک طرف سے میں نے اور دوسری طرف سے سینور تینا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اسی اثناء میں یوں محسوس ہوا جیسے ساری پہاڑیاں لرز رہی ہیں۔ یہ ایک زلزلے کی کیفیت تھی۔

”میرے ہاتھ مت چھوڑنا“ پیر سانول چلا رہا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ ہی دیر میں زمین مجھے الٹا دے گی اور میں سر کے بل کھڑا ہو جاؤں گا۔ اس کے باوجود میری پوری کوشش تھی کہ پیر سانول کے ہاتھوں سے میرا ہاتھ نہ چھوٹنے پائے زلزلہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا زمین پر قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا اذیت کی یہ شدت حیرت انگیز طور پر ایک منٹ بعد خود بخود ختم ہو گئی اور زمین پہلے کی طرح پرسکون ہو گئی پیر سانول غالباً ہم سب میں سے زیادہ حوصلہ مند تھا اس لئے فوری طور پر سنبھل کر چلنے لگا۔ ہم اس کے ساتھ تھے تقریباً آدھا میل کے سفر نے ہمیں تھکن سے چور کر دیا پہاڑی راستے میں جگہ جگہ چڑھائی آرہی تھی جس کی وجہ سے ہمارا سفر خاصا سست ہو گیا تھا کافی آگے نکل آنے کے بعد پیر سانول نے آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر بعد بولا۔

”مدھو پہاڑی یہاں سے شمال کی جانب دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اس درمیانی فاصلے میں دو پہاڑیاں حائل ہیں لہذا بہتر یہی ہے کہ انہیں اپنے علم کے بل بوتے پر عبور کیا جائے۔ میرے ہاتھ پکڑے رکھنا اور آنکھیں بند کر لو“۔ پیر سانول نے یہ کہتے ہی خود بھی آنکھیں بند

کر لیں اور ہم دونوں نے بھی۔

کچھ دیر حسب روایت یوں محسوس ہوا جیسے ہم بے وزن ہو گئے ہیں دوبارہ آنکھیں کھولنے کا حکم ملا تو ہم بالکل بنی اسی طرح کی پہاڑی کے قریب موجود تھے سامنے نظر پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ایک دیوہیکل پہاڑی جو پوری طرح سے خاردار جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اس کے چاروں اطراف میں پھنکدیں مارتے سانپ رینگ رہے تھے پہاڑی میں سے دھواں سا اٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا رات کی تاریکی آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی تھی پیر سانول نے کچھ دیر منتر پڑھنے پر لگائی پھر زمین پر انگلی سے دو بڑے بڑے دائرے بنادیئے دائروں کے گرد اس نے ہڈی سے کچھ لکھنا شروع کر دیا دونوں دائروں پر تحریر مکمل کر کے اس نے ہمیں ان میں داخل ہونے کا اشارہ کیا میرا خیال تھا کہ دائرے میں داخل ہوتے ہی کچھ ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں بڑے آرام سے دائرے میں داخل ہو گیا یہ دائرہ خاصا بڑا تھا جس میں بڑے آرام سے لیٹنا بھی جاسکتا تھا پیر سانول نے وقت ضائع کئے بغیر اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا پیالہ نکالا اور سینوریتا کی طرف بڑھ گیا میں سمجھ گیا کہ خون نکالنے کا عمل شروع ہونے والا ہے میں پوری طرح سے پیر سانول کے رحم و کرم پر تھا انکار بھی نہیں کر سکتا تھا سینوریتا نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر ہاتھ آگے کر دیا پیر سانول زمین پر بیٹھ گیا اور جیب سے ایک تیز دھار بلیڈ نکال لیا ابھی وہ بلیڈ سینوریتا کی ہتھیلی پر پھیرنے ہی لگا تھا کہ میں نے بے اختیار کہا۔

”ٹھہرو.....!!!“

دونوں باپ بیٹی نے چونک کر میری طرف دیکھا..... ”پہلے میں خون دوں گا.....“ میں نے اعتماد سے کہا اور سینوریتا کی طرف دیکھا اس کا بھابھا سا چہرہ یکدم خوشی سے دمک اٹھا میں نے اس کی آنکھوں میں قمقمے سے جلتے ہوئے محسوس کئے اس کی آنکھوں میں شکریہ ہی شکریہ تھا اقرار ہی اقرار تھا، پیر سانول نے سر ہلایا اور اٹھ کر میرے پاس آگیا پیالہ میرے قریب رکھا ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑا اور بلاتا خیر بلیڈ چلا دیا مجھے صرف یوں لگا جیسے کوئی سوئی چھبی ہے میں

نے آنکھیں بند کر لیں۔ دس بارہ سیکنڈ بعد جب میں نے اپنے ہاتھ پر پیر سانول کا دباؤ ختم ہوتا ہوا محسوس کیا تو آنکھیں کھول دیں پیالہ بھر چکا تھا اور میرے ہاتھ سے بہنے والا خون رک چکا تھا پیر سانول نے قریب سے ایک پتھر اٹھایا اور میری ہتھیلی پر گر دیا مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ہتھیلی میں مرچیں بھر دی ہیں بڑی مشکل سے میں نے اپنی چیخ پر قابو پایا۔ لیکن یہ تکلیف لمحاتی تھی دو تین لمحوں میں سارا درد غائب ہو گیا اور ہتھیلی بالکل یوں ہو گئی جیسے پہلے تھی مجھے پیر سانول کی جراحی پسند آئی تھی۔ میری ہتھیلی کا خون لینے کے بعد وہ دوبارہ سینوریتا کی طرف بڑھا۔ سینوریتا نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا پیر سانول نے میرے والا عمل پھر سے دہرایا۔

دونوں پیالے خون سے بھر گئے تو اس نے دونوں کے خون سے دائروں پر لکیر لگا دی سردی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی مجھے کبل کی ضرورت محسوس ہونے لگی میں نے چلا کر پیر سانول سے کبل مانگا لیکن اس نے گھور کر کچھ اس طرح سے میری طرف دیکھا کہ میری جان نکل گئی وہ دونوں دائروں سے دور ہو کر بیٹھ گیا اور اونچی آواز میں منتر پڑھنے لگا۔

اس کے منتر پڑھنے کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں برف کے حصار میں آتا جا رہا ہوں سینوریتا بھی غالباً اس احساس سے گزر رہی تھی دیکھتے ہی دیکھتے چٹانوں سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ماحول اتنا خوفناک بن چکا تھا کہ مجھے اپنا خون رگوں میں جمنا ہوا محسوس ہو رہا تھا یہی وہ عالم تھا جب اچانک طلسمہ میرے دائرے سے باہر اپنی اصل شکل میں ظاہر ہوئی انتہائی مکروہ..... انتہائی خوفناک..... میرے لئے اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنا بھی محال تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے اچانک اپنے اس قدر قریب پا کر میں کاٹنے لگا تھا..... وہ اپنی خون آلود آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ کافی دیر تک اس عالم میں رہنے کے بعد اس نے زبان کھولی۔

”نورے..... میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں۔“ اس کا جملہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا..... یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی بلی کہے کہ مجھے چوہے بالکل بھی اچھے نہیں لگتے۔ میں نے پھر بھی اس کی

بات کو رد نہیں کیا اور قدرے خوف سے کہا۔

”تم نے تو میری ماں اور باپ کو مارا تھا.....“

”ہاں..... مارا تھا..... صرف اس لئے کہ اگر میں انہیں نہ مارتی تو انہوں نے مجھے مار دینا تھا.....“

”لیکن میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا.....؟؟؟“

میرا سوال سن کر طلسمہ کی شکل ایسی بن گئی جیسے اس نے بڑی مشکل سے قہقہہ روکا ہو.....
پھر وہ بولی۔

”تم سے میری کوئی دشمنی نہیں..... میں صرف تمہارے باپ کے کر تو توں کا انتقام لینا چاہتی تھی لیکن اب میں پیچھے ہٹ سکتی ہوں اس کے لئے میری ایک شرط ہے“
”کیا.....؟؟؟ میں بے اختیار بولا۔

”وہ سامنے والا پتھر اٹھاؤ.....“ اس نے اشارہ کیا اور میں واقعی حیران رہ گیا مجھے برسوں پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب میرے چاچا نے بھی اچانک ایک ایسی ہی فرمائش کی تھی کہ مجھے فلاں کاغذ لادو..... میں نے ابھی ہوئی نظروں سے پیر سانول کی طرف دیکھا جو بند آنکھوں سے منتر پڑھنے میں مصروف تھا میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ ناممکن تھا کہ میں طلسمہ کی فرمائش پوری کرتا لیکن ابھی تک میرے ذہن میں یہ دائرہ نہیں ہو سکا تھا کہ آخر اس پتھر میں ایسی کیا بات ہے جس کے لئے طلسمہ میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہو گئی۔

”لاؤ ناں وہ پتھر.....!!!“ طلسمہ کے خوفناک وجود نے فرمائش کی۔

اس لمحے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور میں اس کی ساری چال سمجھ گیا مجھے یو قوف بنا کر دائرے سے باہر لانا چاہ رہی تھی غالباً اس کی آواز اور شکل پیر سانول اور سینوریتا کی نظروں سے اوجھل تھی میں نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

”طلسمہ..... کوئی ایسی فرمائش بتاؤ جو میں یہیں دائرے میں بیٹھے بیٹھے پوری کر سکوں۔“

وہ میری بات سمجھ گئی اور یکدم غرائی۔

”جنات کا انتقام تم پہلے کئی دفعہ دیکھ چکے ہو..... خود پھنسو گے تو وہ حشر ہوگا کہ موت بھی تم سے پناہ مانگے گی میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی تم دائرے سے باہر آؤ میں تمہیں واپس بھجوا دیتی ہوں ایک منٹ میں.....“

”تو کیا پھر تم آگ پر پکی چیز کھانے سے میرے اندر نہیں آؤ گی.....؟؟؟“

طلسمہ فوراً بولی..... ”آؤں گی لیکن صرف دو ماہ تک یہی میری مدت تھی..... دو ماہ کے بعد میں تمہارے اندر نہیں آسکوں گی کیونکہ میری منت کا وقت ختم ہو جائے گا“

”ماشالی..... ہے ماشالی.....“ پیر سانول کی آواز گونجی اور طلسمہ اپنے آپ کو نوچنے لگی..... یوں لگتا تھا جیسے یہ منتر اس کے اندر آگ لگا دیتا ہے اس نے دھاڑنا شروع کر دیا۔

”خبیثا!..... کتے کی موت ماروں گی..... ایک ایک کا کلیجہ نکالوں گی..... تمہاری لاشوں پر گدھ رقص کریں گے.....“ وہ چیختی چلاتی غائب ہو گئی۔ پیر سانول کی آنکھوں میں فحش کے آثار تھے وہ بلند آواز بولا۔

اپنی آنکھیں بند کر لو..... میں تم دونوں کو دائروں سمیت پہاڑی کی پہلی سطح پر لے جاؤں گا۔ یاد رہے کہ جتنی دیر تم لوگ پہلی سطح پر رہو گے، اپنی سانس بند رکھنا اگر کسی نے سانس لی تو اس کا دائرہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور ایسی صورت میں موت یقینی ہوگی۔“

میں گڑبڑا گیا..... ”لل..... لیکن میں اتنی دیر سانس نہیں روک سکتا۔“

پیر سانول نے مجھے پھر گھورا..... ”صرف چند سیکنڈز کی بات ہوگی..... ہم فوری طور پر دوسری سطح پر پہنچیں گے۔“

اسی لمحہ میں نے پیر سانول کو مخاطب کیا۔

”چپ رہو“..... پیر سانول جواب میں پوری قوت سے چلایا..... بالکل خاموش رہو مجھے بلانا نہیں“

میرے لئے یہ جملہ نہایت ذلت آمیز تھے سینوریتا کیا سوچتی ہوگی..... میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”آنکھیں بند کرو.....“ پیر سانول گر جا۔

”نہیں کرتا“..... میں ہتھے سے اکھڑ گیا، میرا جواب سنتے ہی سینوریتا کی ہنسی نکل گئی عجیب لڑکی تھی میری ذلت پر خوش ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے.....“ پیر سانول نے اطمینان سے کہا..... ”پھر خود ہی بھگتو جو تمہارے ساتھ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے بھگت لوں گا.....“ میں نے بھی اٹل لہجے میں کہا..... اور اسی لمحے سینوریتا بول پڑی۔

”نورے..... ضد نہیں کرو..... چلو شاباش آنکھیں بند کرو.....“ اس نے یہ جملہ اتنے پیار سے کہا کہ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر لیں آنکھیں بند کرتے ہی ایک زوردار جھٹکا سا لگا اور جسم اوپر کی سطح پر سفر کرنے لگا اچانک مجھے یاد آیا کہ میں سانس لے رہا ہوں میں نے جلدی سے سانس روک لیا۔ اسی لمحے میرے کانوں میں پیر سانول کی آواز گونجی..... ”ابھی سانس مت روکو..... جب میں آنکھیں کھولنے کے لئے کہوں اس وقت سانس روکنا“..... میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور تیز تیز سانس لینا شروع کر دیئے ٹھیک دو منٹ بعد جب میرے پاؤں زمین کی سطح سے ٹکرائے تو میں نے اپنے ارد گرد موت کی سرسراہٹ محسوس کی ابھی میں نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی کھوہ میں آ گیا ہوں حیرت انگیز طور پر مجھے اس فضا میں گرمی لگنے لگی تھی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیر سانول کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”آنکھیں کھول دو..... سانس بند کر لو“

میں نے ایک بھر پور سانس لے کر پھیپھڑوں میں ہوا بھری اور آنکھیں کھول دیں.....

”اف خدایا.....“ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ”سانپ ہی سانپ.....“ اژدہوں کی طرح لمبے سانپ لمبی لمبی زبانیں نکالے میری طرف بڑھ رہے تھے ان کی پھنکاروں میں شعلوں کی سی لپک تھی جو سارے ماحول کو گرم کر رہی تھی..... اس ماحول میں تو میں شاید کبھی بھی سانس

نہیں لے سکتا تھا کیونکہ میرا سانس تو جہاں تھا وہیں رک گیا تھا۔ میرے سے کچھ ہی فاصلے پر سینوریتا بھی موجود تھی میں نے زندگی میں پہلی بار اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دیکھیں سانپ غضب ناک انداز میں لپکتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے یوں لگتا تھا کچھ ہی دیر میں ہم ان کے حصار میں ہوں گے پیرسانول پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ مدھو پہاڑی کے یہ سانپ دائرے کے گرد اکٹھے ہو کر پھنکارنے لگے۔ میرے دائرے کے ہر طرف سانپ ہی سانپ تھے اتنے زیادہ کہ مجھے دوسری طرف سینوریتا بھی نظر نہیں آرہی تھی پھنکاروں کی گرمی سے مجھے آکسیجن کی شدید طلب ہونے لگی تھی لیکن پیرسانول کے خوف نے مجھے سانس لینے سے روکے رکھا سانپوں کی بڑھتی ہوئی تعداد مجھے لمحہ بہ لمحہ خوفزدہ کئے جا رہی تھی۔ ایسے خوفناک سانپ میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا اس عالم میں طلسمہ کا ایک ہیبتناک قہقہہ گونجا۔

”آؤ..... آؤ..... میں تمہارے کلیجے کھانے کے انتظار میں ہوں.....“

پیرسانول نے تو تین چار سیکنڈ کا کہا تھا لیکن یہاں تو آدھا منٹ گزر گیا تھا میری سانس ٹوٹنے کے قریب تھی سانپ بڑی بے چینی سے میری سانس ٹوٹنے کا انتظار کر رہے تھے اسی لمحے پیرسانول کی آواز آئی آنکھیں بند کرلو۔ میں نے فوراً عمل کیا زمین دوبارہ میرے پاؤں تلے سر کی اور میں تھوڑی دیر میں اوپر کی سطح پر آگیا۔

”اب آنکھیں مت کھولنا.....“ آواز آئی۔

میں ابھی کچھ کہنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک ایسی آواز آئی جس نے مجھے ہوش و حواس سے بیگانا کر دیا۔ میری ماں مجھے پکار رہی تھی..... نورے..... نورے.....

”ماں..... ماں ہی ہوتی ہے..... میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں..... آنکھیں کھولتے ہی سامنے کے منظر پر نظر پڑی اور میں پوری قوت سے چلا اٹھا، میں کنویں کی منڈیر پر تھا نیچے کروڑوں فٹ کی گہرائی تھی اور کنواں زہریلے بچھوؤں سے بھرا ہوا تھا میں نے ماں کی آواز کی طرف نظر دوڑائی اپنے سیدھے ہاتھ پر دیکھتے ہی میرے رہے سہے حواس بھی جواب

دے گئے۔ طلسمہ کنویں میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی اس کے بے تحاشا لمبے پیر کنویں کے بچھوؤں کی زد میں تھے جو اس پر مسلسل ڈنگ مار رہے تھے لیکن طلسمہ شاید اس ڈنگ میں بھی لذت محسوس کر رہی تھی اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

”یہ تم نے کیا کیا.....“ سینور تیا کی پریشان کن آواز آئی۔ میں نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا لیکن سینور تیا کہیں نظر نہیں آئی۔

”پیر سانول.....“ میں نے آواز دی..... لیکن بے سود..... میری آوازوں کے جواب میں طلسمہ مسلسل تہقہ لگائے چلی جا رہی تھی۔

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور مجھے دبوچ لیا۔ میری چیخیں نکل گئیں اس خوفناک بلا کا پنجہ میرے جسم کے گرد شکنجے کی طرح حائل ہو گیا تھا اور ناخن میرے بدن میں خنجر کی طرح چبھتے جا رہے تھے میں سمجھ گیا کہ آخری وقت آگیا ہے طلسمہ اپنے انتقام میں کامیاب ہو رہی تھی ایک اور انسان کا لے علم کی بھینٹ چڑھنے لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچھوؤں کا ایک غول مجھ سے چٹ گیا۔ یہ بچھو ابھی تک مجھے ڈنگ نہیں مار رہے تھے طلسمہ دیوانہ وار تہقہ لگا رہی تھی۔

”دیکھا..... آگیا ناں قابو..... خبیث انسان..... ایک ایک کر کے سارے بدلے لوں گی.....“ تیری زبان پر بچھو کاٹیں گے۔ تیری آنکھوں میں ڈنگ ماریں گے.....“

”یا اللہ.....“ میری آنکھوں میں آنسو آگئے..... بچھو چیونٹیوں کی طرح میرے بدن سے چپکے جا رہے تھے میں پوری طرح سے موت کے لئے تیار ہو چکا تھا اسی لمحے میرے اندر سے کوئی بولا..... ایک طاقت ہے جو ان سب پر حاوی ہے..... وہ رحیم ہے..... معاف کر دینے والا ہے..... ایک بار خلوص دل سے اسے پکار تو سہی.....“ اسی لمحے مجھے اپنے آپ میں ایک عجیب سی ہمت محسوس ہوئی..... میں نے بلند آواز کہا..... یا اللہ!!!

اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی اور بچھو میرے بدن سے یوں جھڑتے چلے گئے جیسے خزاں کے موسم میں درختوں سے پتے جھڑتے ہیں۔ طلسمہ نے ایک چیخ ماری اور مجھے چھوڑ دیا..... اس کے چھوڑنے کی دیر تھی کہ میں قلابازیاں کھاتا ہوا کنویں میں گرنے لگا یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے یوں لگا جیسے کسی کے ہاتھوں نے مجھے تھام لیا ہے..... آواز آئی.....

”آنکھیں بند کر لو“..... میں نے فوراً عمل کیا..... تھوڑی دیر خلا میں رہنے کے بعد میں ہوش میں آیا تو سامنے پیر سانول کو کھڑے دیکھا۔ سینوریتا بے ہوش پڑی تھی اور وہ بڑی پریشانی کے عالم میں اس پر کچھ پڑھے جارہا تھا۔ میں اپنی تکلیف بھول کر سینوریتا کی طرف لپکا۔ ”کیا ہوا اسے؟“

پیر سانول نے جواب دینے کی بجائے سینوریتا کے چہرے پر ہڈی پھیرنا شروع کر دی..... تقریباً تین منٹ کے بعد سینوریتا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ چہرہ سفید ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہے میں حقیقتاً پریشان ہو گیا۔ ہم تینوں غالباً پہاڑی کی آخری سطح پر موجود تھے شدید سردی اعصاب کو برف کر رہی تھی سینوریتا کے ہوش میں آتے ہی پیر سانول نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”اب کیسی طبیعت ہے بیٹی“.....

سینوریتا نے میری طرف ایک نظر ڈالی اور کہا..... ”میں ٹھیک ہوں بابا.....“

پیرسانول میری طرف مڑا..... ”اس کی یہ حالت تمہاری وجہ سے ہوئی ہے.....“

”میری وجہ سے؟؟؟“ میں حیران رہ گیا۔

”ہاں..... تمہاری وجہ سے..... تم نے میری بات پر عمل نہیں کیا اور دوسری سطح پر آنکھیں کھول دیں۔ طلسمہ کو موقع مل گیا اور وہ تمہیں لے اڑی..... تمہاری موت یقینی ہو چکی تھی تمہیں بچانے کا ایک ہی حل تھا کہ طلسمہ کو واپس بلایا جائے..... اس اسحق لڑکی نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی تمہاری چیخیں سن کر آنکھیں کھول دیں۔ نتیجتاً طلسمہ بوکھلا گئی اور ادھر کو لپکی۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو آج سینوریتا نہ ہوتی“.....

میں چپ ہو گیا..... سینوریتا نے مجھے خرید لیا تھا میں اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔

”وہ غار دیکھ رہے ہو“ پیرسانول بولا اور ہم دونوں چونک کر غار کی طرف دیکھنے لگے۔

”طلسمہ اس میں پناہ لے چکی ہے..... ہمیں اس کو حاصل کرنا ہے مارنا نہیں..... تم دونوں

اپنے دائروں میں رہنا..... نورے تم کچھ نہیں کرو گے..... سینوریتا تم تیار رہنا، طلسمہ

جو نہی تمہارے دائرے میں داخل ہوگی سمجھ لیا کہ اب وہ تمہارے قبضے میں ہے.....

نورے تم جو نہی طلسمہ کو دیکھو..... فوراً یہ الزام پڑھ کر اس کی طرف پھونکنا شروع

کر دینا“

”کیا یہ منتر ہے؟“

”ہاں..... اور صرف تمہی کو پڑھنا ہے..... یاد کر لو.....“ اس نے منتر دہرایا..... میں نے ذہن

میں دہرانا شروع کر دیا۔

”میں سینوریتا کے دائرے میں نہیں آؤں گی پیرسانول..... باز آ جا.....“ طلسمہ غار کے

دہانے پر نمودار ہوئی اور چلائی۔

پیرسانول نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے دل ہی دل میں اس کا بتایا ہوا منتر پڑھ کر طلسمہ پر

پھونکنا شروع کر دیا۔

طلسمہ کے قہقہے بلند ہونے لگے۔ پیر سانول بار بار ہڈی گھما کر طلسمہ کی طرف کرتا اس کے تمام وار طلسمہ اپنے ہاتھوں پر روک رہی تھی بدی کی یہ جنگ اپنے عروج کی طرف بڑھتی جا رہی تھی سینوریتا کی آنکھیں بند تھیں پیر سانول پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

اسی لمحہ آگ کا ایک بہت بڑا شعلہ طلسمہ کی طرف لپکا۔ اس نے اپنے ہاتھ گھمائے اور شعلہ واپس پیر سانول کی طرف ہو گیا۔ پیر سانول کے ہونٹ ہلے اور شعلہ غائب ہو گیا۔

پیر سانول نے چلاتے ہوئے ایک اور منتر پڑھا اور دو جٹاتی ہاتھ طلسمہ کی طرف بڑھے۔ طلسمہ نے گھور کر ہاتھوں کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیو بہکل ہاتھ مٹی بن کر جھڑ گئے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ طاقتور تھے۔ بدی کی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھیں اور میں دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا پیر سانول اپنی تمام تر طاقت استعمال کرنے کے باوجود بھی طلسمہ کے آگے بے بس نظر آ رہا تھا۔ ادھر طلسمہ بھی پوری طرح چوکنی تھی اسے پتا تھا کہ سینوریتا کے دائرے میں داخل ہونے کا مطلب ساری زندگی کی غلامی ہو گا اور وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہتی تھی۔

سردی شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ پیر سانول ہانپنے لگا تھا۔ ہمارے ارد گرد عجیب سی خوفناک چہروں والی مخلوق اکٹھی ہونا شروع ہو گئی تھی ان کے جسم انسانوں کے اور چہرے کتوں کے تھے۔ وہ سب تماشائی تھے اور تماشا دیکھ رہے تھے پیر سانول کو طلسمہ سے جنگ کرتے ہوئے تین گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تو میں نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ پیر سانول کی موت اس کی موت تھی۔ سینوریتا بند آنکھوں کے باوجود شائد کمرے کی پجوائشن سے واقف تھی تاہم اس کے چہرے کا خوف ظاہر کر رہا تھا کہ اسے بھی باپ کی ہار کا یقین ہونے لگا ہے اسی لمحے میں نے ایک فیصلہ کیا مجھے یقین تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے سے طلسمہ ضرور سینوریتا کے دائرے میں آ جائے گی۔

”پیر سانول صرف ایک منٹ میری بات سن لو“

اس نے گھوم کر غصے سے میری طرف دیکھا..... ”بکواس بند کرو“

میں پھر چلایا..... ”مجھے سینوریتا کے دائرے میں لے جا کر آگ پر پکی ہوئی چیز کھلا دو.....
طلسمہ خود بخود آجائے گی۔“

پیر سانول زور سے اچھلا..... اور طلسمہ غصے میں پھنکارنے لگی۔

”ہاں ہاں..... بالکل..... بالکل“ پیر سانول دیوانوں کی طرح چلایا۔

”میں..... نورے تیرا خون پی جاؤں گی“ طلسمہ دھاڑی۔ پیر سانول نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بھاگ کر میرا ہاتھ پکڑا اور پلک جھپکنے میں مجھے بھی سینوریتا کے دائرے میں لاکھڑا کیا اس کے بعد وہ تیزی سے اپنی جیبیں کھنگالنے لگا۔ لیکن آگ پر پکی ہوئی چیز شائد اس کے پاس بھی نہیں تھی قسمت کا یہ مذاق دیکھ کر میرا رونے کو جی کرنے لگا۔ طلسمہ دیوانہ وار قہقہے لگانے لگی۔

”نورے.....“ سینوریتا نے بند آنکھوں سے سرگوشی کی۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا تو وہ بند مٹھی میں میری طرف کوئی چیز بڑھا رہی تھی اس کے ہاتھ کھلے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی..... ادھ کھایا پکڑا میرے سامنے تھا میں نے آؤ دیکھانہ تاؤ اور جھٹ سے اسے منہ میں ڈال لیا۔ ایسا کرنے کی دیر تھی کہ طلسمہ نے پوری قوت سے پتھروں کو نکریں مارنا شروع کر دیں وہ زور زور سے روتی جاتی تھی اور نکریں مارتی جاتی تھی..... مار دیا..... مجھے مار دیا..... کالے علم کرنے والوں نے مجھے مار دیا..... نورے..... خبیث مجھے مار دیا..... نہیں چھوڑوں گی..... مار کے ہی دم لوں گی..... وہ بھری ہوئی چلائی۔

میرا بدن لرزنے لگا تھا..... طلسمہ پہاڑی کے پتھروں کو پکڑ رہی تھی لیکن ہوا میں اڑتی جا رہی تھی..... وہ سیدھی میرے سر کے اوپر آئی اور میری چیخ نکل گئی..... دوسرے ہی لمحے میں ہوا میں پٹخیاں کھانے لگا..... تین چار قلابازیوں کے بعد سنبھلا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی..... میرا روپ بالکل بھی نہیں بدلا تھا البتہ طلسمہ سینوریتا کے سامنے گری

پڑی تھی۔

پیر سانول خوشی سے چلاتا ہوا دائرے میں داخل ہو گیا اور اس لمحے دو باتیں ہوئیں بظاہر بے ہوش طلسمہ نے یکدم آنکھیں کھولیں اور ایک ہاتھ سے سینوریتا اور دوسرے سے پیر سانول کی گردن پکڑ لی۔ دونوں کی چیخیں نکل گئیں طلسمہ بھی پوری قوت سے چلا رہی تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں..... وہ بتیوں مر رہے تھے..... میں بے بس تھا..... دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کی آنکھیں ابل پڑیں۔ طلسمہ کا ہاتھ کسی پھندے کی طرح ان دونوں کے گلے میں حائل تھا۔ سینوریتا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھا..... میرا کلیجہ کٹ گیا میں تیزی سے اس کی طرف لپکا..... لیکن شاید بہت دیر ہو چکی تھی..... جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی، میری چیخ نکل گئی..... سب کچھ اچانک ہو گیا.....

”سینوریتا..... خدا کے لئے سینوریتا نہیں جانا..... سینوریتا مجھے یوں چھوڑ کر مت جاؤ.....“ واپس آؤ ابھی تو میں نے تم سے بہت کچھ کہنا تھا.....“ میں دیوانہ وار رونے لگا۔ میں اسے ہلا رہا تھا لیکن وہ بہت دور جا چکی تھی میں مڑا..... پیر سانول کب کا زندگی ہار چکا تھا اسی لمحے دو باتیں ہوئیں سینوریتا اور پیر سانول کا جسم یکدم سیاہ پڑنے لگا..... اور طلسمہ کو آگ لگ گئی..... میں لرزتے جسم کے ساتھ سن کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا کالے جادو کی تباہ کاریاں بالا خر رنگ لے آئی تھیں پیر سانول اور سینوریتا دو منٹ میں دھواں بن کر بکھر گئے جب کہ طلسمہ کا وجود جل کر راکھ ہو چکا تھا جسے ہوا کی ایک معمولی سی لہر نے بکھیر دیا۔ اسی لمحے ہر طرف سے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں خوفناک ماحول کے اس عالم میں پیر سانول کی کراہتی ہوئی آواز گونجی..... ”بہت برا کیا..... کالا علم کیا..... بہت برا کیا..... کالا علم کیا..... بہت برا کیا.....“ اچانک میرے ہوش و حواس جواب دینے لگے مجھے یوں لگا جیسے زلزلہ آ رہا ہو..... میں نے چلانے کی کوشش کی لیکن میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا..... میں گر پڑا..... پھر اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کیا ہوا۔

ہوش آیا تو میں اسی جگہ موجود تھا جہاں پیرسانول نے میرا خون نکالا تھا یہ ایک لمبی داستان ہے کہ میں کس طرح گرتا پڑتا سرحد پر پہنچا۔ میری باتوں پر کون یقین کرتا نتیجتاً مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ 8 دن تبت کی جیل میں رہنے کے بعد مجھے میرے وطن ڈیپوٹ کر دیا گیا یہاں بھی مجھ پر مقدمہ بنا لیکن دو سال بعد رہائی ہو گئی۔



میری یہ داستان اتنی مختصر نہیں تھی کہ میں اسے یوں بیان کر دیتا لیکن یہ سارا قصہ میری زندگی کے ماہ و سال سے یوں لپٹ گیا ہے کہ باوجود کوشش کے میں اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا میرے دوست، ساتھی، میرے بچے..... کوئی نہیں میری اس کہانی کے بارے میں جانتا میں انہیں کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا اس خوفناک واقعے کو گزرے بیس سال سے بھی زائد کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن اب بھی یہ میرے حواس پر اس قدر سوار ہے کہ اندھیری رات اور کالے علم کا کوئی معمولی سا ذکر بھی میرا خلق خشک کر دیتا ہے۔ میں ایک تعلیم یافتہ انسان کے روپ میں ملازمت کر رہا ہوں میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ چاچی کے روپ میں آج بھی میری ماں اور چاچا کے روپ میں باپ زندہ ہے شازیہ میری شریک حیات ہے اور شاید اتنی محبت مجھے زندگی بھر نہ ملی ہو جتنی اس نے مجھے ان بیس سالوں میں دی ہے میں باقاعدگی سے نماز پڑھتا ہوں، دونوں بیٹیاں قرآن حفظ کر رہی ہیں، شادی کے بعد شازیہ نے مجھے پرائیویٹ طور پر پڑھایا اور ایم اے کر لیا بیٹا البتہ تھوڑا سا لاپرواہ ہے شاید جوانی کے زیر اثر ہے لیکن میں ایک عجیب سے خوف میں مبتلا ہوں مجھے ہر وقت کوئی ایسا خیال تنگ کئے رکھتا ہے جو

میری دماغ کی پردہ سکرین پر واضح نہیں ہو پارہا۔ میرا بیٹا بہت ذہین ہے، بہت عقلمند ہے اس کی عمر تیرہ سال ہے لیکن اس کی ایک دو حرکتوں نے مجھ لرزا کر رکھ دیا ہے میں اسے مکمل طور پر نماز کی طرف راغب کرتا ہوں وہ نماز پڑھتا بھی ہے میری بیوی شازیہ کا کہنا ہے کہ لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن میں اس سے متفق نہیں وہ میرے ذہن کے خطرات سے واقف نہیں میں اسے بتانے سے قاصر ہوں کہ لڑکے ایسے نہیں ہوتے اور جو لڑکے ایسے ہوتے ہیں وہ کہیں کے نہیں رہتے یقیناً آپ بھی بے چین ہو رہے ہوں گے کہ آخر میرا بیٹا مہمیز ایسی کون سی حرکتوں میں ملوث ہے کہ جو میرے لئے خطرے کا باعث بن رہی ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو یہ واقعہ سنایا جائے۔

سردیوں کی ایک ٹھہرتی رات کو جب میں اپنے گاؤں کی سڑک سے واپس آ رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میرے آگے سے کوئی تیزی سے گزرا ہے میری عادت ہے کہ نیند نہ آنے کی وجہ سے میں اکثر راتوں کو اٹھ کر تازہ ہوا لینے کے لئے پختہ سڑک پر چلتے ہوئے دور تک نکل آتا ہوں اس رات بھی میں ایسے ہی موڈ میں تھا میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا میں نے فوراً چوکنی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا گزرنے والا جو کوئی بھی تھا غالباً مجھ سے واقف تھا میں نہایت محتاط انداز میں چلتا ہوا گھر آیا اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا اسی لمحے شازیہ کی بھی آنکھ کھل گئی وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور پانی کا ایک گلاس بھر کر میری طرف بڑھایا۔

”کیا آج بھی نیند نہیں آرہی؟“

”ہاں بس ایسے ہی ہے.....“ میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا ”مہمیز گیا تھا آج سکول؟؟؟“

میں نے پوچھا۔

”ہاں گیا تھا“ اس نے جلدی سے کہا اور میں سمجھ گیا کہ وہ سکول نہیں گیا اس کی ایسی بہت سی حرکتیں میرے علم میں تھیں لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب شازیہ نے بڑے عمومی انداز میں کہا۔

”وہ آگے نہیں پڑھنا چاہتا“

یہ جملہ میرے اعصاب پر ایٹم بم بن کر گر امیں اچھل کر کھڑا ہو گیا ”کیا مطلب؟؟؟“
 ”دیکھیں!..... اولاد پر زیادہ سختی اچھی نہیں ہوتی زبردستی کرنے سے بچے بگڑ جاتے ہیں آپ
 اسے بخوبی جانتے ہیں کہ کتنا ضدی بچہ ہے۔۔۔“

”لیکن میں نے تو کبھی اس سے زبردستی نہیں کی اور نہ ہی اس نے مجھ سے کبھی پڑھائی سے
 بیزاری کی بات کی ہے“

”آپ سے تو واقعی نہیں کی لیکن مجھے.....“ شازیہ کی بات درمیان ہی میں تھی کہ یوں لگا جیسے
 گھر میں کوئی کودا ہے۔ دھم کی آواز نے میرے کان کھڑے کر دیئے میں بھاگ کر صحن میں
 پہنچا تو ہکا بکارہ گیا مہمیز دروازے کے قریب سر جھکائے کھڑا تھا اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف
 تھے۔

”تم..... اتنی رات گئے..... کہاں گئے تھے.....“ میں گر جا میرا غصہ اپنے عروج پر تھا۔
 ”وہ..... ابو..... میں.....“ وہ گھبرا گیا مجھے محسوس ہوا کہ وہ بات سے زیادہ اپنے ہاتھ چھپانے
 کی کوشش کر رہا ہے۔
 ”ہاتھ سیدھے کرو.....“

”میرے پاس لک..... کچھ نہیں..... ابو.....“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”میں کہتا ہوں ہاتھ سیدھے کرو.....“ میں آگے بڑھا اس نے ماں کی طرف دیکھا..... شازیہ
 آگے بڑھی لیکن میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود مہمیز کی طرف بڑھا۔ زبردستی
 اس کے ہاتھ آگے کئے اور ہاتھ سامنے آتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا.....
 مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سینے پر چھریاں چلا دی ہیں ایک لمحے کے لئے تو میرے
 پیروں تلے زمین نکل گئی..... کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ میرے بیٹے کے ہاتھ میں انسانی
 کھوپڑی تھی..... بالکل اصلی..... جس پر لگی ہوئی مٹی بتا رہی تھی کہ اسے زمین سے نکالے
 زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

”یہ..... یہ..... کیا ہے.....؟“ مجھے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے..... شازیہ بھی

خوفزدہ ہو گئی تھی..... مہمیزی کی بجائے وہ میری حالت سے پریشان ہو کر میری طرف لپکی۔
 ”آپ..... آپ ٹھیک تو ہیں.....“

”شازیہ..... شازیہ..... یہ..... یہ کہاں گیا تھا“ میں زمین پر لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا مجھے اپنی چھاتی پر کسی کا دباؤ محسوس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہی دیر میں میرا دم گھٹ جائے گا۔ اندر والے کمرے سے چاچا اور چاچی بھی پریشانی کے عالم میں باہر نکل آئے اور میری طرف لپکے میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

ہوش میں آنے پر میرا پہلا خیال مہمیزی کی طرف گیا میں نے بے اختیار اسے آواز دی۔ پتا چلا کہ وہ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ لیا اور پوری قوت سے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

”کہاں گئے تھے..... بولو..... کہاں سے لائے کھوپڑی.....“ میں نے اسے ایک اور تھپڑ مارا..... وہ ڈر گیا اور تیسرا تھپڑ مارنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”ویران قبرستان سے لایا تھا.....“

”ویران قبرستان سے.....“ میرا رواں رواں خوف سے کانپ اٹھا شازیہ مسلسل پریشانی کے عالم میں ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا بیٹا بھی ان ہی راہوں پر چل پڑے گا جن کی تکمیل میں میرے باپ نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا مجھے برسوں پہلے کہی ہوئی سلطان بابا کی ایک بات یاد آگئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اولاد عموماً باپ یاد اوپر جاتی ہے میرا بیٹا بھی شاید دادا پر جا رہا تھا..... میرے لئے یہ بات انتہائی دکھ اور خوف کی تھی کہ میرا بیٹا جو کھوپڑی گھر لایا تھا وہ کسی غیر کی نہیں اس کے دادا کی اور میرے باپ کی تھی میں نے نہایت احترام کے ساتھ اسے دوبارہ دفن کیا اور اپنے بیٹے کو انتہائی مارا..... میں آج بھی اسے مارتا ہوں لیکن مجھے سب پتا ہے کہ وہ قبرستانوں کا اسیر ہوتا جا رہا ہے۔ میرا گاؤں شہری سہولتوں سے آراستہ ہو چکا ہے میری بیٹیاں جوان ہیں لیکن بیٹا..... وہ مسلسل میرے برخلاف جا رہا ہے..... مالک اسے ہدایت دے۔

شازیہ البتہ میرا بہت خیال رکھتی ہے میں بتانا بھول گیا کہ وہ بھنڈیاں بہت اچھی بناتی ہے اور میں مزے لے لے کر کھاتا ہوں پہلے طلسمہ مجھ پر حاوی تھی، اب شازیہ حاوی ہے کاش زندگی کی آخری سانس تک ایسا ہی ہو۔ میرا بیٹا کئی کئی راتیں قبرستانوں میں گزارنے لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہیں یہ پیر سانول کا دوسرا جنم تو نہیں اللہ نہ کرے ایسا ہو، ورنہ وقت کو ایک بار پھر اس بھیا نک کہانی کو دہرانا ہو گا۔ خدا سب کو کالے علم کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

